کتاب العقائد



تالیف

حضرت مولانا مفتی
سید مختار الدین شاہ صاحب
دامت برکاتہم العالیہ

خلیفہ مجاز

شیخ الحدیث

حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

دار الایمان
DARUL-EEMAAN

تحریک ایمان و تقویٰ

کتاب العقائد

تصنیف

حضرت مولانا مفتی

سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ

خلیفہ مجاز

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ

دار الایمان

دارالایمان

اسٹاکسٹ:
مولانا سیارالدین حقانی صاحب: 0333-3356034 - 0313-2032828

کتاب العقائد

تصنیف

حضرت مولانا مفتی
سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ

طبع : 2024

ناشر: دارالایمان

DARUL-EEMAAN

www.daruleeman.org

ملنے کے پتے:

مرکز
جامعہ زکریا دارالایمان، کربوغہ شریف ہنگو۔
فون نمبر: 0925692413 / 0335-2223413

پشاور
دارالایمان نزد کی سٹار فلور ملز
بڑھنی روڈ چمکنی پھاٹک پشاور 0300-5954046

کراچی
دارالایمان، ایمان منزل، مکان نمبر B-375،
بلاک 10 فیڈرل بی ایریا کراچی
فون نمبر: 0321-3040666

بنوں
مکتبہ دارالایمان والتقوی، سورانی، بنوں۔
فون نمبر: 0333-1000425 / 0332-9066545

قصور
مولانا سعید صاحب مکتبہ دارالایمان
نزد پرانی چنگی، نظام پورہ روڈ، قصور 0321-6581661

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیشِ لفظ

کامیاب لوگ

کامیابی ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو حقیقت شناس، حقیقت پسند اور حقیقت پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں۔ جو لوگ حقائق سے آنکھیں چرا کر جیتے ہیں ان کی زندگی فضول آرزؤں اور باطل تمناؤں کی نذر ہو جاتی ہے اور عمل کی دنیا میں وہ کچھ کر نہیں پاتے، بالآخر ناکام و نامراد ہو جاتے ہیں۔

عقائد دراصل وہ غیبی حقائق ہوتے ہیں جن کی مضبوطی اور پختگی اسلامی زندگی اور ایمانی تعمیر کی پختگی اور مضبوطی ہوتی ہے، عقائد حقہ کی معرفت، پختگی اور ان پر غیر متزلزل یقین سے ہی بارآور اور ثمر آور ایمان، اعمالِ صالحہ اور اوصافِ حمیدہ وجود میں آسکتے ہیں جو بالآخر انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچا کر کامیابی سے ہمکنار کر لیتے ہیں۔

امتِ مسلمہ کی موجودہ زبوں حالی میں بھی بہت بڑا کردار عقائد یعنی حقائق سے چشم پوشی اور دوری کا ہے۔ اگر آج بھی عقائدِ اسلام کو اہمیت دے کر ان کی اسی طرح رعایت کی جائے جس طرح اسلام میں مطلوب ہے تو مسلمان اب بھی وہ بہت کچھ پا سکتے ہیں جو وہ کھو چکے ہیں۔

کتاب العقائد کے نام سے موسوم یہ ضخیم کتاب اس سلسلے کی ایک اہم راہنما ہے جس میں عقائد کی اہمیت، بنیادی عقائد میں سے ہر عقیدے کا مطلب، اس پر مرتب ہونے والے عملی و علمی نتائج و ثمرات، اور فوائد پر نہایت تفصیل سے بات کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہمارے عقائد کی صحت، درستگی، پختگی اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج و ثمرات کے حصول کا ذریعہ بنائے، اور صاحب کتاب کے فیوض و برکات کو عام و تام فرما کر ان کی جملہ مساعی اپنی بارگاہ میں قبول و مقبول فرمائے۔

زین الدین چغرزیؔ

جامعہ زکریا (کربوغہ شریف)

26 جولائی 2022ء......۲۶ ذوالحجہ ۱۴۴۳ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

باب اسلام وایمان

اسلام اور ایمان کا بنیادی کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو مان کر اقرار کرنا ہے۔

کلمۂ اسلام کی بنیاد

کلمہ کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ نفع و نقصان، عزت و ذلت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، صرف وہی نفع و نقصان، عزت و ذلت کا مالک ہے اور نفع و خیر صرف اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے مطابق چلنے میں ملتی ہے اور اس کے خلاف سراسر نقصان، ضرر اور خسارہ ہے۔

لہٰذا نفع و خیر اور حقیقی کامیابی و فلاح صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے اور اس کی خالص اطاعت، بندگی و غلامی میں ہے۔

کلمہ کے تقاضے

کلمۂ اسلام کی تصدیق و اقرار کرنے میں کچھ ذمہ داریاں اور تقاضے پوشیدہ ہیں جن کو پورا کیے بغیر انسان کامل مؤمن نہیں بن سکتا۔ جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱.... کلمہ کے الفاظ کو درست تلفظ سے ادا کرنا۔

۲.... کلمہ کے معنیٰ کو جان لینا۔

۳.... کلمہ کے مطلب اور مفہوم کو سمجھ لینا۔

۴.... کلمہ کے مطابق اپنی پوری زندگی گذارنا۔

۵.... اس کلمہ کے مخالف قوانین اور غیر اللہ کی بندگی سے دل و جان سے بے زار اور متنفر ہونا۔

۶.... اس کلمہ کے بلند کرنے کے لیے جان و مال سے جدوجہد اور جہاد کرنا۔

ان تمام امور کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) کلمہ کے الفاظ کا درست تلفظ

کلمۂ اسلام کے الفاظ یہ ہیں:

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

(۲) کلمہ کے معنی

کلمہ کے معنی یہ ہے "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں، محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں"۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی بندگی سیکھنے کا واحد ذریعہ خود اللہ تعالیٰ کے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔

(۳) کلمہ کا مفہوم

اس کا مفہوم واضح ہے کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کریں گے اور اس بندگی کو محمد رسول اللہ ﷺ سے سیکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات و اوامر پر عمل کریں گے اور نواہی سے بچیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکامات اوامر و نواہی قرآن مجید میں موجود ہیں اور اس کی قولی اور عملی تشریح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کی عملی زندگی، طرزِ زندگی اور سنت رسول اللہ ﷺ میں موجود ہے۔

(۴) کلمہ کے مطابق زندگی

ظاہر ہے کہ اب اس اقرار و عہد کے بعد اس عہد کو پورا کرنا ہو گا جو اس طرح ہو گا کہ اپنی پوری زندگی قرآن مجید اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کے مطابق گزاریں اور اس عہد و پیمان کو پورا کریں۔

کلمۂ اسلام کا یہی پہلو اس کا اہم فریضہ ہے جو خود بندہ کے اقرار میں موجود ہے کہ وہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کرے اور اس بندگی کو اللہ تعالیٰ کے پیغمبر محمد ﷺ سے سیکھ کر اس کے مطابق اپنی پوری زندگی گزارے کیونکہ نبی کریم ﷺ کو اس لیے تو بھیجا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی بندگی سکھائیں سمجھائیں اور خود کر کے دکھائیں۔

قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ نے بار بار اس بات کی تاکید فرمائی ہے اور صاف صاف الفاظ میں فرمایا ہے کہ:

يَآاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اطاعت کرو"۔ (النساء:۵۹)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

"اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو صرف اس لیے بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے"۔ (النساء:۶۴)

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

"جس نے اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کی تو اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی"۔ (النساء:۸۰)

نیز نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس ہدایت و تعلیم کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں"۔ (مشکوٰۃ)

(۵) مخالف قوانین اور غیر اللہ کی بندگی سے بے زاری

اس عظیم کلمہ میں اس بات کا عہد و پیمان اور اقرار بھی موجود ہے کہ جو قانون، جو حکم اور بات اللہ تعالیٰ کے قانون اور اس کے حکم کے خلاف ہو یا اس کے رسول ﷺ کے ثابت شدہ طریقہ سے متصادم ہو اس کا انکار کریں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی ۗ لَا انْفِصَامَ لَھَا

"پس جو شخص (اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون سے) سرکشی کا انکار کرے اور اللہ تعالیٰ (اور اس کے قوانین و احکامات کی صداقت) پر ایمان لائے تو اس نے مضبوط حلقہ (یعنی سہارا) پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں"۔ (البقرہ:۲۵۶)

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ ؕ وَ یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا

"کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی اور اس پر بھی جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے (اور اس کے باوجود) وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ (اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے خلاف) سرکش کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو (کلمہ طیبہ میں) حکم دیا گیا ہے کہ اس سے انکار کریں (اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف کسی قانون کو نہ مانیں کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے لیے یہ لازم ہے کہ طاغوت کا انکار کیا جائے اور بغیر اس انکار کے نہ ایمان معتبر ہے اور نہ خالص بندگی ممکن ہے لیکن یہ کمزور اور ڈانواں ڈول ان دونوں کو جمع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ یہ ایک شیطانی چال ہے) اور شیطان چاہتا ہے کہ (اس طرح وہ) ان کو (صراطِ مستقیم اور خالص بندگی کی راہ سے بھٹکا کر) نہایت دور کی گمراہی میں ڈال دے (تا کہ پھر ان کے لیے اس راہِ حق کو پانے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے)"۔ (النساء:۶۰)

ان آیتوں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کے لیے

یہ لازمی ہے کہ طاغوت یعنی دینِ اسلام کے خلاف قوانین سے انکار کیا جائے۔

اے مسلمانو دیکھو! کس قدر غفلت میں پڑے ہو کلمہ طیبہ کا اقرار اور عہد وپیمان کر کے پھر بھی اللہ تعالیٰ کے سوا اپنی جیسی مخلوق اور اس کے قوانین کی غلامی کا طوق اپنے گلے کا ہار بنا کر دنیا و آخرت دونوں لحاظ سے اپنے آپ کو ذلیل وخوار اور برباد کرتے ہو۔

(٦) کلمہ اسلام کو غالب اور بلند کرنے کے لیے جدوجہد اور جہاد

کلمہ طیبہ ایک عہد وپیمان اور ایک سودا ہے۔ اس میں انسان کامل طور پر اپنے مال وجان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے حوالے کرتا ہے۔ وہ اپنی کمائی اور اپنے اعضا میں آزاد نہیں ہوتا، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ حدود کے اندر رہ کر کمائی کرتا ہے اور پھر اپنی کمائی اور اعضا آنکھ، کان وغیرہ کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرتا ہے اور اپنی پوری قوت اور اپنے پورے زور کے ساتھ اپنی مالی اور اپنی جانی توانائیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ یعنی دینِ اسلام کے قیام ونفاذ کی راہ میں لگائے گا یہاں تک کہ وہ اپنی کمائی اور اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر کے کفر اور باطل کے خلاف پوری قوت سے جنگ کرے گا۔ قرآن مجید اور احادیثِ مبارکہ میں اس کے دلائل بکثرت موجود ہیں۔ یہاں بطورِ نمونہ چند کو پیش کیا جاتا ہے چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ مؤمن کی نشاندہی کر کے فرماتے ہیں کہ:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ﴿١٥﴾

”مؤمن تو بس وہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر (علی وجہ البصیرت) ایمان لائے (اس طرح کا ایمان کہ) پھر انہوں نے (ذرہ برابر بھی) شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ تعالیٰ (کے دینِ حق کے قیام) کے راستے میں (مسلسل جدوجہد اور) جہاد کیا یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں (سو یہی وہ لوگ ہوئے جو سچائی کے پیکر بن کر فلاح پاتے ہیں)“۔ (الحجرات:١٥)

سورتِ توبہ میں اللہ تعالیٰ دوٹوک الفاظ میں نبی کریم ﷺ سے اعلان کرواتے ہیں:

قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ﴿٢٤﴾

"(اے پیغمبر! ان سے) کہہ دو کہ اگر تمہارے آبا(واجداد) اور تمہارے بیٹے (اور پوتے) اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ اموال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ (چلتی ہوئی) تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو (یہ سب) تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور اس (کے دین کے قیام) کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (یعنی عذاب و زوال) بھیج دے (ظاہر ہے کہ جب ان چیزوں کی محبت غالب ہوگی تو ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکامات، رسول اللہ ﷺ کی سنتوں اور راہِ حق میں جد وجہد اور جہاد سے بے وفائی، نافرمانی اور غداری کا ارتکاب کرکے فسق کو اختیار کیا جائے گا) اور اللہ تعالیٰ (ایسے) فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا"۔ (التوبہ:۲۴)

نیز اسی سورتِ توبہ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَ یُقْتَلُوْنَ ۫

"بے شک اللہ تعالیٰ نے مؤمنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال اس قیمت پر خرید لیے ہیں کہ ان کے لیے (دنیا میں دلی اور معاشرتی جنت اور آخرت میں ابدی) جنت ہے (اور یہ مؤمن لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ دینِ اسلام کے قیام کے لیے مسلسل اپنے مال و جان سے جد وجہد کرتے رہتے ہیں اور جب ضرورت پڑ جائے تو باطل و کفر کے خلاف میدانِ جنگ میں کود پڑتے ہیں اور) اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جہاد اور) قتال کرتے ہیں پھر (حق کے منکروں کو) مارتے ہیں اور (خود بھی) مارے جاتے ہیں"۔ (التوبہ:۱۱۱)

اس آیتِ کریمہ نے صاف صاف بتادیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعت اور ہر مؤمن جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اقرار کرے تو وہ اس بات کی بیعت و معاہدہ کرتا ہے کہ اس نے اپنا مال، اپنی جان اور اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون و حکم کے حوالے کردی۔

اس کے بدلے مؤمن کو اطمینان والا دل، اطمینان والی زندگی اور پر سکون جنتی معاشرہ ملے گا اور آخرت میں اس کے لیے ابدی ترقیات و جنت ہوگی۔ مال و جان اللہ تعالیٰ کو دینا اصل میں کامل حوالگی اور سپردگی کی تعبیر ہے جس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔ اس کامل حوالگی و سپردگی کے بغیر قلبی سکون و اطمینان، معاشرتی حقیقی خوش حالیاں، آخرت کی ابدی نعمتیں اور ترقیاں نہیں مل سکتیں۔ یہاں اس حوالگی اور سپردگی کو مال و جان سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ اقرار اور معاہدہ صرف ذہنی اور اعتقادی ہوتا ہے، بلکہ اس اقرار و معاہدہ کے بعد اپنی

جان، اپنی پوری توانائیاں اور کمائیاں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق استعمال کرے گا اور اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے پیش کرے گا۔

یا اللہ تو ہی ہمارے مال و جان کو اپنی راہ میں قبول فرما۔ آمین

کلمہ کی خاصیت

۱.... جو شخص دل سے اسلام کی صداقت کا قائل ہو جائے اور اس کو قبول کر کے اس کلمہ کا اقرار کرے اور اسلام کے مقابل ہر قانون، ہر مذہب اور ہر طریقے کو باطل سمجھے اور ان سے بے زار ہو جائے تو یہ شخص مسلم اور مؤمن ہے۔ دنیا میں اس کے ساتھ مسلمانوں کی طرح معاملہ کیا جائے گا اور آخرت میں کلمۂ اسلام پر مرنے والے کے لیے بالآخر جنت میں داخل ہونا ہے۔

۲.... اگر دل میں اسلام کا بالکل انکار ہے یا اس کی صداقت راسخ نہیں، بلکہ تذبذب کا شکار ہے اور وہ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو کر اپنے آپ کو مسلمان باور کراتا ہے تو ایسا شخص اگرچہ بدترین کفر کا ارتکاب کر رہا ہے اور اس کی وجہ سے وہ آخرت میں دوسرے کفار کے مقابلے میں بدترین سزا پائے گا لیکن دنیا میں اس کے ساتھ اس وقت تک مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جائے گا جب تک اس کا اندرونی کفر کھل کر پوری طرح سامنے نہ آئے۔

۳.... اگر کوئی دل سے اسلام کی صداقت کا قائل ہے اور اس نے دل میں اسلام کو قبول بھی کیا ہے، لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے اسلام و ایمان کو چھپاتا ہے تو ایسا شخص اگرچہ عند اللہ مسلم اور مؤمن ہے مگر دنیا میں ایسے شخص کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کیا جائے گا، کیونکہ دلوں کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔

کلمۂ اسلام کے اجزا

کلمۂ اسلام کے دو جز ہیں ایک ہے لا الٰہ الا اللہ اور دوسرا ہے محمد رسول اللہ۔

لا الٰہ الا اللہ کی تعبیر توحید سے کی جاتی ہے اور محمد رسول اللہ کی تعبیر نبوت و رسالت سے کرتے ہیں۔

اب کلمہ کے پہلے جز کی مختصر تشریح کرتے ہیں:

لفظ اللہ اسمِ ذات ہے

لفظ اللہ کے متعلق اتنا سمجھیں کہ یہ خالقِ کائنات کے لیے بطورِ نام استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے جتنے نام ہیں، وہ اس کے صفاتی نام ہیں، اس کی مثال یوں سمجھ لیں کہ ایک شخص امیر المؤمنین ہے۔ وہ صدیق، انتہائی راست باز، سچا، سخی، امین اور اللہ کی بندگی میں اپنی جان کھپانے والا ہے اور اس شخص کا نام ابو بکر ہو تو

ابو بکر کے علاوہ اس کے جتنے نام اس کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں جیسے صدیق، امیر المؤمنین وغیرہ تو یہ ساری اس کی خداداد صفات و کمالات ہیں۔

اسی طرح لفظ اللہ خالقِ کائنات کے لیے بطورِ نام استعمال کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ جتنے اسمائے حسنیٰ ہیں، خالق، مالک، رحمٰن، رحیم، قدوس، حکیم، رب العالمین اور رزّاق وغیرہ یہ سب اس عظیم ہستی کی صفات یا صفاتی نام ہیں اور لفظ اللہ اس عظیم ہستی کا نام یعنی اسم ذات ہے جو تمام اسمائے حسنیٰ اور جملہ صفاتِ کمال پر حاوی ہے۔

الٰہ کا مطلب و معنی

لفظ الٰہ کے بہت سے معنی بیان کیے جاتے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱.... وہ ہستی جس کے ہاں پناہ پکڑی جا سکے۔

۲.... جس کے پاس سکون و اطمینان حاصل کیا جا سکے۔

۳.... جس کی طرف انتہائی شوق و محبت کے ساتھ متوجہ ہونا پڑے۔

۴.... جس کی طرف بے قرار ہونا پڑے۔ (جیسا کہ وہ بچہ جس کا دودھ چھڑایا گیا ہو اور وہ بے قرار ہو کر اپنی ماں سے لپٹ جائے)۔

۵.... درماندہ اور متحیر کرنے والی ہستی۔

۶.... وہ ہستی جو خود تو کسی کی محتاج نہ ہو لیکن باقی سب اپنی تخلیق و بقا اور اپنی زندگی کے پورے معاملات میں اس سے مدد مانگنے کے لیے مجبور ہوں۔

۷.... وہ ذات جو لائق عبادت ہو۔

اسی طرح لفظ الٰہ اور بھی بہت سے معنوں کو شامل ہے لیکن یہ آخری نمبر اس کا بنیادی معنی ہے اور یہی معنی باقی تمام معنوں پر بھی بلا تکلف مشتمل ہو سکتا ہے۔

لفظ الٰہ کا لفظی ترجمہ معبود (یعنی عبادت و بندگی کے لائق) ہے پس معبود کے سوا کوئی مختصر ترجمہ ایسا نہیں جو آسانی کے ساتھ دوسرے معنوں پر مشتمل ہو سکے۔

مثلاً محبوب، مطلوب، حاکم اگرچہ لفظ الٰہ کے مفہوم میں داخل ہیں اور غیر اللہ سے ان معنوں، بلکہ تمام اسمائے حسنیٰ کی نفی صحیح ہے، بلکہ کسی کے جواب میں ان معنوں کو صرف ایک اللہ کے لیے ثابت کرنا ضروری بھی ہے۔ مثلاً ایسا شخص جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو حاکمِ حقیقی سمجھ لیا ہو اس کے جواب میں یہ کہنا کہ

لا حَا کمَ اِلا اللہ، لا مَالكَ اِلا اللہ۔ یا یہ کہنا کہ لا محبُوبَ اِلا اللہ لا مطلوبَ اِلا اللہ، لا رزَّاقَ اِلا اللہ۔ اسی طرح تمام صفاتِ کمال کی غیر اللہ سے نفی صحیح ہے اور کسی کے جواب میں ان کا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کرنا ضروری بھی ہے، لیکن ان میں سے کوئی مفہوم ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی دوسری صفات کو بے تکلّف شامل کیا جائے۔ دیکھیں! معبود کے لیے محبوب ہونا ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر محبوب معبود بھی ہو یہی حال حاکم وغیرہ دوسری صفات کا ہے۔

اس لیے اِلٰہ کا مختصر ترجمہ اگر کسی لفظ سے ادا ہو سکتا ہے تو وہ معبود ہے یعنی وہ ذات جو اپنی شان و شوکت اور عظمت و جلال کے لحاظ سے عبادت اور بندگی کے لائق ہو اور یہ معنی ایسا ہے کہ اس میں دوسروں کی بہ نسبت بہت کم تکلف کرنا پڑتا ہے، کیونکہ دل و جان سے بندگی کی مستحق ایسی ذات ہو سکتی ہے جو تمام صفاتِ کمال سے متصف ہو اور اس کی قدرت، اقتدار، قوت، اختیار کی وسعت و عظمت کا اندازہ لگانے سے عقلیں عاجز و درماندہ رہ جائیں اور جس کی طاقتیں، قوتیں ایسی پُر اسرار اور لا محدود ہوں کہ انسان اس معاملہ میں حیران و سرگرداں رہ جائے اور جوں جوں اس کی معرفت اور صفات کی پہچان میں بڑھتا چلا جائے اس کی حیرانی اور محبت و تعظیم بڑھتی چلی جائے۔ انسان پر جس قدر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلال و کبریائی کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اسی قدر اس پر اپنی پستی کھلتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی وانکساری اور اس کی بندگی میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، آخر عبادت تو اسی ہستی کی ہوگی جس پر کامل بھروسہ ہو اور اس کی عظمت وجلال سے دل لرز جاتے ہوں۔ جس کے ساتھ امیدیں باندھی جائیں اور وہ کارساز ہو اور جس کی محبت میں دل بے قرار ہو سکتے ہوں اور جس کے ہاں ہر مصیبت سے پناہ اور ہر قسم کا اطمینان و سکون مل سکتا ہو، اب جس ہستی کی یہ شان ہو تو وہ انسان کی محبوب و مطلوب بن جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ جب مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری ہستیوں اور لیڈروں کو مشکل کُشا، حاجت روا اور اپنی امیدوں کو بر لانے والا سمجھ لیا تو وہ اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کو چھوڑ گئے اور ان کے دلوں پر انہی ہستیوں کی ایسی عظمت و محبت چھا گئی کہ وہ ان کی پرستش کرنے لگے۔ وہ جن ہستیوں یا لیڈروں اور بتوں کو پرستش کے لائق سمجھتے تھے وہ ان کو ان کی پرستش، بندگی اور غلامی کی بنیاد پر ہی اپنے الٰہ اور معبود سمجھتے تھے جیسا کہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا جارہا ہے قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ "اس نے کہا کیا تم میرے الٰہوں (معبودوں) سے پھر گئے ہو"۔ (مریم:۴۶)

اور رسول کریم ﷺ کے متعلق مشرکین کہتے تھے:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ﴿۵﴾

"کیا اس نے بہت سے الٰہوں (معبودوں) کی جگہ ایک ہی الٰہ (معبود) بنا دیا؟ بلاشبہ یہ بڑی عجیب بات ہے"۔ (ص:۵)

حالانکہ وہ ان ہستیوں کو خالق و مالک اور تمام صفاتِ کمال سے متصف نہیں مانتے تھے، بلکہ وہ کائنات کے خالق و مالک اور اس کا رب صرف ایک اللہ ہی کو مانتے تھے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ ﴿۸۶﴾ سَیَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ

"آپ ان سے پوچھیے! کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا پروردگار کون ہے؟ وہ کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے"۔ (مؤمنون:۸۶-۸۷)

مذکورہ بحث سے یہ معلوم ہوا کہ الٰہ کا اگر کوئی مختصر ترجمہ ہو سکتا ہے جو لفظ الٰہ کے لیے لغوی اعتبار سے بھی درست ہو اور اس کے وسیع معنی پر بھی کسی قدر احاطہ کر سکے تو وہ لفظ معبود ہی ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت کی طرف رہنمائی ہمیں دوسری آیاتِ کریمہ سے بھی ملتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱.... وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾ (الذاریات:۵۶)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اپنی عبادت (بندگی) کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے انسان اور جنات کا مقصدِ پیدائش یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کو لائق عبادت یعنی معبود نہ سمجھے اور نہ بنائے اور عبادت کے مفہوم میں اللہ تعالیٰ کی معرفت، اسی کی طرف انابت اور اس کے ساتھ محبت و اخلاص وغیرہ سب ہی داخل ہیں بلکہ بعض مفسرین تو لِیَعْبُدُوْنِ اور عبادت کے معنی توحید ہی سے کرتے ہیں، توحید لفظ عبادت کے مفہوم میں شامل ہے اور بالآخر اس سے بھی مراد وہی ہوتا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نفع و نقصان کا مالک اور حقیقی حاکم نہ مانا جائے، صرف اسی کو الٰہ و معبود مانا جائے، صرف اسی کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

۲.... نیز اللہ تعالیٰ بار بار قرآن مجید میں نبیوں کے متعلق یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم سے یوں فرمایا:

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ

"اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ (یعنی معبود) نہیں"۔ (اعراف:۵۹)

۳.... وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝۲۵

"اور (اے پیغمبر) ہم نے تجھ سے پہلے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جس پر ہم نے اس بات کی وحی نہ بھیجی ہو کہ کوئی اِلٰہ یعنی معبود نہیں مگر صرف میری ذات ہے پس میری ہی عبادت (بندگی) کرو"۔ (الانبیاء:۲۵)

مذکورہ بالا آیتوں سے بھی یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ لفظ الٰہ کا لفظی ترجمہ معبود ہی زیادہ صحیح ہے اور ایسی آیتوں میں الٰہ کا یہی معنی زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی معبود (یعنی لائق عبادت و بندگی) نہیں، لہٰذا صرف اسی کی عبادت اور بندگی کیا کرو۔ لفظ الٰہ کے معنی اور مفہوم کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ کی توحید کی وضاحت کرتے ہیں۔

توحید کے دو پہلو یا دو حصے

توحیدِ الٰہی کے دو حصے ہیں ایک اعتقادی حصہ اور دوسرا عملی حصہ یعنی عبادات۔ یہ عقیدہ و عمل دونوں مل کر توحیدِ الٰہی کی تکمیل کرتے ہیں اور اسی کو بندگی کہا جاتا ہے۔

توحید کا بیان

انسان زندگی کی ہر مشکل میں فطرۃً اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف مائل اور متوجہ ہوتا ہے اور اسی کو چاہتا ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے نفع و نقصان پر اسباب و عوامل کا پردہ ڈال رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی صفاتِ کمال کی تجلیاں مخلوقات پر بقدر ان کی صلاحیت و استعداد کے کرتا ہے اس لیے انسان ان مخلوقات اور اسباب و عوامل کو نفع و ضرر اور کمالات کا مالک سمجھنا شروع کر دیتا ہے اور جب اس کا میلان ان کی طرف مکمل اور تام ہو جاتا ہے تو ان کو اپنا الٰہ (معبود) قرار دیتا ہے اور انہی چیزوں کو مستقل طور پر نافع اور ضرر رساں یا ان کو حقیقی خدا کا قائم مقام اور حاجت روا سمجھ کر ان سے اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے مدد طلب کرنے لگتا ہے، ان سے غلامی اور بندگی کی نسبت قائم کرتا ہے، ان کی پرستش کرتا ہے اور ان کے آگے سجدہ ریزی کرتا ہے، خواہ وہ سجدہ ظاہری اور باطنی دونوں لحاظ سے ہو یا صرف ظاہراً دل اس کا سجدہ میں مشغول ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے خالق و مالک اور محبوبِ حقیقی کو چھوڑ کر اسی مخلوق سے محبت کرنے لگتا ہے کہ وہ اس کی محبت میں اللہ تعالیٰ کے حدود اور قوانین کو چھوڑ دیتا ہے۔ اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کے ذریعہ یہ پیغامِ حق پہنچادیا اور اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کی کہ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی الٰہ نہیں ہے" وہی ایک ہستی ایسی ہے جو الٰہ بنانے کے قابل ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کچھ صفات کا ذکر

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور صرف وہی ہمیں اور ہمارے ماں باپ، زمین و آسمان، جن وانس اور فرشتوں غرض تمام مخلوقات اور ساری کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، اسی کی وجہ سے ہر چیز موجود ہے اور موجود رہتی ہے، تمام کائنات کی تدبیر، نظام و قیام اس کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ کائنات کے ذرے ذرے اور تمام مخلوقات کا تن تنہا پیدا کرنے والا ہے، وہی تن تنہا سارے نظام کو چلانے والا ہے، کائنات کی تخلیق کے معاملہ میں اور کسی مرحلہ میں اس کا کوئی شریک اور مُعین و مددگار نہیں، وہ علیم و خبیر ہستی ہے، اس سے نہ کوئی چیز مخفی ہے اور نہ مخفی رہ سکتی ہے، وہ کائنات کے ایک ایک ذرے اور ساری مخلوقات کے اقوال، حرکات و سکنات اور ان کے ظاہر و پوشیدہ چیزوں اور خیالات، بلکہ چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی زیادہ مخفی لاشعور میں جو کچھ ہے، وہ سب کے سب ہر لحظہ ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، وہ ان کو خوب جانتا دیکھتا اور سنتا ہے، اس کا علم و قدرت اور اختیار کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہے اور اس کے حکم و علم کے بغیر کسی درخت کا کوئی پتہ بھی نہ ہل سکتا ہے اور نہ گر سکتا ہے اور اسی کے پاس خزانۂ غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ①

وہی زندہ و جاوید ہے، اس کے سوا جس کو زندگی ملی ہے اسی کی دی ہوئی ہے، زندگی اور موت صرف اسی کے ہاتھ میں ہے۔

حکمت و دانائی کا مبدا و منتہا اور رحمت و رأفت کا منبع و سرچشمہ وہی ہے، اسی کی جزا و ثواب اور اس کے انعامات بے حد و بے حساب ہیں اسی طرح اس کی سزا و عذاب بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

نہ اس کا باپ ہے، نہ بیٹا، نہ بیٹی، نہ بیوی، نہ کوئی اور رشتہ دار، وہ اس طرح کی تمام فانی نسبتوں اور تعلقات سے پاک و بالاتر ہے۔ وہ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ سوتا ہے اور نہ اس کو اونگھ آتی ہے، وہ ہمہ وقت بیدار اور باخبر ہے اور ساری مخلوق صرف اسی کی توجہ سے باقی ہے، اس کی وسعت غیر محدود ہے اور اس کی مشیت اور قانونِ مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ ہے، وہ زبردست اور بے انتہا قدرت و بے پناہ طاقت کا مالک ہے، کوئی اسے عاجز نہیں کر سکتا اور نہ کوئی اس کے قانون کی گرفت کے قابو سے باہر ہو سکتا ہے، اس کی مشیت علم و حکمت پر مبنی ہوتی ہے، اس کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں، وہ سب پر حاکم ہے، اس پر کوئی حاکم نہیں، اس نے کسی کو بھی نفع و نقصان کے اختیارات نہیں دیے ہیں اور نہ اس کے حکم میں الٹ پلٹ کا کسی کو اختیار ہے اور نہ اس کے کاموں میں

---

① علم غیب پر تفصیلی بحث کے لیے بندہ کی کتاب "عقیدہ اور عقیدت" کی طرف رجوع فرمائیے۔ (مختار الدین)

کسی کو دخل دینے کی مجال ہے۔ بندوں کو مشکلات و مصائب سے بچانے والا صرف وہی ہے، فائدہ اور نقصان راحت و تکلیف اور ضرر وغیرہ صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور وہی ان کا مالک ہے، وہ جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کرے، وہی رزق بڑھاتا ہے اور گھٹاتا ہے، تمام مخلوقات کی تربیت اور پرورش کرتا ہے، وہ اکیلے مخلوق کے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے اور تمام مخلوق مل کر اللہ تعالیٰ کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی، صرف وہی قسمتوں اور ہر طرح کے بناؤ و بگاڑ کا مالک ہے، وہی تمام اختیارات کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی حقیقی مالک نہیں۔ غرض وہ بے انتہا خوبیوں اور کمالات کا مالک ہے اور تمام اچھی اور کمال والی صفات اس کی ذاتی صفات ہیں۔ یہ صفات ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، نہ اس سے کسی وقت اس کی کوئی صفت دور یا کمزور ہو سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے، وہ تمام عیبوں اور ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے اور ساری کائنات کی ہر ہر چیز اور تمام تر مخلوق سب کی سب ہر حال، ہر آن، ہر لحظہ اس کے فقیر و محتاج ہیں خواہ کوئی مخلوق اپنے فقر و احتیاج کو محسوس کرے یا نہ کرے ہر حال میں اسی کی محتاج ہے اور محتاج رہتی ہے اور وہی ایک ہستی ایسی ہے جو کسی کی کسی طرح بھی محتاج نہیں، وہی ایک ہستی ایسی ہے کہ نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے کہ جس کے ساتھ مل کر وہ منصبِ معبودیت اور خدائی پر فائز ہو اور نہ صفات میں کوئی اس کا شریک ہے کہ جن صفاتِ کمال سے وہ متصف ہے ایسی صفات اس کے شریک کے اندر بھی پائی جاتی ہوں اور نہ اس نے کسی کو اپنی صفات کے اجرا و نفاذ کا اختیار دے رکھا ہے۔ وہ جس طرح تجسُّم (یعنی اس کے لیے جسم ہونے) اور تشبُّہ (یعنی کسی کی طرح ہونے) سے بالاتر ہے، اسی طرح وہ بے مثل و بے نظیر ہے، کسی چیز میں اس کا کوئی بھی ہمسر و نظیر نہیں، اس سے زبان سے تو کیا اگر دل دل میں مانگیں گے اور پکاریں گے تو وہ ہماری پکار کو سنتا اور وہ ہماری پکار سے خوش ہوتا ہے، اس سے ہمارے تمام کام طے پاتے ہیں اور وہ ہی ہماری حاجتوں اور تمناؤں کو پورا کر سکتا ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر ادھر سے ادھر ہل سکے۔ جب اس کا علم و قدرت اور اختیار ساری کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے تو ظاہر ہے کہ عزت و ذلت، نفع نقصان اور ہر چیز کا مالک وہی ہے اور صرف اس کے قانون کے مطابق حقیقی عزت اور نفع حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس کے قانون کی خلاف ورزی انسان کو ذلت و نقصان اور ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔

جب یہ عقیدہ انسان کے ذہن پر چھا جاتا ہے اور توحید کا اعتقادی پہلو دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے تو توحید کے دوسرے عملی پہلو کی آبشاریں اور چشمے خود بخود دل سے پھوٹنے لگتے ہیں۔ وہ یہ کہ بس وہی خود براہِ راست

عبادت اور بندگی کے لائق ہے، نہ کہ اس کے مظاہر اور مخلوق، بندوں اور اسباب و وسائل کی بندگی کی جائے، صرف وہ ہستی مستحق استعانت ہے، مصیبتوں، پریشانیوں اور اپنی تمام تر حاجتوں میں اسی سے دعا اور التجا کی جائے اور اسی سے مدد مانگی جائے اور صرف اسی سے امیدیں باندھی جائیں اور اسی کے ساتھ لو لگائی جائے اور اسی کو چاہیں اور اسی کے ساتھ محبت رکھیں اور اسی کے لیے کسی سے محبت اور اسی کے لیے بغض رکھیں۔ اور اسی کے ساتھ ہماری وفاداریاں وابستہ ہوں اور اسی کے حکموں پر پوری وفاداری کے ساتھ چلیں اور اس کے حکم کے خلاف کسی دوسرے کا کوئی حکم ہرگز نہیں مانیں گے چاہے وہ کوئی بھی ہو خواہ اپنے والدین ہوں یا رشتہ دار اور کنبہ ہو یا حاکم ہو یا پیارا دوست ہو یا اپنے نفس کی خواہش اور چاہت ہو اور اسی کی بندگی و احکامات پر توکل اور بھروسہ کریں گے اور وہی ہمارے لیے کافی اور بس ہے۔

توحید کا خلاصہ

لا الہ الا اللہ، ایمان باللہ اور توحید کے اسی مطلب کو قدرِ مختصر کر کے یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق مانا جائے اور اسی کو ہر کمال سے متصف اور ہر خوبی کا مالک اور اس کی جملہ صفات کو کامل، مکمل، ہر عیب و نقص سے منزّہ اور پاک یقین کیا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ وہ ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا اور بے مثل ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ صرف اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے، اس کی توفیق کے بغیر نہ کوئی خود کچھ کر سکتا ہے اور نہ کائنات کے کسی ذرے میں ادنیٰ تصرف کر سکتا ہے بس وہی عزت و ذلت نفع و نقصان کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں جو کسی بھی نفع و نقصان کی مالک ہو۔ بس صرف وہی الٰہ اور معبود بنانے کے لائق ہے اور وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اسی کی مرضی کی اطاعت اور بندگی کو زندگی کا نصب العین اور حقیقی مقصد بنایا جائے اور اس کے سوا ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے الٰہ اور معبود ہونے کا قطعی طور پر انکار کیا جائے۔ بس یہ توحید کا وہ مطلب ہے جو سمٹ کر خلاصۂ لا الہ الا اللہ میں آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی الٰہ اور معبود نہیں۔ لیکن یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ کلمہ لا الہ الا اللہ میں جس توحید اور بندگی کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کی تعمیل اور توحید کے مطالبات کی تکمیل (رسالت اور اس دور میں قیامت تک کے لیے سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے (اور ان کی تعلیمات پر اعتماد کیے) بغیر ناممکن ہے۔

اس کا بیان تو ان شاء اللہ تعالیٰ نبوت و رسالت کے باب میں آجائے گا۔

توحید کے اس بیان کے بعد شرک جو توحید کی ضد ہے اس کا بیان ضروری سمجھتا ہوں تاکہ توحید اور اس کی

ضد دونوں کی شکل وصورت سامنے آجانے کے بعد شرک وتوحید کے مابین امتیازی خط کھینچا جاسکے۔

شرک کا بیان

شرک حصہ داری یا شراکت کو کہتے ہیں۔ دینِ اسلام کی اصطلاح میں شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات یا اس کی صفات میں کسی بھی لحاظ سے کسی اور کو شریک کر دیا جائے۔

شرک کی حقیقت کی قدرے تفصیل

شرک کو آسانی کے ساتھ سمجھنے کے لیے اس کو قدرے تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے، چنانچہ شرک کی کئی قسمیں ہیں:

۱.... اللہ تعالیٰ کی ذات میں کسی اور کو شریک مانا جائے۔

۲.... اللہ تعالیٰ کی صفات میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے۔

۳.... اللہ تعالیٰ کی صفات کے نفاذ واجرا میں کسی دوسرے کو صاحبِ اختیار مانا جائے۔

۴.... اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال سے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں یا مختصر یہ کہ اس کی بندگی میں کسی اور کو شریک ٹھہرایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کا مطلب

اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات اور اس کی تدبیر میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مانا جائے یا کسی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شریک کر کے اسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا جزء قرار دیا جائے یا اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ مانا جائے کہ وہ کسی کا جز ہے مثلاً مجوسی دو خدا مانتے ہیں ایک "یزدان" اس کو وہ خالقِ خیر اور دوسرا "اہرمن" جس کو وہ خالقِ شر کہتے ہیں۔ یا مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام خدا کے اقنوم اور جز میں سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک

اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً علم، خلق، تدبیر، قدرت اور حکمت وغیرہ میں کسی اور کو کسی درجہ میں شریک مانا جائے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط موجود ہے کہ صفاتِ کمال جس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کی جاتی ہیں اسی مفہوم میں کسی اور کے لیے بھی استعمال کی جائیں کیونکہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ہم مخلوق کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی بعض صفات استعمال کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب ان کو اللہ

تعالیٰ کے لیے بولا جاتا ہے تو ان کا مطلب بالکل خاص ہوتا ہے جو اسی یکتا اور عظیم ذات کی شایانِ شان ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذاتی، ازلی، دائمی اور لامحدود ہیں۔ اور جب ان کو مخلوق کے لیے بولتے ہیں تو وہ خدائی مفہوم سے بالکل الگ کر کے بولتے ہیں یعنی وہ عطائی، عارضی، جزوی اور محدود ہوں گی۔ مثلاً رحیم، کریم، حکیم وغیرہ جیسی صفات انسانوں کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں کہ فلاں کریم شخصیت ہے یا حکیم ہے اور یہی صفات اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب یہ صفات کسی مخلوق کے لیے بولی جاتی ہیں تو ان کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں تو ان کا مفہوم ہی دوسرا اور خاص ہوتا ہے اس لیے یہی کہا جائے گا کہ اگر انسانوں کے لیے بھی انہی صفات کو اسی مفہوم میں استعمال کیا جائے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہیں تو پھر بلاشبہ یہ شرک فی الصفات ہوگا ورنہ نہیں یہی بات ہمیں قرآن مجید میں ملتی ہے، چنانچہ رسول کریم ﷺ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ "وہ ایمان والوں پر رؤف و رحیم ہیں (یعنی آپ ﷺ مؤمنین پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں)"۔ (التوبہ:۱۲۸)

یہاں رؤوف و رحیم کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ یعنی "ہم نے اس سے قبل فرعون کی قوم کو آزمایا تھا اور ان کے پاس ایک کریم رسول آیا تھا"۔ (الدخان:۱۷)

یہاں حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے کریم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے شاہِ مصر کو فرمایا: قَالَ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ "اس (یعنی یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) نے کہا زمین کے خزانوں پر مجھے مقرر کریں بے شک میں حفیظ و علیم ہوں (یعنی ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے کیونکہ میں ان کی حفاظت بھی کر سکتا ہوں اور معاشی مسائل اور اس کام کا علم بھی رکھتا ہوں)"۔ (سورۂ یوسف:۵۵) یہاں حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے حفیظ و علیم کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ انسان کے متعلق فرماتے ہیں: فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا "پس ہم نے بنا دیا اس کو سمیع و بصیر"۔ (الدھر:۲) یعنی ہم نے انسان کو سننے اور دیکھنے والا بنا دیا۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے بھی سمیع و بصیر کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفات کو انسان کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ان کو اگر خدائی مفہوم سے بالکل الگ کر کے بولتے ہیں تو اس کو شرک فی الصفات نہیں کہا جائے گا، بلکہ شرک فی الصفات اس وقت ہوگا جب کہ

اللہ کی صفات کو یا اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایک صفت کو کسی اور کے لیے اسی مفہوم میں استعمال کیا جائے جس میں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بولی جاتی ہے۔

مخلوق میں ذاتی کوئی کمال نہیں

حقیقت یہ ہے کہ خالق اور مخلوق کے کمالات کے درمیان کوئی بھی مناسبت نہیں کیونکہ تمام مخلوقات میں جو بھی خوبیاں و کمالات دکھائی دیتے ہیں یہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کی تجلیاں اور سائے ہیں جو مخلوق کے پردوں میں دھندلے سے ہمیں دکھائی دیتے ہیں، یہ سارے کمالات وخوبیاں دراصل اسی قادر مطلق ہستی کی ہیں مثلاً یہاں اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ کمال علم کو لے لیتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم

دوسری صفاتِ کمالیہ کی طرح علم بھی اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے جس میں کوئی اس کا سہیم وشریک نہیں، جس طرح تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی دوسری صفاتِ کمالیہ سے عاری اور کورے تھے، اسی طرح تمام مخلوق انس وجن اور فرشتے اصل میں بالکل بے علم تھے جس کو جو کچھ بھی علم حاصل ہوا اللہ تعالیٰ کے دینے سے حاصل ہوا۔ یہ بات کسی بھی شک وشبہ سے خالی ہے کہ تمام کائنات میں صرف ایک انسان ایسا ملتا ہے جسے پیدائشی طور پر قوتِ ارادی کے ساتھ علم کی استعداد و قوت بھی دوسری مخلوق سے زیادہ اور پورے کمال کے ساتھ دی جاتی ہے چنانچہ وہ ظاہری حواسِ خمسہ (آنکھ، کان، ناک، زبان اور چھونے کی حس) سے قابلِ احساس چیزوں کا ادراک کر کے عقل و فکر اور وجدان کے ذریعے مخفی امور معلوم کرتا ہے۔ وہ آنکھ سے صورتوں، کان سے آوازوں، زبان سے ذائقوں، ناک سے خوشبو یا بدبو، ہاتھ پیر اور تمام بدن کے چھونے سے کسی چیز کی سختی، نرمی، گرمی اور ٹھنڈک کا ادراک کر کے اپنے دماغ میں جمع کر لیتا ہے اور عقل وفکر جو دماغ میں رچی ہوئی ہے وہ قلب (یعنی دل جو ان کا حکمران اور تمام علوم کا سرچشمہ ہے) کی جنبش اور اشارے سے دماغ میں امورِ معقولہ کو خاص شعور کے ساتھ اخذ کر کے جمع کر لیتی ہے، پھر وہ نہ صرف محسوسات کی صورت ومعنویت کو جوں کا توں سمجھ لیتا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ان سمجھی ہوئی حقیقتوں میں تصرّف کر کے ان کی تفصیل اور تجزیہ بھی کرتا ہے اور اس ایک علم سے متعدد علوم کے دروازے اپنے اوپر کھول لیتا ہے، کبھی وہ ان جزوی صورتوں کے استقرا و تتبُّع سے کوئی کلیہ بنا لیتا ہے اور اس سے نئے جزئیات پیدا کرتا ہے اور کبھی وہ کسی جامع علت کی بنا پر ایک چیز تک پہنچا دیتا ہے اسی طرح اور کئی جزئیات اور چیزیں پیدا ہو کر اس کے علم میں جدید اضافہ کا باعث بنتی ہیں اسی طرح وہ کبھی ایک جز میں سے علمی نکات ولطائف پیدا کر کے

ایک گہرے علم کو حاصل کرتا ہے۔

غرض انسان اپنی بیرونی اور اندرونی حواس اور عقل کے ذریعے وہ علوم حاصل کرتا ہے جنہیں دیکھ کر ملائکہ بھی اس کی علمی استعداد اور تبحرِ علمی کے معترف ہو جاتے ہیں، لیکن جس طرح انسان میں اللہ تعالیٰ کی ان دی ہوئی قوتوں اور استعداد سے انکار نہیں، اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کہ علم اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت ہے جس کا صرف پرتو عارضی طور پر انسان پر پڑتا ہے اور جن جن چیزوں کو بھی انسان اپنی علمی دریافت سمجھتا ہے، درحقیقت وہ پہلے اس کے علم میں نہیں تھیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب چاہا جتنا چاہا ان کا علم اسے دے دیا حالانکہ وہ اس بات کو محسوس بھی نہیں کرتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ جس مرحلے پر ہر انسان کے لیے جو دروازے جس قدر کھولنا چاہے وہ اس پر اس قدر کھول دیتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

”ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے ہیں مگر ہم ہر چیز کو ایک مقرر مقدار سے نازل کرتے ہیں“۔(الحجر:۲۱)

اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات انسان کسی چھپی ہوئی چیز کو دریافت کر لیتا ہے، لیکن یہ علم غیب نہیں، بلکہ ایک مغالطہ ہے جو عام لوگوں کو ہوا کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام لفظ غیب سے مراد لغوی معنی لیتے ہیں ہر اس چیز کا علم حاصل کرنے کو علم غیب کہنے لگتے ہیں جو ان کے علم و نظر سے غائب ہو خواہ دوسروں کے نزدیک اس کا علم حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں۔ اور اس کے نتیجے میں طرح طرح کے شبہات سامنے آتے ہیں اس لیے ضروری یہ ہے کہ اس غیب کو سمجھ لیا جائے جسے قرآن کی اصطلاح میں غیب کہا جاتا ہے۔

غیب کی اقسام

غیب کے معنی مخفی اور پوشیدہ کے ہیں کسی چیز کے مستور ہونے کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں:

ا.... اس کی ایک قسم یہ ہے کہ وہ چیز جو اس مادی دنیا میں موجود ہو چاہے زمین پر ہو یا اس کے اندر ہو یا چاند یا دوسرے سیاروں وغیرہ میں تو یہ چیزیں ایسی ہیں جن میں بہت سی فرداً فرداً بعض انسانوں کے علم میں ہیں اور بعض کے علم میں نہیں ہیں، ایک چیز ہمارے سامنے ہے لیکن دوسرا شخص جو اس سے کچھ فاصلے پر ہے اس سے غائب ہے ایک چیز کسی جگہ موجود ہے ایک ہی جگہ پر دو شخصوں میں سے ایک اس کو اپنی تیز نگاہوں سے دیکھتا ہے اور

دوسرا نظر کی کمزوری کی بنا پر نہیں دیکھ پاتا یا چند اشخاص ایک ہی جگہ ہیں ان میں ایک شخص اعلیٰ قسم کی دور بین کے ذریعے سینکڑوں میل دور کسی چیز کو دیکھ رہا ہے اور اس چیز کے بارے میں دوسروں کو خبر دے رہا ہے اور دوسرے اس چیز کے عینی مشاہدہ سے محروم ہیں۔

اسی طرح ایک شخص خورد بین کے ذریعے ایک قطرہ پانی میں لاکھوں جراثیم اور وائرس کی نقل و حرکت اور ان میں مختلف قسم کے جراثیم کی پہچان اور امتیاز کرتا ہے اور دوسرے عام لوگ اس کی اس خبر کو افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

یہی حال زمین کے اندر مخفی اشیا اور خزانوں اور چاند اور دوسرے سیاروں میں موجود چیزوں کا ہے کوئی اللہ تعالیٰ کی ودیعت کی ہوئی تیز حس (خواہ ظاہری حس ہو یا باطنی) کے واسطے سے یا کسی آلے اور تجربہ یا کسی اور ذریعے سے کچھ چیزیں معلوم یا محسوس کرتا ہے اور کوئی اس سے کورا اور بے خبر ہوتا ہے اس قسم کی ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو غیب نہیں کہا جاتا۔ یہ چیزیں ساری کی ساری موجود ہیں جنہیں کوئی محسوس یا معلوم کرتا ہے کوئی نہیں یعنی بعض کے ادراک میں آتی ہیں اور بعض کے نہیں۔

۲.... دوسری قسم پوشیدہ چیزوں کی یہ ہے کہ جن کا ظہورِ تام اب تک نہ ہوا ہو، البتہ اس چیز کا مادہ اور اس کے بعض اسباب کا ظہور ہوا ہو یا اس چیز کے دنیا میں آنے کے قرائن موجود ہوں جن کو عام لوگ نہیں جان سکتے، البتہ اہل فن ان کو معلوم کر لیتے ہیں جیسے ماہر فلکیات سورج کی رفتار کا اندازہ لگا کر پہلے سے بتا دیتے ہیں کہ مثلاً فلاں دن پانچ بجے سورج طلوع ہو گا اور چھ بجے غروب اور فلاں دن پانچ بج کر دس منٹ پر طلوع آفتاب ہو گا اور پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر غروب ہو گا یا کوئی حساب لگا کر کہتا ہے کہ فلاں ماہ فلاں تاریخ کو سورج گرہن یا چاند گرہن ہو گا اور جیسا کہ جنتریوں اور اوقات کے نقشوں میں یہ معلومات ہمیں ملتی ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک محسوس اور معلوم چیز کی رفتار سے اندازہ لگانا ہوتا ہے جیسا کہ ائیر پورٹ والے ہمیں جہازوں کی آمد اور اسٹیشن والے ریلوں وغیرہ کی آمد کی اطلاع دیتے رہتے ہیں ان جیسی تمام اشیاء کا تعلق حساب سے ہوا کرتا ہے، اسی طرح ماہرینِ موسمیات بارش وغیرہ کے متعلق پیشن گوئیاں کرتے ہیں، ماہرینِ طب ونفسیات نبض دیکھ کر یا کسی آلے کے ذریعے معائنہ کر کے مریض کی چھپی ہوئی حالت، بلکہ اس پر آئندہ آنے والی کسی بیماری کی خبر دیتے ہیں اور بسا اوقات یہ خبریں پیشن گوئی کے مطابق واقع بھی ہو جاتی ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرینِ موسمیات یا ڈاکٹر وغیرہ کو ایسی خبریں دینے کا موقع اس وقت ہاتھ آتا ہے جب کہ ان واقعات اور حالات کا

مادہ اور ان کے بعض اسباب ظاہر ہو جاتے ہیں چنانچہ ماہرینِ موسمیات مون سون کے رخ اور اس کی قوت اور رفتار کو دیکھتے ہیں تو وہ اندازہ کر کے کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جگہ بادو باراں یا گرج چمک کا امکان ہے اور فلاں فلاں جگہ موسم خشک رہے گا۔

یہی حال ڈاکٹر اور طبیبوں کا ہے وہ کسی شخص میں کسی بیماری کے جراثیم دیکھ لیتے ہیں یا کسی بیماری سے دوسری بیماری لگ جانے کا تجربہ ان کو ہوتا ہے یا اسی طرح دوسرے ذرائع سے کسی آنے والے مرض کا مادہ معلوم کر کے خبر دیتے ہیں۔

غرض! محکمہ موسمیات والے ہوں یا ڈاکٹر جتنے بھی ماہرینِ فن ہیں وہ کسی چیز کے بارے میں اطلاع تب دے سکتے ہیں جب ان واقعات کا مادہ اور اسباب ظاہر ہوں اگرچہ اس چیز کا وجود منظرِ عام پر نہ آسکا ہو اور عوام اس سے بے خبر رہتے ہوں جب وہ مادہ قوی ہو جاتا ہے تو اس کا ظہور عام ہو جاتا ہے تو ایسی چیزیں جن کے وجود میں آنے کا مادہ موجود ہو چکا ہو یا جس چیز کے اسباب و آثار اور نشانات اہلِ فن کے نزدیک ظاہر ہو چکے ہوں وہ (تو ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں تو اللہ تعالیٰ خود ہی لوگوں پر کھول دیتا ہے کہ ان چیزوں کے اسباب اور علامات کو ظاہر کر دیتا ہے تو اسی طرح وہ چیزیں بھی) پردۂ غیب میں نہیں رہتیں، بلکہ ایک گونہ ظہور ان کا ہو چکا ہوتا ہے لیکن ان کی لطافت یا کمزوری کی وجہ سے عام مشاہدہ میں ابھی نہیں آئیں۔

اس کے علاوہ ان سب چیزوں سے حاصل ہونے والی واقفیت سب کچھ ہونے کے بعد بھی تخمینہ اور اندازہ ہی کی حیثیت رکھتی ہے علم جو یقین کا نام ہے وہ ان میں کسی چیز کو حاصل نہیں، البتہ جو چیزیں حسابات سے متعلق ہیں ان کا علم اگرچہ علم ہے مگر وہ غیب نہیں کیونکہ اس فن سے کسی موجود اور محسوس چیز کا رخ، رفتار اور اس کی قوت سے حساب لگا کر اس کی آمد اور منظر عام پر آنے کا وقت متعین کیا جاتا ہے جیسا کہ چاند گرہن وغیرہ کے اوقات متعین کیے جاتے ہیں۔

۳.... مستور چیزوں کی تیسری قسم وہ ہے جن کا تعلق اس مادی عالم سے نہیں، بلکہ ان چیزوں کا محل و مقام عالَمِ مثال ہے۔[1] یہ چیزیں ایسی ہیں جن کا ادراک ظاہر حواس اور آلات سے نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ چیزیں بھی اس لیے غیب میں داخل نہیں، کہ جو چیزیں پردۂ غیب سے عالَمِ مثال میں آجاتی ہیں وہ اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہوتی ہیں،

---

① عالَمِ مثال ایک عالَم ہے جو عالَمِ ارواح اور عالَمِ اجسام کے درمیان بتایا جاتا ہے۔ بعض علماء اس عالَم کو مانتے ہیں اگر کوئی اس کو تسلیم نہ کرے تو تیسری قسم سے وہ مستور چیزیں مراد ہوں گی جن کا خروج پردۂ غیب سے ہو چکا ہو، لیکن اس عالَمِ اجسام میں موجود نہ ہوں۔

لیکن عالَمِ ملکوت میں ملائکہ کے سامنے ہوتی ہیں اور ہم بھی بعض اوقات کسی آنے والے واقعہ کو نورانی خواب کے ذریعے عالَمِ مثال میں دیکھ لیتے ہیں اور بعد میں وہ واقعہ جوں کا توں یا صحیح تعبیر کے موافق ظہور میں آجاتا ہے، اسی طرح اہلِ کشف بیداری کی حالت میں روحانی تجلی میں بعض اشیاء کا ادراک کرتے ہیں اور یہ کسی ولی اللہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اشراقی ① اور اہلِ ریاضت بھی کبھی بعض چیزوں سے واقف ہو جاتے ہیں لیکن خواب، مکاشفہ وغیرہ میں قوتِ وہمیہ کی آمیزش اس علم ویقین کو ظن میں تبدیل کرتی ہے اس لیے سوائے انبیا علیہم السلام کے کشف کے جس قدر طریقے ہیں ان میں غلطی کا احتمال علیٰ حسب مراتب باقی رہتا ہے کسی میں غلطی کا احتمال زیادہ ہوتا ہے اور کسی کے کشف میں غلطی کا احتمال کم، لیکن وہ غلطی کے احتمال سے پاک نہیں اس لیے اس جاننے کو علم بمعنی یقین نہیں کہہ سکتے، البتہ انبیا علیہم السلام کو جو کشف ہوا کرتا تھا اس کے آگے پیچھے ملائکہ کا پہرہ ہوا کرتا تھا جس کی وجہ سے شیاطین ان کی قوتِ وہمیہ وخیالیہ اور عادات وطبائع وغیرہ پر کچھ دست درازی نہیں کرسکتے اور وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک صاف ہو کر انبیا علیہم السلام کو دکھائی دیتے ہیں اس لیے ان کے مکاشفات اور خواب بھی وحی کی اقسام میں سے ہوتے ہیں، جب کہ اولیائے کرام کے مکاشفات اور الہامات میں محافظت نہیں ہوتی اس لیے ان کو قرآن وسنت پر پرکھا جاتا ہے، ان کے مکاشفات اور الہامات ظنی اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے لوگوں پر حُجّتِ قاطعہ نہیں ہوتے اور نہ ان پر دوسرے مسلمانوں کو پابند کیا جاتا ہے۔

۴.... غیب کی چوتھی قسم آئندہ آنے والے ایسے واقعات ہیں جن کو نہ اللہ تعالیٰ نے اب تک اس دنیا میں پیدا کیا ہے اور نہ ان کے آثار ونشانات کو اس مادی عالم میں بھیجا ہے اور نہ ان کا ورود عالَمِ مثال میں ہوا ہے۔ یہ ایسے تکوینی

---

① اشراقیت اور روحانیت عقل پرستی کے خلاف ایک طبعی ردعمل ہے جس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ حق اور یقین کے دریافت کے لیے حواس، عقل، علم اور قیاس وغیرہ قطعاً مفید نہیں بلکہ مضر ہیں۔ صداقت اور حقیقت کے یقینی حصول کے لیے مشاہدہ شرط ہے اور یہ مشاہدہ صرف نورِ باطن، صفائی نفس اور ایک اندرونی حاسہ کو بیدار کردینے سے ممکن ہے جو روحانیت اور ماورائے طبیعیات کا اس طرح ادراک کرتا ہے جس طرح یہ ظاہری حواس ظاہری چیزوں کا ادراک کرتے ہیں۔ یہ حاسہ اس وقت بیدار ہو سکتا ہے جس وقت مادیت کو فنا اور ظاہری حواس کو مردہ کر دیا جائے۔ حقائق کی تحصیل اس حکمت اشراق اور نورِ باطن سے ممکن ہے جو ریاضتوں، نفس کشی اور مراقبۂ فکر سے پیدا ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسان کے پاس ایسا باطنی اور اندرونی حاسہ ہے جس کو اگر بیدار کرلیں اور ترقی دیں تو اس اقلیم کے بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کرسکتا ہے جن کا ادراک کسی حاسہ ظاہری سے ممکن نہیں یہ بالکل صحیح ہے بلکہ ممکن ہے کہ ایسے اور دوسرے حواس بھی ہیں لیکن بہر حال یہ بھی حواس ہی ہیں اور اسی طرح کمزور اور محدود ہیں جس طرح دوسرے حواس ظاہرہ اور اسی طرح خطا پذیر اور متاثر ہونے والے ہیں جس طرح انسان کی دوسری طاقتیں۔ ورنہ اس کے نتائج میں تعارض اور تناقض نہ ہوتا اس میں شک واحتمال پیدا نہ ہوتا اور بڑے بڑے اہم مسائل میں خطا اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حاسہ کے محسوسات اور اس علم کی تحقیقات میں اس سے کہیں زیادہ تعارض واختلاف ہے، جتنا کہ حواس ظاہری کے محسوسات میں واقع ہوتا ہے اور اہلِ کشف واشراق کے علوم وتحقیقات میں اتنا تناقض اور تعارض ہے جس کی نظیر شاید عقلیت میں مل سکے۔

واقعات اور غیبی تکوینیات[1] ہیں جن پر غیب کے معنی صادق آتے ہیں اور تکوینیات میں سے یہ ایسے غیبی امور ہیں جن کا سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو علم نہیں البتہ ایسے آئندہ رونما ہونے والے واقعات کا جزوی علم ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندے نبی مرسل کو بذریعہ وحی بتادیتے ہیں جیسا کہ قیامت کا آنا، حساب وکتاب کا ہونا، دوزخ جنت کے حالات اور دنیا میں آنے والے واقعات کی پیش گوئیاں[2] لیکن ایسی صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ آنے والی چیزوں کی اطلاع اپنے کسی خاص بندے کو کر دیتے ہیں تو وہ چیزیں غیب نہیں رہتیں، بلکہ وہ غیب کی خبریں ہو جاتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو پہنچا دیتے ہیں۔

یہاں تک تو مستور چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کا تعلق تکوینیات سے تھا جن کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ ان امور میں سے صرف جزئیات اور بعض واقعات وحالات کا علم اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کسی ذریعے سے ضرورت کے مطابق بتادیتے ہیں لیکن ان امور غیبیہ کی کلیات اور ان کے تمام علم تک کسی بھی مخلوق کی رسائی ناممکن ہے خواہ مَلَک ہو یا نبی مرسل جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۵۹﴾

"اس کے پاس غیب کی چابیاں ہیں (یعنی وہی غیب کے ذخیروں کا مالک ہے) انہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جو کچھ خشکی میں ہے اور جو سمندروں میں ہے سب سے وہ واقف ہے درختوں سے کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ (اللہ تعالیٰ) اسے جانتا ہے زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ نہیں اور کوئی خشک وتر چیز نہیں مگر یہ کہ (سب کچھ) ایک کھلی اور واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے"۔ (الانعام:۵۹)

اس کا مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں (یعنی اصول وکلیات) اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور غیب کے اصول وکلیات اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیے، بلکہ ان کو اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے، وہ اپنے خزانوں میں سے جس وقت چاہے جس قدر چاہے کسی پر کھول دیتا ہے خواہ وہ کروڑوں، اربوں غیبی جزئیات وواقعات کسی بندے پر کھول دے، لیکن کسی کو یہ قدرت نہیں کہ وہ اپنے حواس (عقل وغیرہ) آلات یا ادراک کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے غیبی خزانوں تک راہ پاسکے اور نہ کسی کے بس میں یہ بات ہے کہ جتنے غیبی علوم اللہ تعالیٰ نے

---

[1] تکوینی امور وہ تمام حالات وواقعات ہیں جن کا تعلق قیامت سے یا کائنات میں آنے والے واقعات سے ہے مثلاً یہ کہ کوئی کب پیدا ہوگا؟ کہاں پیدا ہوگا؟ کیا کیا کام کرے گا؟ کتنی عمر ہوگی؟ عمر میں کیسے حالات سے گذرے گا؟ وغیرہ۔ مختار

[2] جیسے دجال کا آنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ دنیا میں تشریف لانا، دجال کی ہلاکت ان کے ہاتھوں سے ہونا، سورج کا مغرب سے نکلنا وغیرہ۔ مختار

اس پر کھول دیے ہیں وہ از خود ان غیبی علوم میں اضافہ کر سکے کیونکہ غیبی علوم کی کنجیاں اور ان کے اصول و کلیات صرف اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔

اس حقیقت کا اعلان اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب اور آخری پیغمبر سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے ان الفاظ میں فرمایا ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۵۰

"(اے پیغمبر! آپ ان لوگوں سے) کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں، اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو فقط اسی بات پر چلتا ہوں جو مجھ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) وحی کی جاتی ہے (اور اس کی طرف تمہیں بھی بلاتا ہوں پھر ان سے) پوچھو کیا اندھا (جس کو حقیقت کا کوئی علم و یقین نہیں) اور آنکھوں والا (جو حقیقت کی روشنی دیکھ رہا ہے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ کیا تم غور نہیں کرتے"۔ (الانعام:۵۰)

۵.... غیب کی پانچویں قسم وہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور اس کی پسند اور ناپسند کا علم حاصل ہوتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے احکامات کا علم جس میں عقائد، اعمال، معاملات، معاشرت اور اخلاق غرض پوری زندگی (خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی) میں اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور غیر مرضیات سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہ بھی وہ علم ہے جسے کوئی مخلوق انسان وغیرہ (خواہ کتنا ہی ذہین و فہیم ہو اس کی ریاضت اور روحانیت کا پایہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو اس کا باطن کتنا ہی روشن کیوں نہ ہو اسے) نہیں جان سکتا۔ قرآن مجید میں اس طرح آتا ہے:

قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ۝۲۵ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ۝۲۶ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝۲۷

"(اے پیغمبر! آپ ان سے) کہہ دیجیے کہ میں نہیں جانتا کہ جس (عذاب) کا تم سے وعدہ کیا جا رہا ہے وہ نزدیک ہے یا میرا رب اس کے لیے لمبی مدت مقرر فرماتا ہے۔ وہی عالِم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں فرماتا مگر جس رسول کو (اس کام کے لیے) پسند فرمالے۔ تو اس کے آگے پیچھے محافظ بھیج دیتا ہے"۔ (الجن:۲۵-۲۷)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مشرکین مکہ اور کفار نے آپ ﷺ سے قیامت اور عذاب کا معین وقت بتلانے پر اصرار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ آپ ان سے یہ کہہ دیں کہ قیامت کا آنا اور وہاں

جزاو سزا کا ہونا تو یقینی ہے لیکن قیامت اور عذاب کے وقوع کی متعین تاریخ اور مدت کون سی ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت اور عذاب قریب آچکا ہے یا میرا رب اس کے لیے کوئی دور کی مدت مقرر کرے گا اور اس پر یہ دلیل پیش کی کہ قیامت اور عذاب کے معین وقت سے میری بے خبری اس لیے ہے کہ میں عالِم الغیب نہیں، بلکہ عالِم الغیب ہونا صرف اللہ رب العالمین کی خصوصی صفت ہے اور وہ علم غیب کلی جس سے عالَم کائنات کا کوئی ذرہ پوشیدہ نہ ہو (جو کہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے) کسی کو ایسے غیب پر قبضہ اور قدرت نہیں جس سے سارے کلیات و جزئیات اور غیبی امور اس کو معلوم ہو جائیں، البتہ جس کو اللہ تعالیٰ منصبِ رسالت و نبوت کے لیے پسند فرماتے ہیں تو اسے بقدرِ ضرورت امورِ غیبیہ کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور ان معلومات اور غیبی خبروں کو محفوظ ترین طریقے سے اپنے بندے کو پہنچا دینے کے لیے ان کے نزول کے وقت فرشتوں کا پہرہ اور چوکیاں رکھی جاتی ہیں تاکہ وحی الٰہی ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہے اسی وجہ سے انبیائے کرام علیہم السلام کے علم میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں ہوتی یہاں استثنا (اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی) میں غیبِ کلی اور تمام امورِ غیبیہ مراد نہیں بلکہ وہ امورِ غیبیہ اور احکاماتِ شرعیہ مراد ہیں جن کا تعلق منصب رسالت اور نبوت سے ہے جیسا کہ اس سے پہلی آیتِ کریمہ سے یہ واضح ہے اور اس طرح اس کے بعد والی آیت میں اس کی وضاحت موجود ہے اللہ تعالیٰ اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:

لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

"تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیے اور (حقیقت میں پہلے ہی سے) اللہ تعالیٰ ان تمام احوال کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس نے ایک ایک چیز کو گن رکھا ہے"۔(الجن:۲۸)

یہاں ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ منصبِ نبوت ورسالت کا تعلق چونکہ شریعت واحکام کی تبلیغ سے ہے اس لیے اس کی کچھ کلیات کا علم بقدرِ ضرورت انبیا علیہم السلام کو دیا جاتا ہے، محمد رسول اللہ ﷺ پر اس علم کی انتہا کی اور نبوت کو ان پر ختم کیا، چنانچہ انہیں کلیات سے ہر زمانے میں ان کے وارثین علمائے کرام پیش آنے والے واقعات کے احکامات نکال لیتے ہیں اور یہی سلسلہ تا قیامت جاری وساری رہے گا جس کی وجہ سے نہ کسی نئے نبی کی ضرورت ہے اور نہ اس کے آنے کا امکان۔

پوشیدہ اشیا کی چند ضروری اقسام کے بیان سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تکوینیات کا علم ہو یا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی مرضیات ونامرضیات کا علم ہو، سب کا سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں اور ان کا

علمِ کلی تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا نہیں فرمایا البتہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے ضرورت کے مطابق جزوی طور پر اپنے بندوں کو علم عطا فرماتا ہے پھر وہ اپنے علمِ غیب میں سے احکامِ شرعیہ تو صرف انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی بتلاتا ہے اور تکوینی امورِ غیبیہ میں سے (جیسا کہ چوتھی قسم میں بتلایا گیا) خاص خاص واقعات اور آئندہ آنے والے حالات کا علمِ جزئی بھی انبیاء علیہم السلام کو بذریعہ وحی یا اولیائے کرام کو بذریعہ الہام جس قدر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے عطا فرماتا ہے جو منجانب اللہ عطا کیا ہوا علم ہوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ

”جو کچھ مخلوقات کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے مخلوقات (میں سے کوئی بھی) اس کے علم میں سے کسی چیز پر بھی احاطہ نہیں کر سکتی مگر یہ کہ جس قدر علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے (صرف اتنا ہی علم ان کو ہو سکتا ہے)“۔(البقرہ:۲۵۵)

جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تو کفار و مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر طرح طرح کے اعتراضات کرنے لگے، وہ کہتے تھے کہ کیا رسول ایسا ہوتا ہے جو انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ غرض وہ ہر اس چیز کو دیکھ کر اعتراض کرتے تھے، جو لوازماتِ بشریت اور انسانی زندگی کے لیے از بس ضروری ہے۔ ان کفار و مشرکین کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول وہی شخص ہو سکتا ہے جو لوازماتِ بشریت سے مستثنیٰ اور مافوق البشری قوتوں کا مالک ہو۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس پر روشن ہو، ماضی اور مستقبل کی کوئی چیز اس سے چھپی ہوئی نہ ہو اس لیے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کی فرمائشیں بھی کرتے تھے چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ہم تب مانیں گے جب آپ ان خشک پہاڑوں کو ہموار اور سرسبز زمین میں تبدیل کر دیں، ان میں ایسے چشمے ابلنے لگیں جن میں سے ندیاں اور نہریں جاری ہوں وغیرہ جیسی فرمائشیں کرتے تھے نیز وہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قسم قسم کے غیبی امور بتلانے پر بھی اصرار کرتے تھے تو ان سارے بے ہودہ سوالات اور بے جا فرمائشوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ ۭ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

”آپ (ان سے) کہہ دیجیے میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں اور میں (اپنی عقل و فہم سے) نہیں جان سکتا کہ میرے ساتھ کیا ہونا ہے اور تمہارے ساتھ کیا ہو گا۔ میں صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں [1] جو میرے پاس بھیجی جاتی

(1) یعنی میں نے یہ دعویٰ کب کیا ہے کہ میں خود بخود سب کچھ جانتا ہوں اور نہ میں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خدائی اختیارات میرے ہاتھ (بقیہ اگلے صفحہ)

ہے اور میں صرف ایک صاف صاف ڈرانے (خبر دار کرنے والا) ہوں"۔ (الاحقاف:۹)

اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ان کفار و مشرکین سے کہہ دیں کہ میری رسالت و نبوت دنیا کی تاریخ میں پہلا واقعہ نہیں کہ تمہیں خدا کے رسول کو پہچاننے میں پریشانی ہو، بلکہ مجھ سے قبل بہت سے انبیاو رسل دنیا میں آچکے ہیں جن میں سے بعض کو تم جانتے بھی ہو اور تم کو ان سے عقیدت بھی ہے، وہ بھی تو انسان و بشر تھے، کھاتے پیتے تھے، آخر ان میں سے کون سا رسول ایسا گذرا ہے جس نے اپنے اختیار سے معجزہ دکھایا ہو اسی نے خود اپنے ذاتی علم سے سب کچھ جانا ہو، اگر ایسا نہیں اور نہ ہو سکتا ہے تو پھر میری رسالت و نبوت کو پرکھنے کے لیے ایسی نرالی اور انوکھی کسوٹی تم کہاں سے لائے؟۔

پھر اس کے بعد (وَ مَآ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَ لَا بِكُمْ) سے رسالت اور نبوت کی حیثیت بتلائی کہ میں اپنی عقل و شعور اور قیاس سے نہ تو یہ جانتا ہوں کہ آخرت میں میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ میں یہ جان سکتا ہوں کہ اس دنیا میں میرا اور مجھ پر ایمان لانے والوں کا اور میری اس دعوت کا انجام کیا ہو گا اور تمہارے ان مظالم اور زیادتیوں کی تمہیں کب اور کیسی سزا ملے گی؟

غرض دنیا و آخرت کے امورِ غیبیہ سے متعلق وحی الٰہی کے بغیر مجھے کوئی علم (جسے یقین کہا جاتا ہے) نہیں خواہ وہ میری ذات سے متعلق ہو یا دوسرے لوگوں (مؤمنین اور کفار و مشرکین) سے متعلق خواہ وہ معاملہ دنیا کا ہو یا آخرت کا، تفصیلی ہو یا اجمالی، اس کی مجھے کچھ خبر نہیں اور یہ امور آخرت (برزخ، جنت، دوزخ، حساب و کتاب، مشرکین و کفار کے لیے سزا اور مؤمنین کے لیے جزا) سے متعلق یا دنیا میں آئندہ پیش آنے والے واقعات کے بارے میں، میں جو کچھ بیان کرتا ہوں اس کا ذریعہ میری عقل و فہم و ذہانت کا اثر نہیں، بلکہ امور غیبیہ کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا ذریعہ وحی الٰہی ہے جو میری طرف بھیجی جاتی ہے اور میں اس کی اتباع اور پیروی کرتا ہوں۔

حاصل یہ کہ تمام غیبی امور کا علم اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دیا ہے، وہی عالم الغیب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض جاہل عوام جب یہ سنتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عالم الغیب نہیں تو وہ ان کے ساتھ یہ بھی سمجھنے لگتے ہیں کہ (معاذ اللہ) رسول اللہ ﷺ کو کسی غیب کی چیز کی خبر بھی نہیں ہو گی یہ تو نبوت و رسالت کی نفی و انکار ہے حالانکہ غیبی خبر اور غیب میں فرق واضح ہے، اگر کوئی آپ کے کان میں راز کی کوئی بات کہہ دے تو کیا اس سے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) میں ہیں تو جب میں (نے اس قسم کا دعویٰ نہیں کیا ہے تو آپ کے سوالات اور فرمائشیں بے جا اور بے وزن ہیں کیونکہ عالم الغیب اور تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اس کی طرف سے جو کچھ مجھے وحی کی جاتی ہے میں اس کی پیروی اور تعمیل کرتا ہوں۔

آپ عالم الغیب بن گئے؟ بلکہ یہ تو چھپی خبر ہے جو آپ کو بتلائی گئی اس طرح لاکھوں غیب کی چیزوں کا بذریعہ وحی بتلا دینا ان کو عالم الغیب نہیں بنا دیتا۔

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ جن چیزوں کا علم لوگوں کو بعض اسباب اور ذرائع سے عادۃً حاصل ہو جاتا ہے وہ غیب نہیں کیونکہ جب اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اسباب و ذرائع کو پیدا فرمایا تو خود اللہ تعالیٰ نے نشاندہی فرمائی تو جو شخص اسباب و ذرائع، آلات، تجربات و مشاہدات اور دلائل سے کوئی علم حاصل کرتا ہے اس کو عالم الغیب نہیں کہتے جیسے ریاضی کے قواعد سے کوئی حساب و مقدار معلوم کرلے یا طب، حکمت، نفسیات، منطق، فلسفہ، سائنسی ایجادات، ریڈیو، وائرلیس وغیرہ کے ذریعے کوئی چیز معلوم کرلے تو وہ غیب کا جاننے والا نہیں، اسی طرح کشف والہام یا وحی کے ذریعے کسی کو بعض چیزوں کا علم ہو جائے تو اس علم کو قرآن مجید میں انباء الغیب (یعنی غیب کی خبریں) کہتے ہیں جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ

"یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جن کو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں"۔ (ھود:۴۹)

عالم الغیب تو وہ ہوتا ہے جس کا علم ہر واسطہ، وسیلہ، سبب، آلات اور دلیل وغیرہ سے بے نیاز ہو اور ایسا علم صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے کہ پوری کائنات میں ہر مادہ کے رحم میں جو حمل ہو ہر ایک کو بیک وقت پوری طرح جانتا ہے کہ نیک ہو گا یا بد، خوبصورت ہو گا یا بدصورت، نیک بخت ہو گا یا بدبخت، عمر اس کی کتنی ہو گی؟ غرض مستقبل میں اس پر جو حالات اور عوارضات وارد ہونے والے ہوتے ہیں وہ تفصیل کے ساتھ ان سب کو جانتا اور دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو ان تمام اشیا کے احوال اور حقائق کا جاننے والا ہے جو کائنات میں کبھی تھے یا اب ہیں یا مستقبل میں ہوں گے۔ غرض اللہ تعالیٰ کو تمام کائنات کا ازل سے ابد تک بلا واسطہ ہر چیز کا مکمل علم ہے۔ جملہ کائنات میں جتنے ذرات ہیں ان تمام کی کل تعداد اور وزن سے اس کو واقفیت ہے، ساری دنیا کے سمندروں، دریاؤں وغیرہ میں جتنے قطرے ہیں ان کا شمار اس کے علم میں ہے، ہر بارش کے قطروں اور تمام دنیا کے درختوں کے پتوں کی تعداد اور ان میں باریک لکیروں میں سے کوئی لکیر اس سے کسی وقت مخفی نہیں رہ سکتی، وہ ہر درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے اور گرنے کے بعد بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہر درخت پر لگا ہوا پتا کتنی بار الٹ پلٹ ہو گا، کب اور کہاں گرے گا، اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ ہر چیز کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے عین حیات میں اور اس کے مرنے کے بعد کا علم تفصیل سے جانتا ہے، اس کا علم اور مشاہدہ ہر آن کائنات کے ایک ایک ذرہ کو محیط ہے اور

کوئی ذرہ اس سے کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں ہو سکتا، وہ ہر شے کی صفات، خواص، کیفیات، وزن، مقدار، تعداد و شمار کو بلا واسطہ جانتا ہے اور ان چیزوں کے جاننے میں کسی واسطے اور آلے کا محتاج نہیں اور اس کا یہ علم ذاتی اپنا ہے کسی نے اس کو سکھایا نہیں، نیز اللہ تعالیٰ کا علم لا محدود اور بے نہایت ہے، تمام مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے وہ مقدر اور محدود ہے اگرچہ حضور ﷺ تمام انبیا علیہم السلام سے زیادہ عالم تھے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے وہ علوم عطا فرمائے جو کسی مقدّس نبی، مقرّب فرشتے، بلکہ تمام مخلوقات میں سے کسی کو عطا نہیں کیے گئے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کے حقوق اور قانون کا علم، ماضی مستقبل کے لاکھوں واقعات، برزخ و قبر کے حالات جنت و دوزخ اور آخرت کا علم، غرض وہ تمام علوم جو آپ کی شایانِ شان تھے عطا کیے گئے لیکن پھر بھی حضور ﷺ تمام انبیا علیہم السلام، فرشتے، جن و انس اور تمام اولین و آخرین کو جتنا علم عطا کیا گیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کے علمِ محیط سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی صحیح بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: مَا عِلْمِيْ وَ عِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللّٰهِ اِلَّا مِثْلَ مَا نَقَصَ هٰذَا الْعُصْفُوْرُ مِنْ هٰذَا الْبَحْرِ ”اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی سی ہے جو اس چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے“۔ (صحیح بخاری، کتاب التفسیر باب الکہف)

یہ مثال محض سمجھانے کے لیے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے لا محدود علم کے ساتھ کوئی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم پر اس کی دوسری صفاتِ کمال و سمع و بصر اور ارادہ کو بھی قیاس کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اس کی ذاتی اور لا محدود ہیں مخلوق میں جو بھی کوئی خوبی و صفت نظر آتی ہے وہ محدود اور صرف اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی صفات میں سے کسی صفت کا مظہر ہوتی ہے۔

صفات کے نفاذ میں شرک یا نفع و نقصان کے اختیار میں کسی کو شریک کرنا

شرک فی الذات اور شرک فی الصفات کی جتنی قسمیں بن سکتی ہیں ان تمام کا شرک ہونا اور برا ہونا اس قدر واضح ہے کہ بہت سے مشرکینِ عرب بھی ان کو شرک ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ مَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ

”(اے پیغمبر! ان مشرکین سے) پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین میں سے روزی دیتا ہے؟ یا وہ کون ہے جس کے قبضہ میں سماعت و بینائی (کی قوتیں) ہیں؟ وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے؟ اور کون

ہے جو تمام کائنات کی تدبیر وانتظام کر رہا ہے تو یہ بول اٹھیں گے کہ "اللہ" پس تم ان سے کہہ دو (اگر ایسا ہی ہے) تو کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں؟"۔ (یونس:۳۱)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿۸۹﴾

"(آپ ان سے) پوچھیے کہ اگر تم جانتے ہو (تو یہ بتلاؤ) زمین اور جو کچھ اس میں ہیں سب کس کے لیے؟ وہ بول اٹھیں گے "اللہ کے لیے ہیں" آپ کہہ دیجیے پھر تم غور کیوں نہیں کرتے؟ (پھر) ان سے پوچھو کہ ساتوں آسمان اور عرش عظیم کا پروردگار کون ہے؟ وہ جواب دیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہیں آپ کہہ دیجیے پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟ آپ ان سے پوچھیے کہ وہ کون ہے جس کے قبضۂ قدرت میں ہر چیز کی بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا؟ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ یہ تو اللہ ہی کے لیے ہیں کہو پھر کہاں سے تم مسحور کیے جاتے ہو (یعنی کہاں سے تم کو دھوکہ لگتا ہے)۔" (المؤمنون:۸۴---۸۹)

مذکورہ بالا قرآن مجید کی آیتوں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ مشرکین عرب صرف اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کو نہیں مانتے تھے، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق ومالک اور چلانے والا بھی مانتے تھے اور وہ یہ بھی عقیدہ رکھتے تھے کہ کائنات کے ایک ایک ذرے پر اللہ تعالیٰ کو حکومت اور اختیار حاصل ہے۔ بلکہ قرآن مجید شاہد ہے کہ وہ سخت مشکل وقت میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کو پکارتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَنْ تَدْعُوْنَ اِلَّآ اِيَّاهُ

"جب سمندر میں تم پر آفت آتی ہے تو اللہ کے سوا ان (سب معبودوں) کو تم بھول جاتے ہو جن کو تم (دوسرے موقعوں پر) پکارتے ہو"۔ (اسراء:۶۷)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاِذَا غَشِيَهُمْ مَّوْجٌ كَالظُّلَلِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ

"جب سمندر کی موجیں بادلوں کی طرح ان کے سر پر آتی ہیں تو (اس وقت) وہ اپنے اعتقاد کو اللہ تعالیٰ کے

لیے خالص کر کے صرف اسی کو مدد کے لیے پکارتے ہیں"۔(لقمان:۳۲)

بہر حال مشرکینِ عرب اگرچہ بتوں کی پرستش کرتے تھے مگر یہ بات بالکل واضح اور یقینی ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرح خالق ومالک، کائنات کے مدبر و منتظم نہیں مانتے تھے، بلکہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق و مملوک مانتے تھے اور ان کی یہی بات تاریخ سے بھی ثابت ہے۔

چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے والد سے پوچھا اے حصین رضی اللہ عنہ تم کتنے معبودوں کی پرستش کرتے ہو؟ میرے والد نے جواب دیا: سِتًّا فِي الْأَرْضِ وَوَاحِدًا فِي السَّمَاءِ "(سات کی) چھ زمین پر اور ایک آسمان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا فَأَيُّهُمْ تَعُدُّ لِرَغْبَتِكَ وَرَهْبَتِكَ "رغبت اور خوف کے لیے تم نے کس کو چن رکھا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا اَلَّذِيْ فِي السَّمَاءِ "وہ جو آسمان میں ہے"۔(ترمذی)

نیز حدیث کی کتابوں میں مشرکینِ عرب کا تلبیہ منقول ہے جو وہ حج و عمرہ کے دوران پڑھا کرتے تھے وہ یہ ہے:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ إِلَّا شَرِيْكًا هُوَ لَكَ تَمْلِكُهُ وَمَا مَلَكَ

"اے اللہ! میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوں آپ کا کوئی شریک نہیں مگر وہ جو آپ کی ملکیت میں ہیں آپ ہی ان کے مالک ہیں وہ خود کسی چیز کے مالک نہیں"۔

آخر مشرکینِ عرب جب اللہ تعالیٰ کو مانتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ خلق، تدبیر و قدرت وغیرہ میں مستقل طور پر کسی اور کو شریک نہیں کرتے تھے اور نہ وہ اپنے بتوں اور دیوتاؤں کو خدا یا خدا کا مثل سمجھتے تھے تو وہ پھر اپنے دیوتاؤں اور بتوں کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے تھے؟ ان کا عقیدہ تو ان کے تلبیہ سے بھی واضح ہے کہ ان کا زیادہ تر شرک یہی تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے نفاذ و اجرا اور حقوقِ الٰہی میں دوسروں کو شریک کر لیتے تھے یا یوں کہیے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے سوا دوسری ہستیوں کو بھی نفع و نقصان پہنچانے کا کچھ اختیار دے کر ان کو مالک بنا دیا ہے۔ اور قرآن مجید میں بھی جگہ جگہ ان کے اس عقیدہ اور عمل کو بیان کیا گیا ہے، چنانچہ مشرکین کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ

"اور (یہ مشرک لوگ) اللہ تعالیٰ کے سوا ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو انہیں نہ نقصان پہنچا سکتی ہیں اور نہ

نفع اور وہ کہتے ہیں (ہم اس لیے ان کی پرستش کرتے ہیں) کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں"۔
(یونس:۱۸)

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

"اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے اولیا(معبود و شرکا) بنا رکھے ہیں (تو وہ اپنے اس فعل کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ تک پہنچا دیں"۔(زمر:۳)

اسی طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ مشرکین عرب کا یہ عقیدہ ذکر کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دیوتاؤں اور بتوں کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کیا تھا کہ جس طرح دنیا کے بادشاہ اپنے ماتحت حکام اور افسران کو کچھ انتظامی امور کے اختیارات دے دیتے ہیں اس کے بعد بادشاہ سے نہ پوچھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ بادشاہ کو خبر ہوتی ہے اسی لیے لوگ ماتحت حکام کو خوش کرتے ہیں تاکہ وہ ماتحت اپنے وہ اختیارات ان کے بارے میں نافذ اور جاری کر دیں جو ان کو بادشاہ کی طرف سے مل چکے ہیں، نیز ان کا یہ بھی خیال تھا کہ جس طرح بادشاہ پر اپنے مقرّبین زور ڈال کر اس سے کوئی بات منوا سکتے ہیں، اسی طرح یہ فرشتے وغیرہ بھی ہماری مرادیں اللہ تعالیٰ تک پہنچا کر اللہ تعالیٰ سے ہمارے کام کرا سکتے ہیں اسی بنیاد پر وہ اپنے نامزد بتوں، دیوتاؤں اور لیڈروں کو اللہ تعالیٰ کی محبت و خوف، اس کی عبادت اور قانون میں برابر شریک کرتے تھے جیسا کہ قیامت کے روز مشرکین اپنی اسی غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کریں گے:

تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۷﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۸﴾

"اللہ کی قسم بے شک ہم صریح گمراہی میں گرفتار تھے جب ہم نے تم کو رب العالمین کے برابر قرار دیا تھا"۔
(شعراء:۹۷-۹۸)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کفار کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ۥ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ

"تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور تاریکیاں اور روشنی بنائیں پھر وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اپنے رب کے ساتھ دوسروں کو (یعنی دوسروں کے قانون اور حکم کو) برابر ٹھہرا رہے ہیں"۔
(الانعام:۱)

یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ مشرکین عرب تخلیق کائنات اور اس کی تدبیر میں اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں سمجھتے تھے اور اس آخری آیت میں بھی مشرکین و کفار کو تنبیہ فرمائی کہ یہ ایک مسلّمہ حقیقت

ہے اور تمہیں بھی تسلیم ہے کہ ہر طرح کی ستائش اللہ رب العالمین کے لیے ہے اور وہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور اسی نے سورج وچاند کو وجود بخشا ہے، روشنی اور تاریکیاں بنائیں پھر بھی تم کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ اور اس کے حکم اور قانون میں دوسروں کو برابر کرتے ہو۔ تو ظاہر ہے کہ یہاں برابری سے مراد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور اپنے لیڈروں کو محبت و عظمت اور عبادت واطاعت میں اللہ تعالیٰ کے برابر درجہ دیے ہوئے تھے، قرآن مجید مشرکین کی نذر و نیاز اور چڑھاؤں کا جو عمل بیان فرمارہا ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ برابری اور جرم تھا جس کا وہ ارتکاب کر رہے تھے:

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا۔

"اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشیوں میں سے پیدا کیا ان (مشرک) لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کے لیے مقرر کیا ہے (اور کچھ حصہ بتوں اور دیوتاؤں کے لیے مقرر کیا ہے) اور اپنے زعم باطل کے مطابق یہ کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور یہ ہمارے (ٹھہرائے ہوئے) شریکوں کے لیے"۔(الانعام:۱۳۶)

بہر حال مشرکین عرب کا حال یہ تھا کہ وہ محبت و عظمت اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو بھی برابر شریک کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اگرچہ اپنے معبودوں کو اللہ تعالیٰ کی طرح خالق مالک، رازق یا کسی صفت میں بھی اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ شرکاو معبود اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہیں جیسا کہ پچھلے صفحات میں یہ بات خوب معلوم ہو چکی ہے تاہم مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ ہمارے معبودوں اور شرکا کا اللہ تعالیٰ سے ایسا خالص تعلق ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں اور وہ چاہیں تو بناؤ بگاڑ کر سکتے ہیں، اس بنا پر وہ ان باطل معبودوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت و عظمت اور عبادت میں برابر کرتے تھے اور ان کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، ان کے گرد طواف کرتے تھے، ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ اس باطل عقیدے و عمل کی پرزور تردید کی اور مشرکین کو بار بار مختلف انداز سے متنبہ فرمایا کہ جب آپ کو بھی یہ بات تسلیم ہے کہ کائنات کا خالق اور نظامِ کائنات کا چلانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ بھی تسلیم ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ پر اس کی حکومت ہے اور اسی کا علم کائنات کے ذرے ذرے پر محیط ہے ہر چیز کے متعلق ماضی حال اور مستقبل کا علم اسی کو ہے تو پھر اس اللہ تعالیٰ کو وہ کون سی ضرورت پڑ گئی جس کی بنیاد پر اس نے تمہارے معبودوں کو اختیارات دے کر ان کو اپنا شریک بنایا اور پھر آپ کے پاس کون سی دلیل ایسی

ہے جس کی بنیاد پر تم اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو کارساز اور لائق عبادت سمجھتے ہو؟ آخر یہ عقل کی مار نہیں تو اور کیا ہے کہ پھر بھی تم شرک کے عقائد اور اعمال میں مبتلا ہو۔

اس کا کچھ بیان پہلے گذر چکا ہے۔ مسئلہ کی وضاحت کے لیے چند اور آیاتِ کریمہ کو بھی پیش کر دیتا ہوں:

۱.... قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

"ان سے کہو کیا تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہارے نقصان کا اختیار رکھتا ہے اور نہ نفع کا اور اللہ تعالیٰ تو (سب کچھ) سننے والا اور جاننے والا ہے"۔ (مائدہ:۷٦)

۲.... قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝

"(ان مشرکین سے) کہہ دو کہ تم اپنے خیال میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن (ہستیوں) کو (مشکل کشا، مختار اور قابل عبادت) سمجھتے ہو ان کو (اپنی تکلیف اور حاجتوں میں ذرا) پکارو تو سہی (وہ تمہاری حاجتیں کیا پوری کریں گے؟) وہ تو نہ تم سے تکلیف دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ اس کے بدل ڈالنے کا"۔ (اسراء:۵٦)

۳.... قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝

"آپ (ان سے) کہہ دیں کہ جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا (اپنے کارساز اور معبود) سمجھتے ہو ان کو پکارو وہ نہ تو آسمانوں میں ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ ہی زمین میں اور نہ ہی آسمان و زمین میں ان کی کوئی شرکت ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کا مددگار ہے"۔ (سبا:۲۲)

۴.... وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ۝

"انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کر سکتے، بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور (دوسروں کا کیا ذکر وہ تو) خود اپنے نفع نقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتے اور نہ وہ مرنے اور جینے کے مالک ہیں اور نہ کسی کو دوبارہ زندہ کرنے کے"۔ (فرقان:۳)

۵.... اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝

"بے شک جن لوگوں کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو وہ تم کو رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے پس اللہ ہی سے رزق

طلب کرو اور اسی کی عبادت کیا کرو اور اسی کا شکر کرو اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے"۔(عنکبوت:۱۷)

مذکورہ بالا آیتوں اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے اسی شرک کی تردید اور مذمت بیان فرمائی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں اور جس کے حق میں بھی چاہیں وہ ان اختیارات کو استعمال کر سکتے ہیں اسی بنیاد پر وہ ان کو اللہ تعالیٰ کے خاص حقوق اور عبادت میں شریک کیا کرتے تھے، قرآن مجید میں جگہ جگہ ان باطل خیالات کی تردید کی مثالیں بھی بیان فرمائی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں:

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِيْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَهُمْ كَخِيْفَتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۲۸﴾

"اللہ تعالیٰ تمہارے اپنے حالات میں سے ایک مثال بیان فرماتا ہے کیا تمہارے غلاموں میں سے بعض غلام اسی مال و متاع میں جو ہم نے تم کو دیا ہے شریک ہیں کہ تم (اور وہ) اس میں برابر ہو اور تم ان سے اس طرح ڈرتے ہو جس طرح آپس میں اپنے (آزاد اور خود مختار شریکوں) سے ڈرتے ہو، ہم اسی طرح صاف صاف دلائل عقل سے کام لینے والوں کے لیے بیان کرتے ہیں"۔(روم:۲۸)

اللہ تعالیٰ یہاں ایک عام فہم اور دلنشین مثال بیان فرماتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے زر خرید غلام آپ کے مال و متاع میں شریک نہیں قرار پاتے اور نہ ان کو مال و متاع کا حسبِ منشا استعمال کرنے کا اختیار ہوتا ہے، آپ ہی اپنے کو مال کے جملہ حقوق اور اختیارات کا حقدار سمجھتے ہیں اور جس طرح چاہیں اس میں تصرف کرتے ہیں اور آپ کو اپنے غلام کی طرف سے کسی طرح کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا جس طرح کسی کو اپنے مشترک اموال و جائیداد میں اپنے بھائی بند حصہ داروں کی طرف سے ہوتا ہے حالانکہ آپ کے غلام بھی آپ کی طرح ہی انسان ہیں، دونوں اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور اس کی دی ہوئی روزی کھاتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دے دی ہے اور ان کو نہیں دی پھر بھی اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال و جائیداد میں تمہارا غلام تمہارے ساتھ شریک نہیں قرار پا سکتا تو پھر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی پیدا کی ہوئی کائنات میں اس کی پیدا کردہ مخلوق کیسے حقوق و اختیارات میں شریک بن سکتی ہے؟

کیا مشرکین کا باطل عقیدہ و عمل کا تعلق صرف پتھر کے بتوں سے تھا؟

یہاں یہ بات یاد رکھ لینی چاہیے کہ اگرچہ مشرکین میں سے بعض سخت احمق ایسے بھی تھے جو پتھر وغیرہ کے

بنائے ہوئے بتوں کو اپنا کارساز سمجھ کر ان کی عبادت کرتے تھے مگر عام مشرکین کے اس باطل عقیدہ وعمل کا تعلق پتھر پیتل وغیرہ کے بنے ہوئے بتوں اور مورتیوں سے نہ تھا، بلکہ وہ فرشتوں، پریوں، جنات اور گذرے ہوئے صالح بزرگ انسانوں کو اپنے لیے مشکل کشا اور کارساز سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق کی بنیاد پر ان کو بعض اختیارات حاصل ہو چکے ہیں اور وہ ان اختیارات کے استعمال میں خود مختار ہیں اس لیے ان کی اصل محبت انہی ہستیوں سے تھی جن کو وہ مشکل کشا، حاجت روا اور کارساز سمجھتے تھے اور وہ حقیقت میں ان ہی شخصیتوں کی پرستش کرتے تھے، یہ بت تو صرف ان ہی ہستیوں کی طرف منسوب اور ان کے نام پر بنائی ہوئی تصویریں، مجسمے اور مورتیاں تھیں جو بطورِ نشان و یادگار گاڑھ دی جاتی تھیں تاکہ ان ہستیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کو قبلہ بنا کر یکسوئی سے ان کی پرستش کی جائے اور ان پر چڑھاوے چڑھائے جائیں۔ ① چنانچہ قرآن مجید میں قوم نوح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے کہ:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ آلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَلَا سُوَاعًا وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾

”اور انہوں نے کہا اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو اور (خاص طور پر) ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو (تو) ہرگز نہ چھوڑو“۔ (نوح:۲۳)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ ”یہ ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر سب قوم نوح علیہ السلام کے نیک اور صالح لوگ تھے۔ جب یہ لوگ وفات پا گئے تو شیطان نے اس قوم کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ ان بزرگ ہستیوں کی نشست گاہوں پر یادگار پتھر (یعنی ان کی تصویریں و مجسمے بنا کر) نصب کر دینے چاہئیں اور ان پتھروں (یعنی مجسموں اور مورتیوں) کو ان بزرگ ہستیوں کے نام سے موسوم کر دیں (تاکہ ان کی تصویریں اور مجسمے دیکھ کر ان کی یاد تازہ ہو اور عبادت میں شوق و ذوق بڑھے اور ان کی نصیحتیں یاد آ کر عمل کی توفیق ہو جائے وغیرہ) تو اس قوم نے شیطان کی یہ تجویز مان کر ایسا ہی کیا، چنانچہ ابتداءً تو ان پتھروں (مورتیوں) کی عبادت نہیں کی گئی، (بلکہ ان کی تصاویر صرف بطورِ یادگار تھیں) مگر آنے والی نسلوں نے (رفتہ رفتہ) اصل مقصود کو بھلا دیا اور (بالآخر کئی نسلوں کے بعد جب اس قوم کے پاس دین کی پوری معلومات نہ رہیں تو) انہوں نے پتھروں (بتوں اور مورتیوں) کی عبادت شروع کر دی“۔ (دیکھیے بخاری ج۲ کتاب التفسیر سورت نوح)

اور عرب میں سب سے پہلے بت پرستی کا آغاز کرنے والا شخص عمرو بن لحیّ تھا۔ یہ دوسری مشرک قوم سے

---

① مزید تفصیل کے لیے کتاب ”عقیدہ اور عقیدت“ ملاحظہ فرمائیں۔

متاثر ہوا اور کعبہ شریف کے متولی ہونے کی حیثیت سے اس کی بات کو مانا گیا اس لیے اس نے بت پرستی کو خوب رواج دیا۔

بیت اللہ جس کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ وحدہ لاشریک لہٗ کے حکم سے بنایا تھا۔ تاکہ اس میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے۔ وہ پاک گھر اس بدبخت کے زمانے میں بت خانہ بن گیا اور اس پاک گھر میں بالآخر وہ پانچ مشہور بت ود، سواع وغیرہ بھی آگئے اور لات، منات اور عزیٰ (جن کے نام بھی قرآن مجید میں موجود ہیں) بھی آگئے اور ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بت اس میں رکھ دیے گئے گویا بتوں کا مرکز یہی پاک گھر بن گیا۔

شاید آس پاس کی ان قوموں کے تمام مشہور بتوں کے جمع کرنے میں یہ راز بھی تھا کہ خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ آنے والے تھے اور ان کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن نبوت قیامت تک تھی اس لیے مشہور بتوں کو جمع کیا گیا تاکہ لوگوں کا ان سے متعلق جو عقیدہ و عمل ہے اس پر ایک ہی وار کیا جائے اور جب مرکز میں بت پرستی ختم ہو جائے گی تو ان سے متعلقہ قوموں میں خود بخود اس کا اثر پھیل جائے گا۔ (واللہ اعلم)

بہر حال یہاں یہ بتانا ہے کہ مشرک قومیں صرف پتھروں کی پرستش نہیں کرتی تھیں اور نہ اب کرتی ہیں، بلکہ ان کے یہ بت مجسمے اور مورتیاں بزرگ ہستیوں، فرشتوں وغیرہ [1] کے نام پر تیار کی جاتی تھیں، پھر بزعم خود ان ہستیوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے نام پر نامزد بتوں اور مجسموں کی پرستش کرتے تھے [2] اور ان سے اپنی مرادیں پوری کرانے کی امید رکھتے تھے۔ اور اس باطل عقیدت اور پرستش کا تعلق پتھر کے بتوں سے نہ تھا، بلکہ ان بتوں اور مجسموں کے صاحبوں کے ساتھ تھا۔ بعض حضرات مفسرین نے مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ "اللہ تعالیٰ کے سوا" کے ساتھ بت کی قید کو بڑھایا ہے ان کا مقصد بھی یہی ہے ورنہ قرآن مجید کے واضح اشارات کو دیکھ کر کون مسلمان ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ صرف پتھر کے بتوں کی پکار و عبادت کو ممنوع کریں اور جن کے نام پر یہ بت بنائے گئے ہیں ان یا ان کے علاوہ دوسری روحانی ہستیوں کو کارساز جان کر ان سے مرادیں مانگنے اور ان کی عبادت کو جائز قرار دے کر ان کو العیاذ باللہ، اللہ کے ساتھ ملا کر ان کو اللہ تعالیٰ قرار دیں، لہٰذا من دون اللہ "اللہ کے سوا" میں ہر غیر شامل ہے خواہ جمادات ہوں یا نباتات، انسان ہوں یا فرشتے، لیڈر ہوں یا کوئی عنصر اور کوئی قوت کوئی ملک ہو یا جماعت۔ اس مسئلہ

---

1. دیکھیے صحیح بخاری کتاب التفسیر سورۂ نجم۔
2. تفصیل کے لیے دیکھو سیرت ابن ہشام اور دوسری تواریخ۔

کی مزید وضاحت کے لیے چند احادیث کو بھی پیش کیا جاتا ہے:

۱.... حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک گرجے کا ذکر کیا جو انہوں نے ملک حبشہ میں دیکھا تھا اور اس میں جو تصاویر اور فوٹو تھیں ان کے متعلق بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں میں جب کوئی نیک صالح شخص مر جاتا تو اس کی قبر پر مسجد بنالیا کرتے اور مسجد میں اس مرنے والے کی تصویر بنا دیتے تھے، وہ لوگ جو ایسا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بدترین مخلوق تھے۔
(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۲.... حضرت سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما دونوں سے روایت ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر آخری وقت آگیا (شدتِ تکلیف کی وجہ سے بار بار ایک چادر سے اپنے چہرۂ انور کو ڈھانپ لیتے اور جب گھٹن محسوس فرماتے تو چادر کو چہرۂ مبارک سے ہٹا لیتے اور اسی کیفیت میں فرما رہے تھے:

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مِثْلَ مَا صَنَعُوْا

"اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس لیے فرما رہے تھے (تا کہ امتِ مسلمہ کو متنبہ کریں اور اس تکلیف کی حالت میں بھی) یہود و نصاریٰ کے اس طرزِ عمل سے بچائیں اور ڈرائیں"۔ (بخاری و مسلم)

یہ حدیث کم و بیش الفاظ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی منقول ہے۔ (دیکھیے صحیح مسلم ۱/۲۰۱ اور مجمع الزوائد ۲/۲۷)

۳.... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

قَاتَلَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ

"اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کردے انہوں نے انبیا علیہم السلام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا"۔ (بخاری و مسلم)

۴.... حضرت جندب بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے جو انہوں نے صرف پانچ روز قبل آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی اس کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ارشاد فرمایا:

اَلَا وَاِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ وَصَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ اَلَا فَلَا تَتَّخِذُوا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ اِنِّيْ اَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ

"یادرکھو!تم سے پہلے لوگ (یعنی یہود و نصاریٰ) اپنے پیغمبروں اور نیک لوگوں کی قبروں کو مسجد (یعنی سجدہ گاہ) بناتے تھے۔ خبردار!تم قبروں کو مسجد نہ بنانا کیونکہ میں تمہیں اس سے منع کرتا ہوں"۔(مسلم)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ:

فَلَوْ لَا ذَاكَ أُبْرِزَ قَبْرُهُ غَيْرَ أَنَّهُ خُشِيَ أَنْ يُتَّخَذَ مَسْجِدًا

"اگر (مبالغہ آمیزی کا) یہ خطرہ نہ ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھول دی جاتی لیکن خطرہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو (بھی) سجدہ گاہ بنالیا جائے گا"۔(بخاری و مسلم)

مذکورہ بالا حدیثوں سے ایک طرف یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا سے رخصتی کا وقت جب قریب آگیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خطرے کو محسوس کیا کہ مبادا میری امت یہود و نصاریٰ کی طرح میری قبر اور دوسرے صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنالیں، اس جرمِ عظیم کی ممانعت کا اظہار یہود و نصاریٰ پر لعنت کرتے ہوئے فرمایا، دوسری طرف حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قول سے یہ راز بھی کھل گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مقدّس پر شروع سے عمارت کیوں آرہی ہے پہلے پہل صرف عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ تھا اور عہد صحابہ میں یہی تعمیر تھی، جوں جوں خطرہ بڑھتا گیا، حفاظتی تدابیر بڑھتی گئیں حتی کہ جب مسجد مبارک کی توسیع کی گئی تو یہ احتیاط مزید کی گئی کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے اردگرد اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ازواجِ مطہّرات کے حجروں کے اردگرد ایک چار دیواری بنادی گئی تاکہ قبر اطہر، بلکہ جس حجرہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر موجود ہے براہِ راست اس حجرے کی طرف بھی سجدہ کی کوئی صورت ہی نہ رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر اطہر صرف ایک چار دیواری کے اندر نہیں، بلکہ حجرۂ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حجرے کے اردگرد سلطان نور الدین زنگی کی تعمیر، پھر اس کے اردگرد بعد کی مضبوط و مستحکم متعدد تعمیر بنادی گئی ہیں یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کو کئی حجابوں اور پردوں کے اندر مستور فرمایا اور اس کو ایسا محفوظ فرمایا اور اس کے لیے ایسا انتظام فرمایا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو سجدہ تو کوئی کیا کرے گا کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر دیکھنا ہی نصیب نہیں ہوتی جو خوش نصیب دیکھے گا صرف روضۂ اطہر اور گنبد خضراء ہی کو دیکھے گا۔

حضرت عطاء بن یسار رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُعْبَدُ اِشْتَدَّ غَضَبُ اللهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِهِمْ مَسَاجِدَ

"اے اللہ! میری قبر کو بت (یعنی سجدہ گاہ) نہ بنانا جس کی عبادت کی جائے، اس قوم پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی

غضب ہو جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا"۔ ①

اگر بت سامنے نہ بھی ہو یا کسی بلند رتبہ روحانی ہستی کا بت اور مجسمہ نہ بھی بنایا گیا ہو اور نہ اس کی قبر موجود ہو، پھر بھی اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر پکارنا یا اس کی عبادت کرنا دونوں اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکِ عظیم کا ارتکاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ ایسے صاف صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی، اس سے متعلق اللہ تعالیٰ کے جو ارشادات نقل کیے گئے وہ بھی کافی ہیں تاہم چند آیاتِ کریمہ اور بھی پڑھ لیجیے:

۱.... یہود و نصاریٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِيَعْبُدُوْۤا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۳۱﴾

"انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اپنے پادریوں اور اپنے راہبوں کو رب بنالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو صرف ایک ہی معبود کی بندگی کا حکم دیا گیا جس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں۔ وہ پاک ہے اس سے جسے وہ اس کا شریک بناتے ہیں"۔ (توبہ:۳۱)

۲.... اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ۗ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾

"جن لوگوں نے کفر اپنالیا ہے کیا وہ پھر بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے چھوڑ کر میرے ہی بندوں کو اپنا رکھوالا بنالیں گے بلا شبہ ہم نے کافروں کی مہمان نوازی کی جگہ جہنم تیار کر رکھی ہے"۔ (الکہف:۱۰۲)

۳.... مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۗ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾

"کسی ایسے بشر (کی شان یہ نہیں کہ) اللہ تعالیٰ اس کو کتاب و حکمت اور نبوت دے پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ

---

① رواہ امام مالک فی المؤطا مرسلا کذا فی المشکوٰۃ ورواہ البزار مرفوعا عن ابی سعید الخدری وفی سندہ عمر بن صهبان وقد اجتمعوا علی ضعفہ کذا فی مجمع الزوائد۔ (۲/۲۸)

تعالیٰ کے سوا میرے بندے بن جاؤ، بلکہ (وہ نبی تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے بن جاؤ(یعنی صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی میں دل و جان سے مشغول ہو۔ آگے پھر اہلِ کتاب سے خطاب ہے کہ تمہیں تو بطریقِ اولیٰ ربانی بننا چاہیے) اس لیے کہ تم دوسروں کو کتاب اللہ کی تعلیم دیتے تھے اور تم خود بھی اسے پڑھتے تھے اور نہ وہ (نبی) تم سے یہ کہے گا کہ فرشتوں یا پیغمبروں کو اپنا رب بنالو کیا(ایک نبی کے لیے ممکن ہے کہ) وہ تمہیں کفر کا حکم دیں جبکہ تم مسلمان ہو چکے ہو"۔(آل عمران:۷۹-۸۰)

۴....اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾

"جن (ہستیوں) کو یہ لوگ (اپنی مرادوں کے لیے) پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے رب کے حضور میں (بندگی اور اعمالِ صالحہ کے ذریعہ) وسیلہ تلاش کرتے ہیں کہ کون اس سے زیادہ قریب ہو جائے نیز وہ اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے خائف ہیں واقعی آپ کے رب کا عذاب ہے ہی ایسی چیز جس سے ڈرا جائے"۔(الاسراء:۵۷)

ان آیاتِ کریمہ سے صاف صاف واضح ہے کہ مشرکین جس شرک میں مبتلا تھے وہ صرف یہ نہ تھا کہ پتھروں اور دوسری دھاتوں اور بے جان چیزوں کو خدائی اختیار دے کر ان کی پرستش کرتے تھے، بلکہ ان کے باطل عقائد و عمل کا حقیقی تعلق روحانی اور ذی رتبہ ہستیوں سے تھا، ان ہی سے کفار و مشرکین، یہود و نصاریٰ نے اپنی امیدیں وابستہ کر دی تھیں، ان کی عبادت کرتے تھے، ان کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر انہی سے مانگتے تھے اور ان کو قانون سازی کا اختیار بھی دے رکھا تھا۔ آج بھی اگر ہندوؤں اور دیگر بت پرست قوموں کے سمجھداروں سے ان کے بتوں کے بارے میں پوچھا جائے کہ مثلاً تم بدھ مت کے بت، کرشن جی، رام چندر جی اور سیتا وغیرہ کے مجسموں اور بتوں کو کیوں پوجتے ہو تو وہ صاف صاف یہی جواب دیں گے کہ یہ فلاں فلاں روحانی اور ذی رتبہ ہستیوں کی شکل و صورت پر بنی ہوئی مورتیاں اور مجسمے ہیں، اس لیے ہمارے عقیدے اور عمل کا تعلق ان پیتل، چاندی اور پتھر وغیرہ کے بے جان مجسموں سے نہیں، بلکہ کرشن جی، رام چندر جی، بدھ مت اور سیتا وغیرہ کی شخصیتوں سے ہے جو آج ہماری نظروں سے غائب ہیں، اب ان ہستیوں کی عظمت اور شہرت کی یادگار ہی ہیں جو ہمارے لیے قبلہ دھیان اور ان کی پرستش کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

لہٰذا سابقہ اور آج بھی مشرک قوموں کے باطل عقیدہ اور عمل کا تعلق ایسی ہستیوں سے تھا اور ہے جو واقعی طور پر اللہ تعالیٰ کے بہت ہی مقرّب بندے انبیا علیہم السلام و اولیائے کرام تھے اور ہیں۔ ان ہستیوں کو وہ مشکل کشا،

حاجت روا، قسمتوں کو درست کرنے اور بگاڑنے والے خیال کر کے ان سے اپنی حاجتیں مانگتے تھے اور ہیں بزعمِ خود ان کو خوش کرنے کے لیے وہ ان کی پرستش کرتے تھے اور آج بھی اسی نظریے کے مطابق ان کی عبادت کی جاتی ہے۔

لیکن قرآن مجید نے ایسے لوگوں کے اس باطل عقیدے اور عمل کی پرزور تردید کی اور صاف صاف اور بار بار یہ بات دہرائی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نفع و نقصان کی قدرت و طاقت کسی اور میں نہیں، اس کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے، یہ طاقت و قدرت نہ کسی دوسری ہستی میں ایسی مستقل ہے کہ وہ اس کی ذاتی ہو اور نہ کسی کے پاس ایسا عطائی اختیار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اس کو حوالہ کر دیا ہو کہ پھر وہ اپنی مرضی سے اپنے اختیار کو بلا روک ٹوک استعمال کرتا رہے حتیٰ کہ انسان جو تمام مخلوق میں زیادہ صلاحیتوں والا نظر آرہا ہے پھر تمام انسانوں میں سے انبیا علیہم السلام جو انسانیت کے جواہر، خلاصہ اور اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے نمونے اور تمام دنیا میں بزرگ تر ہستیاں ہیں اور پھر تمام انبیا علیہم السلام کا خلاصہ اور سب سے بزرگ تر ہستی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیں:

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ

”آپ کہہ دیجیے میں تو اپنی جان کے لیے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا، مگر وہی کچھ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے“۔(الاعراف:۱۸۸)

قرآن و حدیث کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے دنیا والوں کو بتلا دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ پوری کائنات اور تمام تر مخلوقاتِ الٰہی میں بہتر اور بزرگ تر ہستی ہیں، ذرا سوچو تو سہی! جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے خدائی اختیارات کی نفی کی گئی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کو سجدہ گاہ بنانے کی اجازت نہیں تو پھر اس کے بعد مخلوق میں سے کونسی دوسری ہستی ایسی ہو سکتی ہے جس کو حاجت روا سمجھ کر پکارا جا سکے یا اس کی قبر کو سجدہ گاہ بنایا جائے اور یہی تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں کوئی شریک ہے، نہ صفات میں، نہ اس کی کسی صفت کے اجراء و نفاذ میں اور نہ اس کی بندگی میں۔

آخر مسلمان بھی تو فرشتوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف کاموں پر مقرر فرمایا ہے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے بہت سے انتظامات جیسے بارش برسانے، مارنے، جلانے وغیرہ پر فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے پھر یہ کیوں شرک نہیں؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اللہ رب العزت کے سوا کسی بھی دوسری ہستی کے لیے کسی بات میں ذرہ برابر مستقل اختیارات ثابت نہیں کرتے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے بغیر کوئی مخلوق بھی کچھ نہیں کر سکتی حتی کہ پتا بھی اگر کہیں گرتا ہے تو اس کے حکم سے اور اس کے علم کے مطابق گرتا ہے اور کائنات میں ملائکہ وغیرہ کی جو حیثیت ہے وہ صرف غلامانہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی ملک و قوم کے متعلق جتنی مقدار بارش کا حکم فرماتے ہیں تو بارش پر مامور فرشتہ اس حکم کو بجالاتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ حکم دیں کہ فلاں شخص کی موت فلاں جگہ اور فلاں وقت واقع ہو تو موت کا فرشتہ اس کا انتظام کرتا ہے، اسی طرح کائنات کے ذرہ ذرہ اور جملہ امور میں اللہ تعالیٰ کا حکم نافذ ہوتا ہے اس لیے بارش کے احتیاج کے وقت یا موت سے بچنے یا دوسری مصیبتوں میں صرف اللہ تعالیٰ سے دعا کی جاتی ہے، اسی کو پکارا جاتا ہے نہ کہ بارش یا موت وغیرہ پر مامور فرشتوں کو۔ غرض کوئی مسلمان سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں پکارتا اور نہ کسی غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے، کیونکہ مسلمانوں کو قرآن مجید اور سیدنا رسول کریم ﷺ کی تعلیم سے یہ بات خوب معلوم ہو گئی ہے کہ فرشتوں وغیرہ کو جن کاموں پر لگایا گیا ہے وہ ان میں خود مختار نہیں، بلکہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کے منتظر رہتے ہیں اور وہ صرف حکمِ الٰہی کی تعمیل کرتے ہیں: وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ "اور فرشتے وہی کچھ کرتے ہیں جس کا حکم ملتا ہے"۔ (التحریم:۶)

غرض یہ کہ مشرکین اور مسلمانوں کے عقیدہ میں فرق یہ ہے کہ مشرکین بھی اپنے اپنے معبودوں کے اختیارات اللہ تعالیٰ کا عطیہ مانتے ہیں مگر ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ کچھ انتظامات ان کے سپرد ہونے کے بعد اب وہ ان اختیارات کے استعمال میں خود مختار ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان انتظامات کے نافذ کرنے میں مستقل اختیارات دے دیے ہیں جیسا کہ کوئی بادشاہ اپنے ماتحت حُکّام اور افسران کو کچھ انتظامی امور کے اختیارات دیتا ہے اور پھر ان اختیارات کے استعمال میں خود مختار ہوتے ہیں اور جس جس کے بارے میں بھی وہ چاہے اپنے اختیارات کو نافذ کر دیتے ہیں اس لیے جس طرح لوگ ماتحت افسران کی چاپلوسی کرتے ہیں اور ان کو خوش کرنے کے لیے ان کو چائے پانی اور رشوت دیا کرتے ہیں اور انہی سے درخواست کرتے ہیں تاکہ ان کے حق میں وہ اپنے اختیارات نافذ کر دیں اسی طرح مشرکین کا حال ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے جن ہستیوں کے متعلق سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ اختیارات دے دیے ہیں اور وہ ان اختیارات کے اجرا و نفاذ میں خود مختار ہیں جس کے لیے بھی

چاہیں اپنے اختیارات استعمال کرسکتے ہیں تو وہ بھی ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے ہیں اور انہی سے اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور مسلمان جو کہتے ہیں کہ انتظامات پر فرشتے مقرر ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جو چاہیں اور جس کے لیے چاہیں کچھ کرسکتے ہیں، بلکہ سارے اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کے دست قدرت میں ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے کسی بات میں ذرہ برابر بھی نفع و نقصان کا اختیار نہ ہے نہ ہو سکتا ہے۔

مذکورہ بالا پوری بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ اگرچہ یہ مانا جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی سب سے بڑا ہے اور وہی قادر مطلق و متصرف مطلق ہے اور تمام صفاتِ کمالیہ میں یگانہ ہے لیکن اس کے باوجود کسی مخلوق جیسے ملائکہ یا ارواح یا کسی انسان یا جن وغیرہ کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مستقل طور پر کچھ انتظامی امور سپرد کیے ہیں جیسے بارش برسانا، مافوق الفطرۃ اور اسباب سے بالاتر طریقے سے نفع و ضرر پہنچانا یا دعائیں قبول کرنا وغیرہ، غرض کسی بھی مخلوق کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے اجرا و نفاذ میں اس طرح خود مختار ہے کہ وہ اس کے نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کی خاص مشیت کا محتاج نہیں جیسا کہ بادشاہ کے ماتحت حکام اپنے اپنے دائروں میں خود مختار ہوتے ہیں اگرچہ وہ یہ بھی مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت ہے کہ اس کو تفویض و اختیارات سے معزول کر دے جیسا کہ بادشاہ کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماتحت کو معزول کر دیتا ہے پھر بھی یہ شرکِ عظیم ہے۔ خلاصہ یہ کہ نفع و نقصان کا مالک صرف ایک اللہ رب العالمین ہے اور نفع صرف اس کے قانون اور حکم کے مطابق ملتا ہے اور اس کی خلاف ورزی میں سراسر نقصان و ہلاکت ہے، یہی مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ مسلمان قوم الحمدللہ ان تمام تر باطل اور خرافاتی عقیدوں سے پاک ہے، وہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک کرتے ہیں اور نہ صفات میں اور نہ اللہ تعالیٰ کے اختیارات اور بندگی و عبادت میں۔ وہ اپنی تمام نمازوں میں اپنے اس عقیدہ اور عمل کو بار بار ان الفاظ سے دہراتے رہتے ہیں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کے متعلق اشکالات اور ان کے جوابات

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

”(اے اللہ!) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں“۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ہم قدم قدم پر دنیا کی چیزوں کے محتاج ہیں، سورج اور آگ سے روشنی اور گرمی وغیرہ حاصل کرتے ہیں اور دواؤں سے اپنے امراض کا علاج کرتے ہیں حیوانات سے طرح طرح کے کام لیتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی دوسری مخلوقات میں بہت کچھ کمالات اور ان سے نفع و نقصان کی صورتوں

کا ایسا کھل کر مشاہدہ کرتے ہیں جس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، بلکہ قرآن وحدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی چیزوں اور مخلوقاتِ الٰہی میں طرح طرح کے فوائد اور ان میں بہت کچھ کمالات ہیں اور ان سے نفع و نقصان کی صورتیں بھی وقوع میں آسکتی ہیں اگر یہ سب کچھ مسلّم ہیں تو پھر اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ کا مطلب کیا ہے؟

کمال وتاثیر ہونا اور بات ہے اور اس کا مالک ہونا دوسری بات ہے

اس جواب میں پہلے ایک اصولی بات خوب سمجھ لیں وہ یہ کہ کسی میں کوئی تاثیر ہونا یا کوئی کمال ہونا اور بات ہے اور کسی تاثیر اور کمال کا ذاتی یا عطائی مالک ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ ان دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے، جو شخص جس چیز کا مالک ہو خواہ وہ چیز اس کی ذاتی ملکیت ہو یا کسی نے اس کو بلا عوض عطا کی ہو دونوں صورتوں میں اس کو مالک اور اس چیز میں صاحب اختیار سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے محنت ومشقت کر کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کچھ مال کمایا ہے اور دوسرے شخص کو بلا کسی محنت وعوض کے کچھ مال بطورِ ہبہ اور ہدیہ مل چکا ہے۔ اب ان دونوں کو اس کا مالک سمجھا جاتا ہے اور وہ اس میں ہر طرح کا تصرف کر سکتے ہیں مثلاً اس میں سے وہ خود بھی کھا سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی کھلا سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس شخص کے پاس بھی کوئی مال دکھائی دیتا ہے تو وہ اس مال کا مالک بھی ہوگا۔ مثلاً کسی کے ہاتھ میں لاکھوں روپے کی امانت ہے وہ مال اس کے پاس دکھائی دیتا ہے لیکن وہ اس میں کسی تصرف کا مجاز نہیں۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی تو اب دنیا کی چیزوں اور اسباب پر نظر ڈالیے کہ دنیا میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں ارادے اور اختیار کی کوئی قوت نہیں ہے۔ مثلاً سورج آگ پانی وغیرہ یا نباتات، زمینی پیداوار پھل پھول اور جڑی بوٹیاں وغیرہ ان چیزوں میں جب ارادہ واختیار ہی نہیں تو ایسی چیزوں کے متعلق ایک احمق بھی یہی سمجھتا ہے کہ یہ چیزیں اپنی تاثیرات اور خصوصیات کی مالک نہیں، بلکہ ہمارے لیے مسخر کی گئی ہیں۔ باقی رہے حیوانات جن میں ہمیں ارادہ کی قوت نظر آرہی ہے اور وہ اپنے ارادے سے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہیں، تو ان میں بھی بہت کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ کسی نفع ونقصان کے مالک نہیں ہیں اور ان کے متعلق بھی ایک عام آدمی سمجھتا ہے کہ یہ ہمارے لیے مسخر ہیں اور یہ سارے کے سارے بالواسطہ غلامانہ خدمات انجام دے رہے ہیں اس لیے پانی اور آگ کی طرح ان چیزوں سے بھی ایک پاگل شخص سوال کرنے کی مزید حماقت نہیں کرتا، بلکہ ان سے سوال کیے بغیر ان سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ آسمان وزمین کی چیزوں کے متعلق اللہ تعالیٰ بھی یہی فرماتے ہیں کہ:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً

"کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارے لیے اللہ نے مسخر کر دیا ہے اور اپنی تمام ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر پوری کر دی ہیں"۔ (لقمان:۲۰)

اس لیے جگہ جگہ قرآن مجید دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہاں صرف ایک جگہ بطورِ مثال پیش کر دیتا ہوں:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۷۳﴾

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مخلوق میں سے ان کے لیے مویشی پیدا کیے ہیں اب یہ ان کے مالک ہیں اور ہم نے انہیں ان کے بس میں کر دیا ہے ان میں سے بعض پر سواری کرتے ہیں اور بعض کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کے لیے ان مویشیوں میں اور بہت سے فوائد اور پینے کی چیزیں ہیں پھر یہ لوگ کیوں (اللہ تعالیٰ کا) شکر نہیں کرتے"۔ (یٰس:۷۱---۷۳)

دنیا کے اسباب اور ان کے تحت کسی سے مدد مانگنے میں اسلامی تعلیمات

اس سوال کو حل کرنے کے لیے ایک حقیقت کو سامنے لاتا ہوں وہ یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین قوتوں اور صلاحیتوں سے نوازا ہے اور اس کو سننے، دیکھنے، سونگھنے، جسمانی اور روحانی قوتوں کی طرح ارادہ اور اختیار کی قوت سے بھی نوازا ہے اور اس کی ترقی وبقا اور ابدی نعمتوں کے حصول کے لیے کائنات میں اسباب وذرائع کا وسیع انتظام فرمایا ہے تو انسان کو صرف ذرائع واسباب ملتے ہیں اور ان اسباب اور ان کے استعمال پر اس کو ایک گونہ اختیار حاصل ہوتا ہے، لیکن وہ نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوتا ایک انسان دوسرے انسان کو گائے بیل دے سکتا ہے، لیکن ان چیزوں سے نفع ونقصان جو ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہی مل سکتا ہے، اسی طرح ایک انسان دوسرے انسان کو تھپڑ مارے تو ظاہر میں مارا جانے والا شخص دکھ تو اٹھائے گا، لیکن اس کے بعد نفع ونقصان کس کو ہوتا ہے اور اس عمل کا آخری نتیجہ کیا نکلتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے مثلاً شوگر کا مریض حلوہ کھاتا ہے تو حلوہ سے اس کو عارضی لذت تو حاصل ہو گی لیکن چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس مقررہ قانون کے خلاف ہے جو اس نے اس بیماری سے صحت مند ہونے کے لیے مقرر فرمایا ہے تو ایسی صورت میں حلوہ کھانے والا بعد میں جو نقصان اٹھاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اٹھاتا ہے مثلاً حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھائیوں نے کنویں

میں ڈالا جس سے عارضی طور پر ان کے دل ٹھنڈے ہوئے لیکن حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو نفع ملنا شروع ہوا۔ آخر انہوں نے تو حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے کنویں میں ڈال دیا تھا نہ کہ اس لیے کہ ان کو مصر کا اقتدار ملے۔ یہی حال ڈاکٹروں کا ہے وہ مریض کو دوا دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ ہی کے پیدا کردہ اسباب ہیں، ان دواؤں سے فائدہ و نقصان اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہی حاصل کیا جاتا ہے تو جو کوئی ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اس لیے نہیں جاتا کہ نفع و نقصان کا مالک وہی ہے، بلکہ صرف اس لیے جاتا ہے کہ اسباب ڈاکٹر کے پاس موجود ہیں۔

غرض انسان کو جس چیز پر ایک گونہ اختیار حاصل ہوتا ہے تو وہ نفع و نقصان کا اختیار اور مالک ہونے کی حیثیت سے نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ ان اسباب کے استعمال میں اور ان کے حصول میں اپنے اختیار کو استعمال کرتا ہے اور ان چیزوں اور اسباب سے نفع و نقصان کے حسی اور معنوی نتائج اللہ تعالیٰ کے مقررہ قوانین اور احکامات کے مطابق ہی مرتّب ہوتے ہیں اور دائرہ اسباب کے تحت کسی سے کچھ طلب کرنا جب کہ اس کو نفع و نقصان کا مالک نہ سمجھا جائے یہ استعانت نہیں، بلکہ یہ باہمی تعاون ہے جس کا ہمیں حکم ہے کہ قانونِ الٰہی اور حکمِ الٰہی کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا کریں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

"نیکی اور تقویٰ کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ و ظلم کی بات میں مدد نہ کرو"۔(مائدہ:۲)

لہٰذا دنیا کے اسباب سے فائدہ اٹھانا اور دوسرے لوگوں کی قابلیت اور ان صلاحیتوں سے مدد حاصل کرنا شرک نہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی سے استعانت ہے، کیونکہ اسباب بھی اسی کے بنائے ہوئے ہیں اور ان سے فائدہ اور نقصان بھی اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے مطابق ہی حاصل ہوتا ہے اس لیے اسباب سے فائدہ اٹھانا اور اس سے مدد طلب کرنا مخلوق سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ہی مدد مانگنا ہے کیونکہ اس کے بنائے ہوئے اسباب کو اللہ کے بھروسے پر اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ کے قانون و حکم کے مطابق حاصل کرنا اور استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی مدد کے مظہر یعنی راستے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی مدد اور مہربانی کے بغیر نہ کوئی علاج مؤثر ہو سکتا ہے اور نہ کوئی اور کوشش کامیاب ہو سکتی ہے، اس لیے اسباب کی طرف رجوع کرتے وقت صرف اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرنا چاہیے اور اسی سے مدد مانگنا چاہیے اسی کے بھروسہ پر اسی کا نام لے کر اسباب کو اختیار کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لِيَسْأَلْ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتَّى يَسْأَلَ شِسْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ

"تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار سے مانگے حتیٰ کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو اسے بھی اللہ تعالیٰ سے مانگے"۔(ترمذی)

اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جب جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو دعا کرنے بیٹھ جائیں اور جوتے بنانے کے اسباب کو اختیار نہ کریں، بلکہ اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگ کر اور اس پر بھروسہ کر کے اس کے قانون کے مطابق موچی وغیرہ سے تسمہ بنوائیں۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ تعلیم بھی دی ہے کہ ہر انسان اپنی ہر حاجت خواہ وہ کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے پیش کرے اور اس پر اعتماد کرے۔ بلاشبہ ہر نفع و نقصان کا مالک در حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی چیز اور کوئی شخص حقیقت کے اعتبار سے نہ ادنیٰ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔ ظاہر میں جس چیز اور جس شخص سے جو نفع یا نقصان پہنچتا نظر آتا ہے وہ صرف ایک عارضی و ظاہری صورت اور حقیقت کے سامنے ایک نقاب سے زائد کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بہر حال نفع و نقصان کی باگیں صرف اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں اور اسباب کے حصول اور استعمال کے بعد جو نفع یا نقصان ملتا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ملتا ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے مطابق حاصل کرے گا اور استعمال کرے گا تو نفع پائے گا ورنہ نقصان و خسران اس کا مقدر ہو گا۔ لہٰذا ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اسی پر بھروسہ کر کے اسی کے نام پر ہر کام شروع کرنا چاہیے۔

انسانوں میں کمالات کے متعلق غلط فہمی

باقی رہی یہ بات کہ بعض انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ کمالات اور خصوصیات سے نوازا ہے اور یہ تو قرآن و حدیث سے بھی ثابت ہے کہ بہت سے انسانوں کے ہاتھ سے بھی ایسے کام صادر ہوتے ہیں کہ پوری دنیا ان کے کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے اور بعض لوگوں کی ایسی غیبی امداد ہوتی ہے کہ جس سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ شاید دنیا میں ایسی ہستیاں بھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیبی طاقتوں کا اختیار عطا کر کے ان کو ان طاقتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس میں بہت سوں کے قدم ڈگمگا کر پھسل جاتے ہیں، بعض سادہ لوح لوگ تو اس قدر حماقت کرتے ہیں کہ وہ مقبول ہستیوں کے ہاتھ نفع و نقصان کے صدور اور ان کے کمالات ہی سے انکار کرتے ہیں جو نہ صرف

مشاہدے کے خلاف ہے، بلکہ قرآن وحدیث کی کھلی تعلیمات کا بھی انکار کر کے کفر کے مرتکب ہو رہے ہیں، اور بعض احمق دنیا کے اسباب اور بزرگ ہستیوں کے کمالات میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ ان ہستیوں کو نفع ونقصان پہنچانے میں خود مختار مان کر مادہ پرستوں یا مشرکین کی صفوں میں جا ملتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں فریق اسباب کی حقیقت و حیثیت اور اسی طرح دوسری مخلوق کے کمالات و خصوصیات پر پورا غور نہیں کرتے، حالانکہ مخلوق کا پُر حکمت اور باکمال ہونا اور اسے ماننا عین خالقِ کائنات کی حکمت کو ماننا اور خالص توحید ہے۔ اس کے برعکس مخلوق میں دکھائی دینے والے کمالات اور ان کے ہاتھوں نفع ونقصان کا صدور دیکھ کر ان کو کمالات کا مالک ماننا، ان کو اللہ تعالیٰ کے قائم مقام بنانا اور ان کو نفع ونقصان کا مالک سمجھنا یا ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات کے اجرا ونفاذ میں خود مختار ماننا باطل اور خالص شرک ہے۔

انسان کے کمالات اور اس کے ہاتھوں سے عجیب اور مفید کاموں کا صدور

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت صلاحیتیں دے رکھی ہیں، اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿٤﴾

”بے شک ہم نے انسان کو بہترین انداز پر پیدا فرمایا ہے“۔ (التین:۴)

اللہ تعالیٰ کا کلام سچا ہے۔ انسانی کمالات میں کسی کو شک نہیں۔ ہم انسان کے ہاتھوں طرح طرح کے کمالات تو روزمرہ کی زندگی میں دیکھتے رہتے ہیں، بلکہ بعض اللہ تعالیٰ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ ایسے کام منظرِ عام پر لاتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ انسان تو کسی غیبی طاقت کا مالک بھی ہو گیا، حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق یہاں چند واقعات نقل کرتے ہیں مثلاً حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں یہ بیان موجود ہے:

اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾

”(بے شک میں تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر تمہارے پاس آیا ہوں) میں تمہارے لیے مٹی سے ایک پرندے کی شکل بنا دیتا ہوں پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے (فوراً) پرندہ بن جاتا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو (بھی) اچھا کرتا ہوں اور مردے کو (بھی) زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم

کھاتے ہو اور جو کچھ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو (سب) تمہیں بتاتا ہوں، بے شک ان (معجزوں) میں تمہارے لیے (میری صداقت اور منجاب اللہ ہونے کے لیے کافی) نشانی ہے اگر تم ایمان دار ہو۔(ال عمران:۴۹)

مذکورہ بالا آیت میں حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے چار معجزات بیان کیے گئے ہیں:

۱.... وہ مٹی سے پرندہ کی سی صورت بنا کر اس میں پھونک مار دیتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پرندہ بن جاتا تھا۔

۲.... وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پیدائشی اندھے کو بینا اور جذامی مریض کو ٹھیک کرتے تھے۔

۳.... وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتے تھے۔

۴.... وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ بھی بتلایا کرتے تھے کہ کس نے کیا کھایا ہے اور کیا ذخیرہ گھر میں محفوظ رکھا ہے۔

تنبیہ.... اللہ تعالیٰ کے حکم سے تندرست کرنے وغیرہ کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے متعلق اللہ تعالیٰ ان کو حکم فرماتے تھے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق صحیح و تندرست ہوتا تھا نہ یہ کہ ان کو یہ عام اجازت تھی کہ جس کو چاہے ٹھیک کریں یا زندہ کریں اور یہ حکم تھا نہ کہ اختیار اور حکم بجالانے اور اختیار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۲.... ملکہ سبا کے تخت کے متعلق قرآن مجید میں بیان ہے کہ:

قَالَ يٰۤاَيُّهَا الْمَلَؤُا اَيُّكُمْ يَاْتِيْنِيْ بِعَرْشِهَا قَبْلَ اَنْ يَّاْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ﴿۳۸﴾ قَالَ عِفْرِيْتٌ مِّنَ الْجِنِّ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ تَقُوْمَ مِنْ مَّقَامِكَ ۚ وَاِنِّيْ عَلَيْهِ لَقَوِيٌّ اَمِيْنٌ ﴿۳۹﴾ قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ اَنَا اٰتِيْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّرْتَدَّ اِلَيْكَ طَرْفُكَ ؕ فَلَمَّا رَاٰهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهٗ قَالَ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ ۫ لِيَبْلُوَنِيْۤ ءَاَشْكُرُ اَمْ اَكْفُرُ ؕ

”(سلیمان علیہ السلام نے) کہا اے درباریو! تم میں سے کوئی ایسا ہے کہ میرے پاس اس (ملکۂ سبا) کا تخت لائے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس آئیں تو جنوں میں سے ایک دیو پیکر جن نے عرض کیا کہ اس سے پہلے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں (یعنی اس سے قبل کہ آپ کی مجلس برخاست ہو) میں اس کو آپ کے پاس لا سکتا ہوں بے شک میں اس کو اٹھالانے کی طاقت (بھی) رکھتا ہوں اور امانت دار (بھی) ہوں اور ایک شخص جس کے پاس کتاب کا علم تھا وہ بولا میں آپ کے پاس پلک جھپکنے سے پہلے اسے لا دیتا ہوں پھر جب سلیمان نے اس تخت کو اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ میرے رب کا فضل (وکرم) ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ آیا میں شکر کرتا ہوں یا ناشکری“۔(النمل:۳۸---۳۹)

اس آیتِ کریمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک جن اور دیو اپنی جسمانی طاقت اور تیز رو ہونے کی بنا پر یہ دعویٰ کرتا تھا کہ میں اس تخت کو مجلس کے برخاست ہونے تک چند گھنٹوں کے وقفہ میں لا سکتا ہوں لیکن اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی بندہ ایسا بھی تھا جس نے یمن سے بیت المقدس تک کے ہزاروں میل کے فاصلہ سے ایک ہی آن میں بہت بڑے شاہی تخت کو فوراً حاضر کیا۔

۳.... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے دو شخص حضرت اسید بن حضیر اور عبادہ بن بشر رضی اللہ عنہما آپ کے پاس کسی معاملہ میں گفتگو کر رہے تھے (اور وہ گفتگو طویل ہوگئی) یہاں تک کہ رات کا کچھ حصہ چلا گیا اور رات بھی سخت تاریک تھی۔ جب یہ دونوں حضرات اپنے اپنے گھروں کو واپس ہونے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھ کر باہر نکلے تو اس وقت دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور (اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ) ان میں سے ایک کی لاٹھی (اچانک) روشن ہوگئی اور اسی روشنی میں دونوں چلنے لگے حتیٰ کہ جب دونوں کے راستے جدا ہوگئے (اور ہر ایک اپنے اپنے گھر کے راستہ پر چل دیا) تو دوسرے کی لاٹھی بھی روشن ہوگئی اور وہ دونوں اپنی اپنی لاٹھی کی روشنی میں چل کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئے۔ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

یہاں بطورِ نمونہ اللہ تعالیٰ کے چند برگزیدہ بندوں انبیا علیہم السلام اور صالح لوگوں کے واقعات کو پیش کیا گیا، ورنہ قرآن و حدیث اور تواریخ میں انبیا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے صالح بندوں کے ایسے واقعات موجود ہیں کہ ان کو اگر دیکھا جائے تو بعض کمزور لوگوں کو یہ مغالطہ لگ جاتا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خدائی طاقت و اختیار حاصل ہو چکا ہے جس کی بنا پر وہ مافوق الاسباب نفع و نقصان کے مالک بن گئے، لیکن ایسا ہرگز نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے کسی کو اسباب سے بالاتر نفع و نقصان اور کسی تصرف کا مالک نہیں بنایا ہے

نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کی بابرکت ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسباب سے بالاتر کسی کو بھی کسی تصرُّف کا مالک نہیں بنایا ہے۔ اگر قرآن مجید اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک طرف اس بات کی تعلیم موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم الشان اور پر حکمت مخلوق بنا کر دنیا والوں پر اپنی حکمت و قوت کو آشکارا کرتا ہے تو دوسری طرف یہی قرآن و حدیث اس بات کو پوری وضاحت سے بیان فرماتے ہیں کہ پوری کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جسے اسباب سے بالاتر کسی قسم کے نفع و نقصان کی قدرت اور اس کا اختیار حاصل ہو۔ دیکھیے! فرشتے اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے انسانوں کی مدد کے لیے پہنچتے ہیں، وہ اپنی مرضی اور اختیار سے کچھ بھی نہیں

کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے متعلق فرماتے ہیں:

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ

"اور وہ (فرشتے) وہی کچھ کرتے ہیں جن کا ان کو حکم دیا جاتا ہے"۔ (التحریم:٦)

اور یہی معاملہ برگزیدہ انسانوں کا ہے دیکھیے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عظیم نشانیاں دکھلائیں لیکن اس کے ساتھ باذن اللہ "اللہ تعالیٰ کے حکم سے" کرنے کا اعلان فرماتے اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے ہزاروں میل کی مسافت سے پلک جھپکنے میں تخت کو حاضر کر دیا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جونہی تخت اپنے پاس پایا تو فوراً پکار اٹھے: هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ "یہ میرے رب کا فضل (و کرم) ہے"۔

کیونکہ وہ اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ اس ذی علم شخصیت نے جو کام کیا ہے صرف اس لیے کیا کہ اس کو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا قانون معلوم تھا اس نے اس قانون کو بروئے کار لایا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے شکریہ ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے باصلاحیت لوگ دیے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ہاتھوں بہت فائدے پہنچاتے ہیں اور ان کے ذریعے بہت عظیم الشان کارنامے انجام پاتے ہیں لیکن وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے یعنی ان کو اللہ تعالیٰ حکم فرماتے ہیں مثلاً تم لاٹھی ڈال دو تو باقی کام میں کروں گا یا تو فلاں کو کہہ دے کہ زندہ ہو جاؤ تو میں اس کو زندہ کروں گا وغیرہ۔ حضرت خضر علیہ السلام کے کچھ کاموں کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے لیکن انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صاف ستھرے الفاظ میں بتلا دیا: وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ "اور میں نے (جو کچھ بھی کیا) اپنی مرضی سے نہیں کیا ہے (بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے)"۔ (الکہف:٨٢)

اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں انسانوں کے ہاتھوں بھی لوگوں کو بہت سے فوائد پہنچاتے ہیں اور ان کے ذریعے دنیا کو اپنی قدرت کے عظیم الشان مظاہر بھی دکھلاتے ہیں لیکن وہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ انسان نفع و نقصان کے مالک ہوتے ہیں اور نہ اس میں ان کے اختیار کا کوئی دخل ہوتا ہے۔

مصنوع اور مخلوق میں کمال صانع اور خالق کا ہوتا ہے

مذکورہ بالا بحث سے آپ لوگوں کے افراط و تفریط کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جو لوگ مخلوق اور انسان میں سے کمالات کے ظہور کی نفی کرتے ہیں اور اسی کو اپنی نادانی سے توحید سمجھ کر قانع ہو چکے ہیں وہ تو غیر شعوری طور پر قرآن و حدیث کے انکار میں مبتلا ہو رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کی نفی کر کے انکارِ حق کے مجرم بن رہے

ہیں، کیونکہ اتنی بات تو ہر ایک سمجھتا ہے کہ ہر صانع کا کمال اس کے مصنوع میں دیکھا جا سکتا ہے اور مصنوعات میں اگر کوئی کمال ہوتا ہے تو وہ صانع اور کاریگر ہی کا کمال ہوتا ہے، نیز جس قدر مصنوعات کے حسن وخوبی اور کمالات ہوتے ہیں اتنا ہی صانع اور کاریگر کے فن وہنر اور اس کی عزت کا سکہ لوگوں کے دماغ پر چھا جاتا ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ عصرِ حاضر میں مغربی اقوام کے پاس کوئی اخلاق وتہذیب نہیں اور عددی اکثریت بھی ان کے ملکوں میں چین وغیرہ سے زیادہ نہیں، لیکن اس کے باوجود کفار ومشرکین تو کجا، بلکہ مسلمان اور بعض نام نہاد علما بھی امریکہ، روس وغیرہ سے اس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ وہ ان کی مدح سرائی میں کوئی کسر اٹھائے نہیں رکھتے اور وہ ان شیطانوں کو صرف سائنسی اور فنی ہنر کے اعتبار سے اپنا مقتدا نہیں سمجھتے، بلکہ وہ ان لٹیروں کو اخلاقی اور بہت سے دینی امور جیسے خاندانی منصوبہ بندی، تعدُّدِ ازواج وغیرہ میں بھی اپنے امام کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے کہ دنیا والوں نے ان کے بارے میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کی مصنوعات اچھی اور بہترین ہیں اور ان کے طیاروں، راکٹوں اور دیگر سائنسی ایجادات اور مصنوعات کی وجہ سے ان کی ہیبت اور عزت واحترام کا سکہ لوگوں کے ذہنوں پر چھا گیا ہے۔

لہٰذا جس طرح اس بات میں کسی کو تردد نہیں کہ صانع کے کمالات، مصنوعات میں دکھائی دیتے ہیں اور ان مصنوعات کی وجہ سے صانع کی حکمت وقدر پہچانی جاتی ہے، اسی طرح خالقِ کائنات کے کمالات اور حکمتوں کو اس کی مخلوقات میں مشاہدہ کر سکتے ہیں اور انسان کے پاس مشاہدہ کی حد تک صرف یہی ایک ذریعہ ہے جس کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی حکمت، عدل وعلم اور قدرت وغیرہ کا اندازہ لگا سکتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کے ذہن اور دل پر اللہ تعالیٰ کی عظمت وہیبت چھا جاتی ہے۔

اسی مذکورہ بالا حقیقت کو قرآن مجید نے بار بار دہرایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن وحدیث بار بار لوگوں کی توجہ آسمان وزمین کی پر حکمت چیزوں اور ان میں اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ نظام کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ یہاں بطورِ نمونہ قرآن مجید میں سے چند آیتوں کو پیش کرتا ہوں:

۱..... وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ

”اور ہم نے آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے کار تو پیدا نہیں کیا یہ تو ان کا خیال ہے جو (حق کے) منکر ہیں پس کافروں کے لیے آگ کی بربادی ہے“۔ (ص:۲۷)

۲.... مَا تَرٰى فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ

"تو رحمٰن کی تخلیق میں کسی قسم کا خلل نہیں دیکھے گا"۔ (الملک:۳)

۳.... اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

"بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے بدلنے میں اور بحری جہازوں میں جو انسان کے نفع کی چیزوں کو لے کر دریا میں چلتے ہیں اور اس پانی میں جسے اللہ تعالیٰ آسمانوں سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعے مردہ اور خشک زمین کو زندگی بخشتا ہے (اور تر و تازہ کر دیتا ہے) اور (اس بات میں کہ اللہ تعالیٰ نے) اس (زمین) میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے اور ہواؤں کے گردش کرنے میں اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان حکم کے تابع (ہو کر مقررہ حدود میں چلتے پھرتے) ہیں (یہ اور اسی طرح زمین و آسمان کے درمیان تمام چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت اور عظمت و توحید کی کافی شافی) نشانیاں اور دلائل موجود ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ (البقرہ:۱۶۴)

۴.... اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ یَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

"آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں ان عقلمندوں کے لیے (اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کی حکمت اور توحید کی بہت بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے ہوئے (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں (تو اس ذکر و فکر کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حکمت و عظمت اور اس کی معرفت کے چشمے کھل جاتے ہیں اور بے اختیار یہ پکار اٹھتے ہیں کہ) اے ہمارے رب! تو نے یہ (عظیم اور پُر حکمت کائنات) تو بے کار اور بے فائدہ نہیں بنائی ہے تو پاک ہے (اس سے کہ بے کار اور بے فائدہ کام کرے) پس اے ہمارے پروردگار! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا"۔ (آل عمران:۱۹۰-۱۹۱)

اسی طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ مختلف انداز میں اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو کائنات اور اس کے حکیمانہ نظام میں

غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں اور یہ بات یقینی ہے کہ جب انسان اپنی عقل سے کام لیتا ہے تو کائنات میں اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمتوں اور قدرتوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت و عظمت سے معمور ہو جاتا ہے اور تدبُّر و تفکُّر کرکے بالآخر وہ اس بات کا گویا مشاہدہ کر رہا ہوتا ہے کہ کائنات میں جو بھی خوبیاں و کمالات دکھائی دیتے ہیں وہ تمام کے تمام اللہ تعالیٰ کی صفات کی تجلیاں ہیں جو مخلوقات کے پردوں میں ہمیں دھندلی سی دکھائی دیتی ہیں اس لیے وہ جہاں بھی کوئی خوبی و کمال دیکھتا ہے تو پکار اٹھتا ہے کہ الحمد للہ ہر ستائش اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔

لہٰذا مخلوقات میں سے کمالات کے ظہور کی نفی کرنا صرف بے وقوفی ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کو نہ ماننے کے مترادف ہے، نیز بندوں کی عظیم خداداد صلاحیتوں کو بے کار بنانا اور ان کی ترقیوں کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا ہے، انسانوں کے لیے ترقیات کے میدان کھلے پڑے ہیں، ہر کوئی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنی صلاحیت کے مطابق اپنے دائرہ میں عظیم ترقی کر سکتا ہے۔

کسی غیر اللہ کو اسباب سے بالاتر نفع کا مالک ماننا شرک اور بہت بڑا ظلم ہے

اس کے برعکس بعض لوگ ایسے ہیں جو کہیں بھی مخلوق میں کوئی کمال دیکھ لیتے ہیں تو اس کو اس کمال کا مالک بھی مان لیتے ہیں اور اس سے اپنی امیدیں وابستہ کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ بھی عظیم بے وقوفی اور گمراہی میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اگر کھلے اور ریتلے میدان میں شیشوں کے ٹکڑے بکھیر دیے جائیں اور ان پر سورج طلوع ہو جائے تو ریت اور شیشے کا ہر ٹکڑا اپنی استعداد اور صفائی کے بقدر چمکتا ہوگا لیکن ہر عقل والا اس بات کو خوب سمجھتا ہے کہ اس شیشے اور ریت میں جو بھی چمک ہے اس چمک کی وجہ سے نہ تو یہ سورج کے ساتھ روشنی میں اشتراک پیدا کر سکتی ہے اور نہ یہ روشنی اس کی ذاتی اور مستقل ہے، بلکہ یہ سب کچھ عارضی چمک دمک ہے جو سورج کی مرہونِ منت ہے جونہی سورج زائل ہو جائے گا نہ شیشوں سے شعاعیں پھوٹیں گی اور نہ ریت وغیرہ کی چمک دمک رہے گی۔

نیز یہ بات بھی ہر کوئی آسانی سے سمجھتا ہے کہ کوئی صنعت اور کاریگری اپنے صانع اور کاریگر کی صفات میں قطعاً اشتراک پیدا نہیں کر سکتی اور جو کوئی مصنوع کے متعلق کہتا ہے کہ اس نے صانع کی صفات میں اشتراک پیدا کیا ہے تو وہ شخص صرف حقیقت کے خلاف بات نہیں کرتا، بلکہ وہ اس کے ساتھ اس صانع اور کاریگر کی تحقیر و ناقدری اور اس پر بہت بڑا ظلم بھی کرتا ہے۔ جب صانع اور کاریگر کے متعلق یہ ایک مسلَّمہ حقیقت ہے تو آخر ایک مخلوق اپنے خالق کی صفات میں کیسے اشتراک پیدا کر سکتی ہے۔

بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور ہستی کو اللہ جل شانہ کی کسی صفت میں بھی شریک ٹھہراتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھتے ہیں تو وہ صرف ایک ایسی بات کے قائل نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی ناقدری اور بہت بڑا ظلم اور اس سے بغاوت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں افراط و تفریط دونوں سے محفوظ فرمائے۔

دلائلِ نبوت یا معجزات و کرامات کا بیان

بلاشبہ انبیا علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے ذریعے کبھی کبھار ایسے عظیم کام وجود میں آتے ہیں جو عام انسانوں کی قدرت سے باہر ہوتے ہیں جنھیں "دلائلِ نبوت" "معجزات" اور "کرامات" کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وہ کام ہوتے ہیں جو طبعی اسباب سے بالا و برتر ہوا کرتے ہیں جیسا کہ اس کے کچھ نمونے پچھلے صفحات میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کاموں کی وجہ سے اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے والوں کو یہ مغالطہ ہو جاتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان کاموں کی قدرت و اختیار ان ہستیوں کو سپرد نہ کرتا تو ان کے ہاتھوں سے یہ کام کیسے وجود میں آتے جس کی وجہ سے وہ لوگ ان ہستیوں کے متعلق ایک درجہ میں خود مختار ہونے کا عقیدہ بنا لیتے ہیں؟ اس کا جواب تو بقدر ضرورت پہلے گذر چکا ہے لیکن یہ مسئلہ اہم ہے اس لیے مناسب ہے کہ یہاں معجزات و کرامات کی مزید تفصیل کی جائے۔

نشانِ نبوت، دلائلِ نبوت یا معجزہ و کرامت کسے کہتے ہیں اور کیوں؟

دلائلِ نبوت اور معجزات اصطلاح میں ایسے عمل کو کہتے ہیں جو کسی پیغمبر کے ذریعے کسی طبعی سبب کے بغیر عالم وجود میں آئیں جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا یا وہ معجزات جو موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر صادر ہوئے ہیں، اور اگر ایسا کام پیغمبر کے علاوہ کسی ولی اللہ کے ہاتھ سے وجود میں آئے تو اسے کرامت کہتے ہیں [1] جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصہ میں جس شخص کا ذکر گذر چکا ہے جس کے پاس کتاب کا علم تھا اور جس نے ملکۂ سبا کا تخت پلک جھپکنے میں ملک یمن سے فلسطین پہنچا دیا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لاٹھیاں روشن ہو گئیں وغیرہ وغیرہ۔

---

[1] یاد رہے کہ معجزہ اور کرامت میں صرف نام کا فرق نہیں، بلکہ ان دونوں کی نوعیت اور حکم میں بھی بہت بڑا فرق ہوتا ہے جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ مختار

گزشتہ انبیا علیہم السلام کے معجزات وقتی اور محدود تھے اور نبی خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزۂ قرآن دائمی ہے

پچھلے انبیا علیہم السلام کو عموماً وہ معجزے دیے گئے تھے جو عملی اور مشاہَد یعنی نظر آنے والے تھے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دہکتی ہوئی آگ کا ٹھنڈا اور سلامتی والا ہو جانا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضا وغیرہ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو تندرست کر دینا، مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ عملی و حسی معجزات تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اثر وقتی اور عارضی ہوتا ہے اور ان سے صرف وہی لوگ زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو اس معجزہ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جب صاحبِ معجزہ دنیا سے تشریف لے جاتا ہے تو وہ معجزہ لوگوں کے سامنے باقی نہیں رہتا صرف اس کی حکایت باقی رہ جاتی ہے۔

چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت دائمی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں ایک طرف بہت سے عملی اور حسی معجزات دے دیے تھے جن کی وجہ سے عہد مبارک میں مسلمانوں کا ایمان و یقین اور زیادہ پختہ اور غیر متزلزل ہوا اور قدسیوں کی ایک عظیم جماعت تیار ہو گئی تو دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رہتی دنیا تک تمام انسانوں اور جنات کے لیے ایک کلام علمی معجزہ (قرآن مجید) عطا فرمایا جو لاکھوں عملی معجزوں سے بڑھ کر ہے۔ یہ ایک ایسا کلام ہے جس کی نظیر پیش کرنا انسانی قدرت سے باہر ہے اور اب بھی اور قیامت تک کے ہر زمانے والے تمام لوگوں کو چیلنج دیا جا رہا ہے کہ اس معجزہ قرآن کے مقابلہ میں پورا قرآن مجید ہی نہیں، بلکہ صرف ایک چھوٹی سی سورت پیش کر دیں لیکن پھر بھی پوری دنیا کے انسان اور جنات اور اول تا آخر تمام دنیا کی مخلوق مل کر اس کی مثال لانے سے قاصر و عاجز ہے۔ [1]

معجزہ و کرامت اللہ تعالیٰ کی خاص قدرت اور حکم ہوتا ہے

یہ بات معلوم ہو گئی کہ معجزہ و کرامت بغیر کسی طبعی سبب کے اللہ تعالیٰ کے حکم سے عادتِ مستمرہ کے خلاف وجود میں آتے ہیں، چونکہ یہ امور اللہ تعالیٰ کی خاص قدرت اور حکم سے ظہور میں آتے ہیں اس لیے ان امور یعنی معجزات اور کرامات کو براہِ راست اللہ تعالیٰ کا فعل مانا جاتا ہے صرف اس کا ظہور پیغمبر یا ولی اللہ کے ہاتھوں پر ان کی صداقت اور عظمت ثابت کرنے کے لیے کیا جاتا ہے پیغمبر اور ولی اللہ کو اس کو وجود میں لانے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

چنانچہ ایک جگہ پچھلے انبیا علیہم السلام کے ساتھ پیش آنے والے حالات کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

---

[1] پوری تفصیل کے لیے بندہ کی کتاب دہریت سے اسلام تک کے آخری باب کو مطالعہ کیجیے۔ مختار

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ

"اور کسی رسول کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر خود کوئی نشانی (معجزہ) لاسکے پھر جس وقت اللہ تعالیٰ کا حکم (نزولِ عذاب) آچکا تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کو جھٹلانے والے خسارہ میں پڑ گئے"۔(المؤمن:۷۸)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۭ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

"اور وہ (منکرین حق) اللہ تعالیٰ کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ان کے سامنے کوئی نشانی (معجزہ) آجائے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں گے (اے پیغمبر) آپ کہہ دیجیے نشانیاں (یعنی معجزے) تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں اور (اے مسلمانو!) تمہیں (ان منکرین حق کا حال) معلوم نہیں کہ اگر ان کے سامنے نشانیاں آبھی جائیں تو (بھی) یہ ایمان لانے والے نہیں"۔(الانعام:۱۰۹)

نیز کفار و مشرکین نے جب آپ ﷺ سے خاص خاص معجزات دکھانے کی فرمائش کی تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

"(اے پیغمبر! تم ان سے) کہہ دو میں (نے کب خدائی اختیارات کا دعویٰ کیا) میں تو فقط (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ایک بھیجا ہوا انسان ہوں"۔(الاسراء:۹۳)

اسی طرح بہت سی قرآنی آیتیں اس پر شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی پیغمبر یا کوئی ولی اللہ معجزہ اور کرامت میں خود مختار نہیں ہوتا کہ جب چاہے اور جو چاہے معجزہ یا کرامت کو ظاہر کر دے یہ قطعاً کسی کے بس میں نہیں ہوتا اس لیے جب بھی کسی پیغمبر سے کوئی معجزہ ظاہر ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ یہی اعلان فرماتے رہتے ہیں کہ معجزہ میری طاقت سے نہیں صرف اللہ تعالیٰ کے حکم سے وجود میں آیا جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔

نیز غزوۂ بدر کے موقع پر آپ ﷺ نے کفار و مشرکین کی طرف ایک مٹھی بھر خاک پھینک دی جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے دشمن اسلام کے ہر لشکری کی آنکھ میں جالگی، اس واقعہ کے بارے میں بھی صاف طور پر قرآن مجید نے اعلان کر دیا کہ:

وَمَارَمَيْتَ اِذْرَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

"خاک یا کنکریوں کی مٹھی جو آپ نے پھینکی (حقیقت میں) آپ نے نہیں پھینکی، (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے پھینکی ہے"۔ (الانفال:۱۷)

جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ مٹھی بھر خاک اور کنکریاں اگر چہ آپ ﷺ کے ہاتھ سے پھینکی گئیں لیکن اس مٹھی بھر کا اثر کفار و مشرکین کے تمام لشکر کی آنکھوں میں اللہ تعالیٰ نے پہنچا دیا۔ اس میں آپ کے عمل کا کوئی دخل نہیں۔ یہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اس نے اپنی قدرت سے یکلخت مٹھی بھر خاک اور کنکریوں کو دشمن کے سارے لشکر تک پہنچایا اور ان میں سے ہر ایک کی آنکھ میں اس کا اثر پہنچا دیا۔

معجزات و کرامات اور جادو میں فرق

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح معجزہ و کرامت سے عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں تقریباً اسی طرح کمالات تو سحر، جادو اور طلسم کے ذریعے بھی دکھائے جاسکتے ہیں پھر جادو اور معجزہ و کرامت میں فرق کیا ہوا؟ اس سوال کے جواب سے قبل اسبابِ طبعیہ کو سمجھیے اس کے بعد ان شاء اللہ تعالیٰ معجزہ اور جادو میں فرق خود بخود سامنے آجائے گا۔

اسبابِ طبعیہ کی اقسام

یہاں ان تمام وسائل و اسباب سے بحث نہیں جو خالق اور مخلوق کے درمیان ہیں اور نہ ان کا احاطہ مخلوق کی قدرت میں ہے اور نہ یہ کسی مخلوق کے لیے ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی فائدہ رسانی اور کائنات کے وجود و بقا کے تمام وسائل و اسباب کا احاطہ کر سکے، بلکہ یہاں صرف ان اسباب کی نشاندہی اجمالی طور پر کرتے ہیں جن سے کام لینے اور استعمال کرنے پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک گونہ قدرت و اختیار عطا فرما رکھا ہے اگر چہ ہر چیز کا وجود اللہ تعالیٰ کی قدرت و ارادہ سے ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسباب کا ایک سلسلہ قائم فرمایا ہے اور اس عالم میں چیزوں کی پیدائش اور ایجاد ان اسباب کے ذریعے سے ہوتی ہے مثلاً پانی کا زمین اور چشموں سے جاری ہونا، بادلوں سے بارش برسنا، نباتات و فصلوں اور درختوں کا کاشت و زراعت کے ذریعے پیدا ہونا اور انسانوں اور حیوانات کا توالُد و تناسُل کے ذریعے دنیا میں آنا وغیرہ، یہ وہ اسباب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک گونہ اختیار و قدرت دے رکھی ہے۔ اسباب کا یہ وہ سلسلہ ہے جس کو اسبابِ عادیہ یا اسبابِ طبعیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ظاہری اسباب

ان اسبابِ طبعیہ کی دو قسمیں ہیں: ایک ظاہری دوسری مخفی اور پوشیدہ۔

ظاہری اسباب تو وہ ہیں جو عام لوگوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہوتے جیسے دنیا کی چیزیں مثلاً پانی، آگ، نباتات وحیوانات وغیرہ اور ان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھے گئے فوائد و تاثیرات جن کو انسان مقررہ اسباب اور قوانین کے مطابق اپنی جسمانی اور عقلی قوت اور محنت و کوشش وغیرہ سے حاصل کرتا ہے اس میں اس کو اختیار حاصل ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں، اپنی صلاحیتوں اور جسمانی قوتوں کو اپنی صوابدید پر استعمال کرے اس کی مرضی ہے کہ وہ اس سے اچھے کام کروائے یا برے اس کا کچھ بیان پہلے گزر چکا ہے۔

ظاہری اسباب حیران کن کیوں ثابت نہیں ہوتے؟

ان ظاہری اسبابِ طبعیہ اور ان سے بر آمد نتائج اگرچہ سوچنے والوں کے لیے بہت ہی حیرت کن ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کے لیے یہ اس لیے قابلِ حیرت نہیں ہوا کرتے کہ وہ اسباب سے وابستہ نتائج کا ہر وقت مشاہدہ کرتا ہے مثلاً اللہ تعالیٰ نے زمین بنائی لیکن تھوڑی سی فکر کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ پوری مخلوقات مل کر زمین کا ایک ذرہ بھی نہیں بنا سکیں گے۔ اس زمین کے اجزا میں ترکیب و تحلیل اور اس کے ذروں میں جوڑ توڑ کر کے اس سے ایک نئی چیز تو بنالیں گے، لیکن کسی چیز کو بنانے میں آپ اسی زمین کے مادوں کے محتاج رہیں گے اور خود مادہ کو اپنے ہاتھ سے بنالینا، اس کو ایجاد کر لینا اس کو عدم سے وجود میں لے آنا، یہ مخلوق کی قوت و قدرت سے بالاتر ہے۔

اسی طرح دنیا میں جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے خواہ وہ پتھر ہو، ریت و مٹی ہو یا درخت اور جاندار ہو تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ ہی بناتے ہیں تمام مخلوق مل کر صرف جو کا ایک دانہ نہیں بنا سکتی اور نہ مچھر کا ایک پر بنا سکتی ہے۔ البتہ بندے اور مخلوق ان چیزوں کے پیدا کرنے کا سبب بن سکتے ہیں اور انسان اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں میں محنت و ایجاد سے تغیّر و تبدّل اور ترتیب و ترکیب کر کے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل و صلاحیتوں کی بنا پر نئی نئی چیزیں بنا سکتا ہے۔ ان سب چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اسباب اور قوانین مقرر ہیں مثلاً ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے اور بچے کی پیدائش کا سبب ماں باپ بنتے ہیں لیکن ماں باپ دونوں میں سے کوئی اس کا خالق نہیں ہوتا، اسی طرح گندم کی کاشت اور انسان کے ہاتھ پاؤں مارنے کی وجہ سے گندم کا پودا نکل آتا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص گندم کاشت کرتا ہے تو وہ گندم کو حاصل کر سکتا ہے حالانکہ گندم کے پودے کا اگنا، اس کا بڑھنا، اس کا پکنا اور ایک دانے کے

بجائے سینکڑوں دانے وغیرہ سب کہاں سے آئے کیا اس میں بھی انسان کے عمل کا کوئی دخل ہے؟ ہرگز نہیں اس نے تو صرف ظاہری اسباب اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جن پر اللہ تعالیٰ نے یہ نتیجہ مرتب فرمایا کہ گندم حاصل ہوئی اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝۵۸ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝۵۹

"کیا تم نے (غور سے) دیکھا ہے کہ جو نطفہ تم (رحم میں) ٹپکاتے ہو کیا تم اس کو (انسان بنا کر) پیدا کرتے ہو یا ہم ہی پیدا کرنے والے ہیں؟" (الواقعہ:۵۸-۵۹)

چند آیتوں کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ۝۶۳ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝۶۴

"کیا تم نے (اس بات کو غور سے) دیکھا ہے کہ جو کچھ تم کاشت کرتے ہو کیا اسے تم اگاتے ہو یا اسے ہم ہی اگانے والے ہیں"۔ (الواقعہ:۶۳-۶۴)

اسی طرح ہر چیز کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے اور ہر ایک چیز بذاتِ خود ایک معجزہ اور دنیا کو عاجز کرنے والی ہے، غرض دنیا کی ایک ایک چیز بہت عجیب و غریب ہے اور حیران کن ہے، یہی وجہ ہے کہ کائنات میں غور و فکر کرنے والے اللہ تعالیٰ کی بے انتہا قدرتوں اور اس کے محیرّ العقول نظام کو جب دیکھتے ہیں تو ان کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھر جاتے ہیں اور اس کی نافرمانی کی ہیبت سے لرز جاتے ہیں لیکن غافل لوگوں کے لیے یہ ظاہری اسباب اور ان سے جو چیزیں ظہور میں آتی ہیں وہ اس لیے حیران کن ثابت نہیں ہوتیں کہ وہ صبح و شام ان اسباب سے ان کے نتائج وابستہ ہونے کا مشاہدہ کرتے ہیں اور جب بھی ان چیزوں میں سے کوئی چیز اس راستے سے آتی ہے جس راستے پہلے اس چیز کا تجربہ نہیں ہوا تھا تو وہ ان کو حیرت میں ڈالتی ہے حالانکہ پہلا مانوس راستہ بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تھا اور یہ دوسرا بھی اسی کا بنایا ہوا ہے۔

مخفی اسباب

اسبابِ ظاہری سے ایک قدم آگے جن اسباب پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک گونہ اختیار دے رکھا ہے وہ مخفی اسباب ہیں۔ یہ وہی اسباب ہیں جو عام لوگوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اہلِ فن پر مخفی نہیں ہوتے، ان مخفی اسباب میں سے حروف اور اعمال وغیرہ کی تاثیرات اور انسان کی نفسی قوت ہے اور ان سے نتائج برآمد کرنے کے لیے مقررہ اصول و ضوابط ہیں۔

انسان جس طرح اپنی جسمانی قوت اور صلاحیتوں سے بڑے بڑے حیوانات کو اپنا زیر دست بنالیتا ہے، اسی طرح انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت سی قوتیں ودیعت فرمار کھی ہیں، اس کے اندر ایسے حواس اور قوتیں ہیں کہ اگر ریاضت و مشقتوں سے وہ بیدار کی جائیں تو اس پر علم ومشاہدے کے مزید راستے کھل سکتے ہیں، نیز ایک انسان کے لیے اپنی خداداد صلاحیتوں اور قوتوں کی بنیاد پر روحانی ترقی کے میدان کھلے پڑے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں کہ جو حروف والفاظ کو بھی اپنا ماتحت بنالیتے ہیں اور وہ مقرر قوانین کے مطابق اپنی قوت نفسی سے کام لے کر جنوں اور خبیثوں کو بھی اپنا ماتحت بنالیتے ہیں۔ وہ اپنی نفسی قوت وغیرہ سے ایسے کام بھی دکھلاتے ہیں جو عام لوگوں کے لیے موجبِ حیرت ہوا کرتے ہیں اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عام لوگوں کو ان کے اسباب معلوم نہیں ہوا کرتے۔

مثلاً سائنسی ایجادات میں سے اگر کسی نے پہلے کبھی ریڈیو نہ دیکھا ہو تو وہ ریڈیو کے متعلق یہ سمجھے گا کہ یہ تو خود بول رہا ہے اور یہ اس آدمی کا کمال سمجھے گا جس کے پاس یہ ریڈیو ہے لیکن جب بھی اس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ریڈیو کے ذریعے یہ خبریں سنائی جاتی ہیں، یہ لوہا نہیں بولتا، مگر اس کے ذریعے ریڈیو اسٹیشن کی خبریں کھینچی جاتی ہیں تو پھر یہ قابلِ حیرت نہیں رہتی، یہی حال جادو، سحر، مسمریزم اور ہپناٹزم وغیرہ کا ہے کہ ان کے اسباب مخفی ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کے لیے قابلِ حیرت ہوا کرتے ہیں اور جو لوگ ان فنون سے واقف ہوتے ہیں ان پر ان کے اسباب مخفی نہیں ہوتے اور وہ ان چیزوں سے دفاع کرنے کی تدبیریں وطریقے بھی خوب جانتے ہیں۔

اسی طرح اگر شیاطین یا جن کے ذریعے کسی کے پاس دور کی کسی چیز کی خبر پہنچ جائے تو یہ اس شخص کے لیے تو قابلِ تعجب بات ہوا کرتی ہے جس کو اس کے اسباب معلوم نہ ہوں، لیکن یہ اس آدمی کے لیے قابلِ تعجب بات نہیں جو جن وشیاطین کی حیثیت، ان کی تیز رفتاری اور ان سے کام لینے کی چالیں سیکھ چکا ہو یا کم از کم وہ اس سے باخبر ہو۔

مذکورہ بالا بحث کے بعد معجزہ وکرامت اور جادو وغیرہ میں فرق خود بخود واضح ہوجاتا ہے اور ان کے درمیان امتیازی لکیر کھینچی جاسکتی ہے وہ یہ کہ جادو، مسمریزم، ہپناٹزم وغیرہ سے جو چیزیں وجود میں آتی ہیں تو وہ اسبابِ عادیہ یا اسبابِ طبعیہ سے الگ کوئی چیز نہیں، بلکہ سائنسی مصنوعات کی طرح ان کے اسباب بھی اہلِ فن کو معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ شیاطین اور جن کن چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اور ان سے کام لیا جاسکتا ہے یا وہ کون سا عمل و مشق ہے جس کی وجہ سے قوت نفسی میں اضافہ ہو سکتا ہے یا وہ کون سے حروف و کلمات ہیں [1] جن کو خاص مقدار میں

---

[1] حروف وکلمات میں بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ تاثیرات رکھ دی ہیں اس لیے کسی خاص کلمہ کو خاص تعداد میں پڑھنے یا لکھنے وغیرہ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پڑھ کر یا لکھ کر ان سے فلاں نتیجہ بر آمد ہو سکتا ہے۔

یہی حال ہپناٹزم، مسمریزم اور ٹیلی پیتھی وغیرہ جیسے تمام فنی چیزوں کا بھی ہے، ان چیزوں کے ذریعے خیالات بھی اچک لیے جاتے ہیں حتیٰ کہ اگر ایک آدمی غائب بھی ہو اور اس کی تصویر خیال میں لائی جائے اور اس فن والے کو بتایا جائے تو وہ اس خیال سے عکس لے کر اس کے رجحانات بتاتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی ساری فنی چیزیں لہو لعب ہیں، اس کی سادی سی مثال یہ ہے کہ آپ ہشاش بشاش ہیں، لیکن اچانک آپ کی ملاقات ایسے شخص کے ساتھ ہو جاتی ہے جس کا پیارا بیٹا انتقال کر چکا ہے تو اس کے ساتھ ملتے ہی آپ پر غم کی سی ایک کیفیت طاری ہو جائے گی حالانکہ اب تک اس نے آپ کو کچھ بھی نہ بتایا ہو گا لیکن اس کے باوجود آپ پر غم جیسی ایک کیفیت طاری ہو گی تو جو شخص سمجھ دار ہوتا ہے وہ جان لیتا ہے کہ غم کی یہ کیفیت جو طاری ہے یہ میری نہیں، بلکہ میرے ساتھ ملنے والی اس شخصیت کی ہے جس کا بیٹا انتقال کر گیا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خیالوں میں لوگوں کو مقاماتِ مقدّسہ اور پاکیزہ شخصیتوں کی ملاقات کراتے ہیں دراصل یہ ساری خیالی اور نفسیاتی چیزیں ہوتی ہیں اور خیالی کھیل اور لہو ولعب ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ عوام کو دھوکہ میں ڈال سکتے ہیں۔ بلاشبہ ایسی چیزوں کا صدور بعض اوقات اچھے نیک لوگوں سے بھی ہوتا ہے لیکن وہ نہ ان چیزوں کے دعویدار ہوتے ہیں اور نہ ان چیزوں کے پیچھے پڑنے والے۔

غرض سحر جادو، مسمریزم، ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی وغیرہ جیسی ان تمام چیزوں کے اسباب اگرچہ عام نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں مگر اہلِ فن کو ان کے اسباب معلوم ہوتے ہیں اور ان کے باقاعدہ اصول وضابطے اور قوانین ہیں اس لیے وہ دوسرے فنون اور ہنر کی طرح سیکھے سکھائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس معجزہ وکرامت وہ چیزیں ہیں جو طبعی اسباب اور طبعی قوانین سے بالا اور بلند ہوتے ہیں اور وہ ایک فن کی طرح سیکھا سکھائے نہیں جاسکتے، بلکہ یہ اسباب طبعیہ سے بالا وبرتر اللہ تعالیٰ کی خاص قدرت کا مظاہرہ ہوتے ہیں۔

معجزہ اور جادو میں عام لوگ فرق کیسے کریں؟

لیکن ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ معجزہ اور سحر وجادو وغیرہ میں فرق کو عام لوگ کیسے سمجھیں گے؟ کیونکہ معجزہ اور سحر وغیرہ سے جو چیزیں ظہور میں آتی ہیں ان کی ظاہری صورت تو تقریباً ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بلاشبہ یہ ظاہری التباس اور اشتباہ دنیا کی ہر حقیقت میں ہو سکتا ہے، مثلاً سخاوت اور اسراف، بخل اور کفایت شعاری، میٹھا پانی اور کھارا پانی، حقیقی پھول و درخت اور کاغذی پھول و درخت، حقیقی

(بقیہ حاشیہ) سے خاص تاثیرات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ مختار

انسان اور انسانی مجسّمہ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے متعلق انسان دھوکے میں مبتلا ہو کر کچھ دیر کے لیے مغالطہ میں رہ سکتا ہے۔

لیکن یہ مغالطہ اس وقت فوراً دور ہو جاتا ہے جب اصلی اور نقلی دونوں چیزیں باہم مقابل ہو جاتی ہیں یا اگر حقیقی چیز سے کسی کو واقفیت ہو تو نقلی اور جعلی چیز وہ جلد معلوم کر سکتا ہے، پانی کو چکھ لے تو کھارا اور میٹھا معلوم ہو جاتا ہے، کاغذی پھول و درخت اور انسانی مجسمہ کے قریب جائیں تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، بخیل کے قریب جا کر اس کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کے بعد خوب معلوم ہو جائے گا کہ یہ کفایت شعار نہیں، بلکہ بخیل ہے، یہی حال سخی، مُسرف اور دوسری حقیقتوں کا ہے کہ ان کی ظاہری شکل وصورت اگرچہ ایک جیسی ہوا کرتی ہے مگر ان کی خاصیتیں اور آثار ایک دوسرے سے اس قدر جدا اور ممتاز ہوتے ہیں کہ صاحبِ ذوق اور اہلِ نظر لوگ ان دونوں کے درمیان فوراً امتیاز کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب کبھی نبی وساحر اور معجزہ وسحر دونوں مقابل ہوئے تو یہ دونوں حقیقتیں روشنی اور تاریکی کی طرح ہر ایک پر ایسی ممتاز ہو گئیں کہ کسی کو ان کے درمیان کوئی اشتباہ نہ رہا۔ اب جادو اور معجزہ، جادوگر اور نبی اللہ یا ولی اللہ کے امتیازات کو پڑھ لیجیے:

۱.... جادو کے ذریعے کسی چیز کی حقیقت اور ماہیت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اس فن کی وجہ سے دیکھنے والوں کی آنکھوں، کانوں اور ان کی قوتِ متخیّلہ پر اثر پڑتا ہے جس سے وہاں موجود لوگ ایک چیز کو اس شکل وصورت میں دیکھنے اور سننے لگتے ہیں جس شکل میں ساحر اور جادوگر ان کو دکھانا یا سنانا چاہتے ہیں اور یہ بھی تھوڑی دیر کے لیے ہوتا ہے، اس کا اثر مستقل نہیں رہتا جب بھی کھیل ختم ہو جائے تو اس کا اثر بھی ختم ہو جاتا ہے۔

اس کے برعکس معجزہ وکرامت سے چیزوں کی حقیقت اور ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے، ایک جادوگر بھی لوگوں پر نفسیاتی اثر ڈال کر کسی پتھر کے متعلق کہہ سکتا ہے کہ اس سے پرندہ بن گیا لیکن کھیل ختم ہو جانے کے بعد دیکھیں تو وہ پتھر، پتھر ہی نظر آئے گا، ایک ساحر اور جادوگر پتھر پر لاٹھی مار کر چند گھنٹوں کے لیے لوگوں کو یہ دکھلا تو سکتا ہے کہ دیکھو پتھر سے پانی بہہ رہا ہے، لیکن کچھ دیر کے بعد پانی تو کیا تری بھی نہیں دکھا سکے گا کیونکہ جادو اور سحر سے کسی چیز کی ماہیت اور حقیقت نہیں بدل سکتی، بلکہ سحر کی وجہ سے تو انسانی حواس کو کچھ دیر تک فریب دیا جاتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھیں کہ سچ مچ پرندہ بن جاتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پتھر پر عصا مارا تو اس سے بارہ چشمے بہہ نکلے اور ان کی قوم ان چشموں سے باقاعدہ پانی پیتی رہی اور اپنے مویشیوں کو ان سے پانی

پلاتی رہی، سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہوا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے پیا اور سیراب ہو گئے۔

۲.... چونکہ سائنسی مصنوعات کی طرح جادو، ہپناٹزم، مسمریزم اور ٹیلی پیتھی وغیرہ بھی فنی چیزیں ہیں اور ان کے اسباب اور اصول وضوابط مقرر ہیں، اس لیے تعلیم و تعلّم کے ذریعے سیکھے سکھائے جاتے ہیں اس لیے ان چیزوں کا توڑ لانا کوئی مشکل کام نہیں اور جو لوگ بھی اس طرح فن سیکھ لیں وہ اس طرح یا اس سے اعلیٰ مظاہرہ کر سکتے ہیں مثلاً کوئی ایٹم بم یا جہاز بناتا ہے تو دوسرا بھی اس فن کو سیکھ سکتا ہے اور اس سے اعلیٰ ایٹم بم یا جہاز بنا سکتا ہے۔

اسی طرح جادو، مسمریزم، ہپناٹزم اور ٹیلی پیتھی وغیرہ کے ذریعے بھی کوئی شخص جو بھی شعبدہ بازی اور کھیل دکھلائے تو دوسرا بھی یہی فن سیکھ کر اسی طرح یا اس سے اعلیٰ کھیل بتلا سکتا ہے۔①

بخلاف معجزہ وکرامت کے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی خاص قدرت کا مظاہرہ ہوتا ہے، چونکہ معجزہ کی وجہ سے جن چیزوں کا ظہور ہوتا ہے ان کے لیے کوئی طبعی اسباب اور طبعی اصول نہیں ہوا کرتے اس لیے کسی بھی مخلوق کی یہ قدرت وطاقت نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے کوئی معجزہ یا کرامت لوگوں کے سامنے پیش کر سکیں اور نہ کوئی بشر اس کی طاقت و قدرت رکھتا ہے کہ وہ معجزہ کا مقابلہ کر کے اس کا توڑ پیش کر سکے، کیونکہ انسان کی قوتیں اور تدبیریں کسی چیز کو صرف طبعی اسباب اور طبعی وسائل سے ہی ایجاد کر سکتی ہیں، بلا اسبابِ طبعیہ کسی چیز کا ایجاد کرنا تمام مخلوق کو عاجز بنا دینے والا کام ہے مثلاً دیکھیے انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ زمین کھود کر اس سے پانی نکال لائے مگر اس چیز سے عاجز ہے کہ کسی پتھر پر لاٹھی مار کر یا اپنی انگلیوں سے سچ مچ پانی کے چشموں کو جاری کرے، اسی طرح دنیا کے ماہرین اور بڑے بڑے جادوگروں کی قدرت وطاقت میں یہ نہیں کہ وہ لاٹھی زمین پر ڈال دیں تو اس سے سچ مچ حقیقی سانپ بن جائے، ایسے امور صرف اللہ تعالیٰ کی خاص قدرت کے تحت صادر ہوتے ہیں ذرا دیکھو تو سہی کہ کوہ طور پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی سانپ بن کر دوڑنے لگی تو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی اس سے پیچھے ہٹنے لگے، تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

① اس کا یہ مطلب نہیں کہ العیاذ باللہ سائنس اور سحر وغیرہ جیسی چیزیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی قدرت سے بے نیاز ہو کر از خود مؤثر ہیں، یہ عقیدہ تو خالص کفر ہے کیونکہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قانون کے تحت کام کر رہی ہیں اگر اللہ تعالیٰ نہ چاہے تو کوئی چیز نہ فائدہ پہنچا سکتی ہے نہ نقصان، بلکہ یہاں تو مقصود یہ ہے کہ جادو وغیرہ سے جو مشاہدے ظہور میں آتے ہیں ان کا صدور بھی قوانین اور اسبابِ طبعیہ کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ان کے قوانین اور اسباب ایسے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ اور اہل فن پر ظاہر ہوتے ہیں۔ مختار

خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ سَنُعِيۡدُهَا سِيۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰى ﴿۲۱﴾

''اس (سانپ) کو پکڑ لو اور خوف نہ کرو ہم اس کو پھر اس کی پہلی فطرت پر لوٹا دیں گے۔'' (طٰہٰ:۲۱)

اگر معجزہ پیغمبر کا فن وہنر یا ان کی توجہ اور قوتِ نفس کی تاثیر ہوتا تو پھر اس سے خوف کھانے کی نوبت نہ آتی اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تسلی کی ضرورت تھی کہ وہ اس کو پھر اس پہلی فطرت پر لوٹا دیں گے۔

نیز چونکہ معجزہ صرف فریبِ نظر اور ایک نفسانی کھیل نہیں ہوتا، بلکہ ایک بہت بڑی حقیقت ہوا کرتا ہے اس لیے جب بھی معجزہ اور سحر مقابل ہوئے تو ان دونوں چیزوں میں لوگوں نے ایسا امتیاز کیا جس طرح کہ حقیقی انسان اور تصویری انسان میں امتیاز کیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون نے جب اپنے ملک کے بڑے بڑے ساحروں کو جمع کر دیا اور انہوں نے اپنی لاٹھیاں اور رسیاں میدان میں پھینک دیں تو وہ بڑے بڑے سانپ نظر آنے لگے، لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنا عصا (لاٹھی) پھینک دیا تو وہ سچ مچ اژدھا بن کر ان کے سانپوں کو نگل گیا اور ان کے تمام سحروں کو توڑ دیا، یہ واقعہ دیکھ کر پہلے پہل جادوگروں اور اس کے بعد دوسرے عام لوگوں پر یہ حقیقت خوب واضح ہو گئی کہ معجزہ ایک حقیقت ہوتا ہے اور سحر صرف ایک تماشہ، کھیل اور لوگوں کے حواس کو فریب دینا ہے اور جو بھی یہ فن سیکھ لے گا وہ اپنے فن و مہارت کے مطابق یہ کرتب دکھا سکے گا، یہی وجہ ہے کہ جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے لاٹھی پھینک دی اور وہ اژدھا بن گیا تو جادوگر جو ماہرین فن تھے فوراً سمجھ گئے کہ یہ کوئی فنی اور تخیلاتی چیز نہیں، بلکہ یہ تو انسانی قدرت وطاقت سے بالا اور بلند خاص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مظاہرہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بے ساختہ سجدے میں گر گئے اور بجائے اس طرح کہنے کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ علیہ السلام سب سے زیادہ اعلیٰ اور باکمال جادوگر ہے یوں پکار اٹھے کہ ہم اس رب کو مان گئے جس نے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ وہارون علی نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق یوں فرمایا گیا ہے:

فَاُلۡقِیَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوۡنَ وَ مُوۡسٰى ﴿۷۰﴾

''تو جادوگر بے ساختہ سجدے میں گر گئے اور پکار اٹھے کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے۔''
(طٰہٰ:۷۰)

نبی اور ساحر میں فرق

پھر یہی نہیں کہ صرف معجزہ اور سحر میں فرق ہوا کرتا ہے، بلکہ جس طرح حقیقت کے اعتبار سے معجزہ اور

جادو میں روشنی اور اندھیرے کا فرق ہے، اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نبی (صاحبِ معجزہ) اور جادوگر (صاحبِ جادو) کے درمیان امتیازات ہوا کرتے ہیں مثلاً:

۱.... معجزہ اور کرامت ایسے حضرات سے صادر ہوتے ہیں جن کا تقویٰ، صداقت، امانت، طہارت و پاکیزگی، اخلاق و مروت اور اعمال ایسے بلند ہوتے ہیں جن کا سب لوگ مشاہدہ کرتے ہیں، بلکہ انبیا علیہم السلام کی اول تا آخر زندگیاں اسی طرح آزمائش و امتحانوں کی کسوٹی پر پرکھی گئی تھیں کہ ان کا کوئی شعبۂ زندگی ناقص اور قابلِ اعتراض نہ تھا، ان کی تمام زندگی میں اخلاق کی بلندی، گناہوں سے معصومیت اور صداقت و کردار کا کمال لوگوں کے ہاں ایسا مسلَّم تھا کہ اگر وہ کوئی معجزہ نہ بھی دکھلاتے تب بھی ان کی پیغمبرانہ زندگی اور ان کی تعلیمات اس قدر صداقت پر مبنی تھیں کہ ان کی دعوائے نبوت کی تکذیب چڑھتے ہوئے سورج کی تکذیب کے مترادف ہے۔

۲.... ان حضرات کے دل و دماغ میں اپنے ذاتی مفاد کا کہیں گذر نہیں ہوتا، بلکہ ان کی پوری زندگی کا نصب العین اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی، آخرت کا خوف و فلاح اور انسان و جنات کی دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود ہوتا ہے۔

۳.... وہ جو بات کرتے ہیں اور جو حکم دیتے ہیں وہ عقل و فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہوتا ہے، ان کی ہدایات ٹھوس دلائل و حجّت کے ساتھ ثابت ہوتی ہیں۔

۴.... نبی کو خبر اور تعلیم دینے والے چونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہوتے ہیں اس لیے ایک نبی کا ہر قول و فعل سراسر ہدایت اور حقیقت پر مبنی ہوتا ہے اس لیے ایک پیغمبر کی تعلیمات و ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے لوگوں کی روحوں کو نئی زندگی اور ترقی کی راہیں ملتی ہیں اس کی وجہ سے معاشرے میں لوگ بخیل سے سخی، بدکردار سے عفیف، جھوٹے سے سچے اور بد اخلاق سے نیک اخلاق والے بن جاتے ہیں اور ان کی تعلیمات اور طریقوں پر چل کر لوگوں کے معاملات صاف ستھرے اور پاکیزہ ہو جاتے ہیں، ان میں اُلفت و محبت پیدا ہو جاتی ہے، ان کی تعلیمات کی وجہ سے انسان انسانیت اور صحیح فطرت کی راہ پر پڑ کر ترقی پر ترقی کرتا رہتا ہے۔

۵.... یہی وجہ ہے کہ اگر کبھی ان سے کسی معجزہ کا ظہور بھی ہو جاتا ہے تو اس کا مقصد صرف کھیل تماشا یا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہوتا، بلکہ اس سے ان کی نبوت و رسالت کی تائید، مؤمنین اور مسلمانوں میں اضافۂ یقین، عام لوگوں کو سچائی اور راہِ ہدایت کی طرف دعوت اور دشمنانِ حق کی ہلاکت یا حق کے ساتھ ٹکرانے والوں پر آنے والی ہلاکت اور عذاب کی خبر دینا مقصود ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ساحر اور جادوگروں کا نصب العین اپنے ذاتی مفادات ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جادو اور عملیات پر دنیا و متاع قلیل کے خواہاں ہوتے ہیں یا پھر صرف اپنے تماشے و عجائب بتلانے کے

خواہاں ہوتے ہیں۔

۶.... جادوگروں اور ساحروں وعاملوں کو جو خبریں پہنچتی ہیں وہ شیاطین وجنات کے واسطے سے ہوا کرتی ہیں اس لیے ان کے اکثر کلام اور پیشگوئیاں جھوٹ ہی جھوٹ اور بے معنی باتوں پر ہوا کرتی ہیں، اگر کسی ساحر و جادوگر کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو اس کی زندگی اور شکل وصورت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ نبی یا مُصلح تو کیا ہو گا؟ اس کو تو ایک عام انسان کہنا بھی مشکل ہے، اس کے پاس بیٹھ کر روحانی واخلاقی ترقی اور ذہنی بیداری تو کیا نصیب ہو گی؟ بلکہ ان کے عجائب کو دیکھ کر انسان کے دماغ پر پردے اور مردگی چھا جاتی ہے۔

۷.... ساحر اور جادوگر خبیث النفس ہونے کی وجہ سے لوگوں کے تزکیہ اور اصلاح پر قدرت وطاقت ہی نہیں رکھتے اس لیے آج تک کسی ساحر اور جادوگر نے کسی ایک شخص کا تزکیہ اور اصلاح نہیں کی، بلکہ ساحروں اور جادوگروں کی خود اپنی زندگیاں، معاملات اور اخلاق اس قدر گندے ہوتے ہیں کہ انہیں دیکھ کر کسی سلیم الذوق کا دماغ ان کی گندگی کی بدبو سے پھٹنے لگتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے ہی کو دیکھیے! اس سے جہاں آپ نے معجزہ اور سحر کی حقیقتوں کو معلوم کیا وہاں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معجزہ کا ظہور صرف راہِ حق کی طرف دعوت تھی اور صرف یہ بتلانا مقصود تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے لیکن جادوگروں کے مطالبے پر نظر ڈالیں کہ تمام کے تمام نے اپنے ذاتی مفادات کا مطالبہ کیا چنانچہ فرعون نے تمام بڑے بڑے جادوگروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ کے لیے اکٹھا کیا تو انہوں نے فرعون سے مطالبہ کیا:

قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ

"ان جادوگروں نے کہا کہ اگر ہم موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے تو ہمیں (اس خدمت کا) کچھ صلہ بھی ملے گا فرعون نے کہا ہاں ضرور تم (ہمارے) مقرّب لوگ ہو جاؤ گے"۔ (الاعراف: ۱۱۳-۱۱۴)

پھر انہی جادوگروں کو دیکھیں! جب انہوں نے حق کو قبول کیا اور اپنے رب کی سچائی مان لی تو فرعون جیسے جابر اور ظالم نے ان کو ہاتھ پاؤں کاٹنے کی تعذیب اور سولی پر چڑھانے کی دھمکیاں دیں تو انہوں نے یوں جواب دیا:

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ

"انہوں نے کہا ہم (سچائی کے) ان روشن دلائل کے مقابلے میں جو ہمارے پاس آچکے ہیں اور اس ذات کے

مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے تجھے ہر گز ترجیح نہیں دے سکتے پس تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو (ہمیں کوئی پروا نہیں یہ دنیا اور دنیا کی مصیبت ہے کیا چیز؟)"۔(طٰہٰ:۷۲)

دیکھ لیا حقیقی ایمان کو کہ وہی جادو گر جو فرعون سے اپنی خدمت اور کھیل پر حقیر مادی عوض کے طالب تھے ایمان لانے کے بعد ایسے بے پروا ہو گئے کہ ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سخت سے سخت جسمانی سزا اور قتل کی دھمکیوں کے باوجود، بلکہ اپنی آنکھوں سے سخت ترین سزائیں دیکھ کر بھی وہ راہِ حق سے متزلزل نہ ہوئے۔

روحانی مناظر اور معجزات یا کرامات کا انکار جہالت ہے

بلاشبہ جو لوگ روحانی مناظر اور خوارقِ عادات یا معجزات و کرامات جیسی چیزوں کا انکار کرتے ہیں ان کا انکار در حقیقت کسی علم پر مبنی نہیں، بلکہ وہ محض جاہل ہیں اور سارے جہاں کے لوگوں کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں، حالانکہ عقلمندی یہ ہے کہ اگرچہ کسی حقیقت کا نظارہ آپ نے خود نہ کیا ہو مگر اس حقیقت کو دیکھنے والے موجود ہوں تو پھر انہی پر اعتماد کیا جائے۔

إذا لم تر الهلال فسلم　　　لاناس رأوه بالأبصار

"جب تم نے پہلے دن کے چاند (یعنی نئے چاند) کو نہیں دیکھا ہے تو تم کو ان لوگوں کے قویٰ پر بھروسہ کرنا چاہیے جنہوں نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دیکھا ہے"۔

اس عظیم جہالت کے مرتکب پہلے پہل مشرک اور کفار ہی تھے، لیکن یہ آفت اب مسلمانوں پر بھی آپڑی ہے کہ ان کو بھی روحانی مناظر اور معجزات وغیرہ کے وجود کے بارے میں تردُّد ہونے لگا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو مادی ترقیات کو سب کچھ مانا گیا ہے اور دوسری طرف جب عیسائیوں اور یورپی مستشرقین نے ان چیزوں پر اعتراضات کی بھر مار کی تو گھروں، عام مجالس، منبر اور مواعظ و بیانات میں بھی ان امور کا ذکر تقریباً بند ہو گیا، بلکہ بعض مغرب کے شیدائی مسلمانوں نے ان امور کی بہت چالبازی سے مخالفت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے دلوں سے نہ صرف روحانی اقدار اور روحانی ترقیات کا جذبہ مٹ گیا، بلکہ رفتہ رفتہ وہ معجزات اور کرامات جیسی حقیقتوں کو بھی کم از کم طبعی اسباب کے ساتھ جوڑنے لگے حالانکہ اگر انہی عجائبات کی نسبت مغربی اقوام کی طرف کی جائے تو پھر کسی کو ان کے ماننے میں تردُّد نہیں ہو گا، وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں نے امریکہ وغیرہ کے چند بڑے بڑے ایجادات اور مصنوعات دیکھ لیے ہیں اس لیے اگر آج ان کی طرف عجیب سے عجیب چیز کو منسوب کیا جائے تو وہ ان میں ذرہ برابر شک نہیں کریں گے اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ لوگوں

کے مشاہدے میں چند ایجادات اور مصنوعات آچکی ہیں اس لیے وہ ہر قسم کے سچ جھوٹ کو مانتے ہیں۔

گذشتہ ڈیڑھ ، دوسو برس میں دنیا کی فضا اتنی بدل چکی ہے کہ لوگ روحانی مناظر اور معجزات و کرامات کا مذاق اڑارہے ہیں پرائے تو پرائے خود اپنے مسلمان گھرانوں سے ان چیزوں کی تردید کی جارہی ہے، ایسے گندے اور خوفناک حالات میں حق کی آواز بلند کرنا اگرچہ بہت مشکل کام ہے، لیکن یہ ان لوگوں کے لیے کوئی مشکل نہیں جن کا اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ پر کامل بھروسہ ہو، یہی وجہ ہے کہ ایسے نازک حالات میں اگرچہ بہت سے لوگوں کے قدم پھسل گئے، لیکن پھر بھی ہمارے بہت سے علمائے اسلام نے ان سے اثر قبول نہیں کیا اور نہ ہی انہوں نے باطل سے کوئی مصالحت کی اور نہ ہی ان کی ہاں میں ہاں ملائی، بلکہ اپنی پوری ہمت اور قوت کے ساتھ باطل کی مخالفت کی اور اس کاڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس زور سے مقابلہ کیا کہ وہ یورپی ملحدین بھی روحانی قوتوں کے ماننے پر مجبور ہوگئے جو کچھ عرصہ پہلے مادہ اور اس کی قوت کے علاوہ کسی دوسری قوت کا نام لینے والے کو وہم پرست کہتے تھے۔

روحانی مناظر، معجزات و کرامات کے منکر کون لوگ ہیں؟

۱.... جو لوگ معجزات و کرامات کے قائل نہیں ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہستی ہی کے منکر ہیں۔ان کی جہالت اور حماقت تو اس قدر واضح ہے کہ خود ان کا وجود اور ان کے گردوپیش کی ایک ایک چیز ان کی جہالت اور حماقت کی شہادت دے رہی ہے۔

۲.... بعض دوسرے لوگ ایسے ہیں جو اگرچہ خدا کو مانتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ خدا نے کائنات کو ایک خاص نظم و قانون پر چلادیا ہے،اس کے بعد کائنات کے نظم و قانون میں اس کا کوئی تصرّف نہ رہا گویا وہ الگ تھلگ بیٹھ کر ایک بے بس تماشائی کی طرح کائنات کو خاموشی سے دیکھ رہا ہے اور اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا اس لیے ایسے لوگ جب کسی ایسے واقعہ کے متعلق سنتے ہیں جو اسبابِ طبعیہ سے بالا اور بلند ہو تو وہ اس واقعے کو افسانہ کہہ کر جھٹلاتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو اسے طبعی اسباب کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔یہ لوگ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے تعطُّل کے قائل ہو کر برائے نام ایک ایسے بے اختیار اور بے قدرت خدا کو مانتے ہیں جو کمزور ترین انسان سے بھی زیادہ لاچار اور بے اختیار ہو، یہ درحقیقت خدا کو نہ ماننے کے مترادف ہے۔

۳....ان منکرینِ معجزات و کرامات میں بعض نام نہاد مسلمان بھی ہیں جن کے دل و دماغ پر مادہ پرستی، مادی ترقی

اور سائنسی برتری کا بت مسلّط ہو چکا ہے وہ قرآن مجید میں مذکور ایسے واقعات جن کا ظہور دنیا میں یقیناً بغیر کسی طبعی سبب کے ہوا ہے (مثلاً عصائے موسیٰ علیہ السلام سے اژدھا بننا اور پھر اژدھا سے باقاعدہ عصا بننا وغیرہ) کو بھی کسی نہ کسی طرح ایسے واقعات بنانے کی کوشش کرتے ہیں جن کا وقوع اسبابِ طبعیہ کے تحت ممکن ہو، وہ اس نامبارک کوشش میں نہ تو قرآن مجید کی معنوی تحریف سے خوف کھاتے ہیں اور نہ کسی تبدیلی سے چوکتے ہیں یہ اس لیے کہ وہ قرآن مجید اور احادیثِ شریفہ کو اپنے باطل نظریات کے ہم آہنگ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

۴.... اگرچہ بعض سادہ لوح مسلمان ایسے بھی ہیں جو مذکورہ بالا رویہ اور یقینی معجزات و کرامات میں باطل تاویلات کی راہ صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ اس سے ان کا مقصود بظاہر روشن خیال لوگوں (بد دماغوں) اور مستشرقین کو اسلام اور قرآن مجید کے متعلق مطمئن کرنا اور ان کے اعتراضات کا جواب دینا ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ بھی قرآن و اسلام کے ایسے نادان دوست اور ہمدرد ہیں جن کی دوستی اور ہمدردی دشمنانِ اسلام کے تعصُّب و عداوت سے لاکھوں گنا زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

بعض واقعات کی تاویل کرنے والے لوگوں کا حکم

البتہ یہ بات یاد رکھیں کہ بعض ایسے حضرات جو یقین سے ثابت شدہ معجزات اور کرامات کو تو مانتے ہیں لیکن بعض واقعات کو یا تو اس لیے معجزہ یا کرامت نہیں مانتے کہ ان واقعات کے ثبوت ہی میں واقعی تردُّد موجود ہے یا اس لیے کسی واقعہ کا معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں کہ اس واقعہ میں ایسے صحیح احتمالات موجود ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ طبعی اسباب کے ماتحت ایک واقعہ تھا۔ ایسے حضرات (جو کسی خاص واقعہ کے ثبوت میں متردد ہوں) کو دیکھ کر اس واقعہ ہی کو نہ ماننے یا کسی درست احتمال کی بنیاد پر اس کا معجزہ ہونے سے انکار کرنے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حضرات معجزات و کرامات کے منکر ہیں قطعاً صحیح نہیں، ان کے متعلق یہ کہنا ان پر سخت ظلم کی بات ہے، کیونکہ وہ یقین سے ثابت شدہ معجزات و کرامات کو تو مانتے ہیں لیکن صرف ایک خاص واقعہ کے وقوع میں یا کسی خاص واقعہ کے معجزہ ہونے میں متردِّد ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے حضرات کو منکرین کی صف میں شامل کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔

قرآن اور اسلام کیوں معجزات کا قائل ہے؟

قرآن مجید اور اسلام اس لیے معجزات و کرامات کی تعلیم دیتے ہیں کہ یہ ایک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت کو پر زور انداز میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک قادر مطلق اور با اختیار ہستی ہے، تمام اسباب

(خواہ طبعی ہوں یا غیر طبعی) اور تمام چیزوں پر اسی کی حکومت اور اقتدار چلتا ہے اور تمام اسباب اسی کے بنائے ہوئے ہیں نہ یہ کہ (العیاذ باللہ) اسباب نے خدا کو بنایا ہے۔ ایک مسلمان اس حقیقت کو خوب جانتا ہے کہ سوائے اس کے آخر طبعی اسباب کیا ہیں؟ کہ ہم نے ان اسباب سے بار بار چیزوں کا پیدا ہونا دیکھا ہے اور طبعی اسباب کے ماتحت چیزوں کا پیدا ہونا اسی طرح معجزہ ہے جیسا کہ غیر طبعی اسباب سے ان کا صدور مثلاً اللہ تعالیٰ سانپ، بچھوؤں، درندوں اور پرندوں وغیرہ تمام مادی چیزوں کو ایک ہی جیسے بے جان مادے سے بناتے ہیں اب سانپ اور اس کے انڈوں کو بے جان مادہ سے بنانا اور ان انڈوں سے سانپ کا پیدا ہونا اتنا ہی عجیب واقعہ ہے جتنا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی لاٹھی سے حقیقی سانپ اور اژدھا کا بننا، لیکن فرق صرف یہ ہے کہ انڈوں سے سانپ کا پیدا ہونا بار بار پیش آتا ہے اور لاٹھی سے سانپ کا بننا صرف چند بار واقع ہو چکا ہے۔

اس لیے پہلے واقعہ کے متعلق کوئی تعجب نہیں کیا جاتا اور دوسرا واقعہ لوگوں کو بہت ہی عجیب لگتا ہے حالانکہ عجیب اور معجزہ ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں دونوں برابر ہیں، اس لیے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی عام عادت اور عام قدرت کے مطابق طبعی اسباب کے تحت پیدا ہوتی ہیں ان کو دلائل قدرت کہتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی قدرت کی شہادت اور گواہی دے رہی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی نبی کی سچائی اور صداقت ثابت کرنے لیے کسی چیز کو طبعی اسباب کے بغیر اپنی خاص عادت اور اپنی خاص قدرت کے مطابق دنیا کے سامنے ظاہر کرتے ہیں تو اسے دلائل نبوت یا معجزہ کہتے ہیں۔

اللھم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه

مسلمانوں اور مشرکین کے عقیدہ میں فرق

اسباب کا سلسلہ چونکہ اللہ تعالیٰ ہی نے بنایا ہے اور اس سے جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے دراصل وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اور تمام اسباب پر صرف اللہ تعالیٰ ہی کو مستقل اختیار اور قدرت کاملہ حاصل ہے، اس لیے مسلمان قوم اللہ رب العزت کے سوا کسی بھی دوسری ہستی کے لیے کسی بات میں بھی ذرہ برابر مستقل اختیارات کو ثابت نہیں کرتی، وہ اس حقیقت کو خوب جانتے ہیں کہ تمام چیزیں اور سارے منافع ونقصانات جن کا ظہور ان اشیا سے دکھائی دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہیں۔

اور ان چیزوں سے یہ فوائد بھی اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق حاصل کیے جاتے ہیں اور ان چیزوں کے حصول اور استعمال میں صرف اس وقت نفع ہو سکتا ہے جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور قانون کے مطابق حاصل اور

استعمال کی جائیں، ورنہ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں نقصان و خسران ہی سامنے آئے گا۔

مخلوق کی صفات عارضی اور مستعار ہیں

مذکورہ بالا بحث سے یہ راز بھی کھلا کہ بس تمام خوبیوں و کمالات کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے، مخلوق میں جو بھی خوبی و کمال نظر آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا کرتا ہے اور اس کمال و خوبی کی وجہ سے جو اس کی مخلوق میں دکھائی دیتی ہے مجازی طور پر اس مخلوق کو اس صفت سے موصوف بھی کیا جاتا ہے مثلاً کسی میں علم ہے تو اس کے رتبے کے لحاظ سے اس کو عالم، علامہ وغیرہ کہتے ہیں، جو لوگوں پر رحم کرتا ہے اور اپنے مال و دولت سے مخلوقِ الٰہی کی خدمت کرتا ہے اسے مہربان و سخی اور کریم کہتے ہیں، خوب دیکھنے اور سننے والے کو سمیع و بصیر تک کہا جاتا ہے، لیکن یہ معانی جو مخلوق کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں صرف اس لیے کہ الفاظ کا دائرہ بہت تنگ ہے اور حقیقتیں اور معانی بے شمار ہیں ورنہ کہاں اللہ تعالیٰ کا علم، سمع اور بصر وغیرہ ذاتی اور لا محدود صفات اور کہاں مخلوق کی عارضی اور مستعار صفات۔ دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔

البتہ اللہ تعالیٰ کی بعض صفاتِ کلی کی مخلوق کی طرف نسبت کرنا اگرچہ مجازی طور پر ہو، ممنوع قرار دیا گیا ہے مثلاً رحمٰن وغیرہ جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے مقام پر آئے گا۔

سماعِ موتیٰ اور کشف وغیرہ کے متعلق غلط فہمی اور حماقت وغباوت کے مرتکب لوگ

بعض لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر کسی نے یہ نظریہ رکھا کہ مردے سنتے ہیں تو وہ شرک فی السمع یعنی اللہ تعالیٰ کی صفت سمع میں شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ قطعاً غلط ہے کیونکہ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جس کا خیال یہ ہو کہ مردے کی ذات میں ایسی قوت آجاتی ہے جس کی بنا پر اسی طرح بلا توسُّطِ اسباب کے لا محدود طور پر سننے لگتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے سمع کی صفت ہے اور نہ کوئی مسلمان یہ سوچ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مردے کو سننے کی ایسی قوت مستقل عطا فرمائی ہے جس کے ساتھ وہ اسی طرح سنتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی قوتِ سماعت لا محدود ہے۔

ایسے عقائد و نظریات کی مردوں کے ساتھ کیا خصوصیت ہے؟ ایسے عقائد تو اگر کسی زندہ مخلوق (خواہ وہ فرشتہ ہو یا جن و انس) کے متعلق بھی رکھے جائیں تو شرک ہو جائے گا۔ اگر ان حضرات کا خیال یہ ہے کہ زندہ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں اور جب کوئی قبر میں چلا جاتا ہے اور برزخی زندگی گذارنے لگتا ہے تو دوسرے عالم میں چلے جانے کے بعد یہ خیال کرنا کہ وہ سن رہا ہے اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کا خیال یہ

ہے کہ یہ لوگ بلا توسُّطِ اسباب کے اپنی ذاتی قوتِ سماع کی بنا پر مردوں کے سننے کے قائل ہیں تو یہ خیال صحیح نہیں اس لیے کہ ایک مسلمان کے متعلق ایسا خیال کرنا وہم اور بدگمانی ہے اور اس الزام کے بے جا تہمت کا تیر جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جا لگتا ہے، کیونکہ مردوں کے سننے اور نہ سننے کا مسئلہ عہدِ صحابہ سے چلا آرہا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مسئلہ ہے جس میں دو رائے ہوسکتی ہیں اور قوتِ دلائل کی بنا پر کسی ایک طرف کو راجح قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس کو شرک و توحید کے درمیان گھسیٹ لانا اور ماننے والے کو مشرک کہنا یا اس کے ماننے کو اجماعی مسئلہ قرار دے کر اس کے منکر کو کافر قرار دے دینا یہ سب کچھ حماقت اور تعصُّب کی انتہا ہے جو ایک مسلمان کی شایانِ شان نہیں۔ آپ خود سوچیے! کہ کیا آواز پہنچانے کے لیے صرف مادی اسباب ہوسکتے ہیں اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ کا کوئی سلسلہ اسباب نہیں؟ ایسا ہرگز نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو خبریں اور آوازیں پہنچانے اور چیزیں دکھانے کے لیے آنکھ، کان اور صرف ظاہری حواس اور مادی آلات کا سامان فراہم نہیں فرمایا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی خلقت اور صفت بہت کامل اور بہت پُر حکمت ہے، اس نے ظاہری اسباب سے بالاتر بھی بہت سے وسائل و اسباب ایسے پیدا فرمائے ہیں جن کی بنا پر انسانوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور انسان ان ذرائع کی بنا پر اس دنیا میں دیکھتا اور سنتا ہے اور دنیا کی سیر کرتا ہے۔

مثلاً انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ وحی اور فرشتوں کے ذریعے اپنی تعلیمات سناتے ہیں اور بعض اوقات انہی فرشتوں کے ذریعے غیر انبیا کو بھی کچھ بشارتیں وغیرہ پہنچاتے ہیں مثلاً حضرت مریم علیہا السلام کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت فرشتے کے ذریعے سنائی گئی یا خواب و کشف کی حالت میں بغیر کانوں کے ہم ایسی آوازیں سنتے ہیں اور بغیر مادی آنکھوں کے ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو بعد میں بالکل واقعہ کے مطابق ثابت ہوجاتی ہیں، یہ ایسے واضح اور کھلے شواہد ہیں جن کی تردید صرف وہی شخص کرسکتا ہے جس نے اپنی عمر میں نہ کبھی سچا خواب دیکھا ہو، نہ اس کو سچا الہام و کشف ہوا ہو۔ لیکن پھر بھی قرآن و حدیث سے اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں، شاید ایسے لوگوں کے لیے مفید ثابت ہوجائیں جو ہر کسی کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں اور حقائق کی تردید پر ان کی تمام تر توانائیاں صرف ہورہی ہیں۔

انسان کے پاس سننے اور دیکھنے کے لیے صرف مادی ذرائع نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے غیر مادی اسباب بھی بنا رکھے ہیں:

1.... حضرت یوسف علیہ السلام نے بچپن میں خواب دیکھا اس کو قرآن مجید میں ان الفاظ سے بیان کیا گیا ہے:

اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ۝

"جس وقت یوسف (علیہ السلام) نے اپنے باپ سے کہا ابا جان! میں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو (خواب میں) دیکھا کہ وہ میرے واسطے سجدہ کر رہے ہیں"۔ (یوسف:۴)

حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ بشارت اور خوشخبری بچپن میں خواب کے ذریعے مل گئی تھی اور اس خواب کی تعبیر سالہا سال بعد سامنے آئی جبکہ ان کے گیارہ بھائیوں، ان کی سوتیلی ماں اور باپ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے آدابِ سلام بجالائے یا حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے اپنے خاندان پر اللہ تعالیٰ کا مزید ایک نیا فضل و کرم دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے لیے بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے عرض کیا:

يَٰٓأَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُءْيَٰىَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّى حَقًّا ۖ

"ابا جان! یہ تعبیر ہے میرے اس خواب کی جو میں نے (سالہا سال) پہلے دیکھا تھا میرے پروردگار نے اسے سچا کر کے دکھایا"۔ (یوسف:۱۰۰)

شاید کوئی یہ کہہ دے کہ یہ بشارت اور پیشگی خبر جو حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب میں مل گئی تھی، یہ انبیا علیہم السلام کی خصوصیت ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں اس لیے کہ یہ نبوت سے قبل کا واقعہ ہے، اس لیے اس کے علاوہ ان کے جواب میں یہاں قرآن مجید ہی سے تین ایسے آدمیوں کے خواب کو پیش کرتا ہوں جنھوں نے خواب دیکھا اور وہ مسلمان اور صاحبِ ایمان بھی نہ تھے۔

۲..... حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو آدمی اور تھے، انہوں نے ایک دن خواب دیکھا اور جو کچھ دیکھا تھا وہ سچ مچ واقعہ بن کر سامنے آ گیا۔ قرآن مجید نے ان کے خوابوں کو یوں ذکر فرمایا:

وَدَخَلَ مَعَهُ ٱلسِّجْنَ فَتَيَانِ ۖ قَالَ أَحَدُهُمَآ إِنِّىٓ أَرَىٰنِىٓ أَعْصِرُ خَمْرًا ۖ وَقَالَ ٱلْءَاخَرُ إِنِّىٓ أَرَىٰنِىٓ أَحْمِلُ فَوْقَ رَأْسِى خُبْزًا تَأْكُلُ ٱلطَّيْرُ مِنْهُ ۖ نَبِّئْنَا بِتَأْوِيلِهِۦٓ ۖ إِنَّا نَرَىٰكَ مِنَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿٣٦﴾

"اور اس (یعنی حضرت یوسف علیہ السلام) کے ساتھ دو جوان قید خانہ میں داخل ہوئے (اور ایک روز) ان میں سے ایک نے (حضرت یوسف علیہ السلام سے) کہا مجھے (خواب میں) ایسا دکھائی دیا ہے کہ شراب (بنانے کے لیے انگور کا پانی) نچوڑ تا ہوں اور دوسرے نے کہا مجھے دکھائی دیتا ہے کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں، پرندے ان کو (نوچ کر) کھا رہے ہیں ہمیں اس کی تعبیر بتلایئے۔ بلاشبہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ بہت نیکو کاروں میں سے ہو"۔ (یوسف:۳۶)

حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب سننے کے بعد ان قیدیوں کو کچھ وعظ و نصیحت کی اور اس کے بعد ان کے خوابوں کی تعبیریوں بتلائی:

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُ كُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَ اَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ﴿۴۱﴾

"اے قید خانہ کے دوساتھیو! (تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ) تم میں سے ایک آدمی (وہ جس نے دیکھا کہ انگور نچوڑ رہا ہے وہ) تو (رہا ہو کر بدستور) اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور رہا دوسرا آدمی تو وہ سولی پر چڑھایا جائے گا اور پرندے اس کا سر (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔ اس بات کا فیصلہ ہو گیا ہے جس بات کو تم پوچھ رہے ہو"۔ (یوسف:۴۱)

پھر وہی ہوا جو تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے بتلائی تھی۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ ان دو آدمیوں کو آنے والے حالات کی جو اطلاع ملی اور خواب میں جو کچھ واقعات انہوں نے دیکھے کیا ان کو انہوں نے مادی آنکھوں سے دیکھا؟ حالانکہ حالتِ خواب میں تو یہ آنکھیں اور کان معطّل ہو کر رہ جاتے ہیں تو یہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اور بھی ایسے ذرائع و وسائل پیدا فرمائے ہیں جن کی وجہ سے ایک انسان بن آنکھوں دیکھ سکتا ہے اور بن کانوں سن سکتا ہے اور اس کو آنے والے حالات کی اطلاع بھی مل سکتی ہے۔

۳.... ایک روز شاہِ مصر نے ایک عجیب خواب دیکھا اور جب دربار کے دانشمندوں سے تعبیر دریافت کیا تو انہوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

اس بادشاہ نے یہ خواب دیکھا تھا کہ سات (۷) موٹی گائیں ہیں انہیں سات دبلی پتلی گائیں نگل رہی ہیں اور اناج کی سات (۷) ہری بھری بالیاں وخوشے ہیں اور سات (۷) دوسری سوکھی۔ اس خواب کی تعبیر اس نے اپنے دربار کے دانشمندوں کاہنوں وغیرہ سے دریافت کیا لیکن انہوں نے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا اور اس کو ایک پریشان حال خواب سے تعبیر کر کے ٹال دیا، لیکن وہ ساقی جس نے قید خانہ میں خواب دیکھا تھا اور وہ جیل سے رہا ہو کر دوبارہ بادشاہ کا بدستور ساقی مقرر ہوا تھا اس کو وہ خواب یاد آیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی اور اپنی خواب کی صحیح اور درست تعبیر سامنے آئی تو وہ جیل گیا، اس نے اس خواب کی تعبیر بھی حضرت یوسف علیہ السلام سے دریافت کی اور کہا:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ اَفْتِنَا فِيْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ يَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّ سَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّ اُخَرَ يٰبِسٰتٍ ۙ لَّعَلِّيْۤ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾

"یوسف! اے سچائی کے پیکر! ہمیں (اس خواب کی تعبیر) بتلایئے کہ سات (۷) موٹی تازی گائیوں کو سات (۷) دبلی پتلی گائیں کھا رہی ہیں اور سات (اناج کے) سرسبز خوشے ہیں اور سات خشک تاکہ میں لوگوں کے پاس (آپ کا جواب لے کر) واپس ہو جاؤں شاید وہ (آپ کے علم و فضل اور قدر و منزلت کو) جان لیں"۔ (یوسف:۴۶)

حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر کچھ یوں بیان فرمائی کہ ساتھ موٹی تازی گائیوں سے مراد زراعت کے سات برس تک بہت اچھی فصلیں ہیں ان کے بعد سات برس تک قحط رہے گا اور اس خواب کا پورا جواب اور اس مصیبت سے بچنے کے تدبیر ان الفاظ میں بیان کی:

قَالَ تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِيْنَ دَاَبًا ۚ فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِيْ سُنْۢبُلِهٖٓ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّاْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ ثُمَّ يَاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

"(حضرت) یوسف (علیہ السلام) نے فرمایا (اس خواب کی تعبیر اور اس کے لیے جو تدبیر ہونی چاہیے وہ یہ ہے) کہ سات برس تک لگاتار تم کاشت کرو گے پس (اس دوران چونکہ زراعت کی خوب فراوانی ہو گی اس لیے) جو تم (فصلیں) کاٹو تو اس کو خوشوں ہی میں رہنے دو (تاکہ اناج گلنے سڑنے سے محفوظ رہے) مگر صرف تھوڑا سا (بقدر ضرورت ان میں سے نکال لیا کرو) پھر اس کے بعد سات برس بہت سختی کے آئیں گے جو وہ سب ذخیرہ کھا جائیں گے جو تم نے پہلے (سالوں میں) ان (سختی کے سالوں) کے لیے جمع کر رکھا ہو گا مگر تھوڑا سا جو تم (بیج وغیرہ کے لیے) محفوظ کر لو گے۔ اس کے بعد پھر ایک سال آئے گا جس میں لوگوں پر خوب بارش برسائی جائے گی اور اس سال وہ (پھلوں وغیرہ کا) رس نکالیں گے"۔ (یوسف:۴۷-۴۹)

یہ کافر بادشاہ کا ایک خواب تھا جس کی تعبیر و تدبیر ایک پیغمبر نے بتلائی اور دوسرا یہ کہ پندرہ سال کے پورے اجمالی حالات اور اس کا منظر اس نے خواب میں دیکھا تھا، کن آنکھوں سے دیکھا تھا کیا مادی آنکھوں سے دیکھا تھا؟ ہرگز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وسائل و اسباب کی اتنی کثرت ہے کہ ہم اس کا اندازہ کرنے سے عاجز ہیں۔

۴.... جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئے اور مسجد بنائی گئی تو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے لوگوں کو کیسے جمع کیا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ طلب فرمایا۔ کسی نے عرض کی کہ نماز کے لیے بطورِ علامت کوئی خاص جھنڈا بلند کیا جایا کرے۔ کسی نے رائے دی کہ کسی اونچی جگہ آگ روشن کر دی جایا کرے تاکہ اسے دیکھ کر لوگ مسجد میں جمع ہو جایا کریں۔ بعض کی رائے

ہوئی کہ ناقوس بجانا چاہیے تاکہ اس کی آواز سن کر لوگ مسجد میں حاضر ہو جایا کریں۔ اسی طرح مختلف قسم کے مشورے آئے لیکن آپ ﷺ کا کسی بات پر اطمینان نہیں ہوا اور بغیر کسی فیصلہ کے مجلس برخاست ہوئی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے اپنے گھر آگئے، چونکہ آپ ﷺ کی فکر مندی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دیکھی تھی اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اس مسئلہ میں بہت متفکر تھے، ان میں سے ایک صحابی حضرت عبد اللہ بن زید بن عبدِ ربّہٖ رضی اللہ عنہ تھے جن کو اسی مسئلہ کے متعلق سخت فکر لاحق ہوئی تھی، اسی سوچ و بچار میں گھر آکر سو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت میں بالکل سویا ہوا نہیں تھا، بلکہ غنودگی کے عالم میں تھا اسی خواب یا کشف کی حالت میں ان کو اذان و اقامت دونوں کا پورا طریقہ و الفاظ سنائے گئے۔

اور صبح ہوتے ہی حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا اور سنا تھا بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّهَا لَرُؤْيَا حَقٌّ اِنْ شَاءَ اللهُ فَقُمْ مَعَ بِلَالٍ فَأَلْقِ عَلَيْهِ مَا رَأَيْتَ فَلْيُؤَذِّنْ بِهٖ فَاِنَّهٗ اَنْدٰى صَوْتًا مِّنْكَ

”ان شاء اللہ خواب سچا ہے اب تم بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑے ہو کر ان کلمات کو انہیں بتاتے جاؤ جو آپ نے خواب میں دیکھے ہیں اور وہ اذان کہیں، کیونکہ ان کی آواز تم سے زیادہ بلند ہے (حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کھڑا ہوا اور میں انہیں سکھاتا گیا اور وہ اذان دیتے گئے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بھاگ کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا فللہ الحمد۔

(دیکھیے ابو داؤد، ترمذی، دارمی، ابن ماجہ)

ان خوابوں یا کشف میں ایسے صاف صاف اذان و اقامت کے کلمات سکھلائے گئے ہیں جن کی تعبیر کی بھی ضرورت نہیں تھی اور فرشتے کی یہ آواز ان حضرات نے بغیر کسی مادی کانوں کے سنی۔

۵.... حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے (ایران کے صوبے ہمدان کے جنوب میں واقع مقام نہاوند کی طرف) ایک لشکر بھیجا اور اس پر ساریہ نامی شخص کو امیر بنایا۔ آپ خطبہ دے رہے تھے کہ اچانک آپ رضی اللہ عنہ نے چلا چلا کر کہنا شروع کیا کہ ”یا ساریۃ الجبل“ اے ساریہ پہاڑ کی طرف رخ کرو“۔ (یعنی میدان کے بجائے پہاڑ کے دامن میں چلے جاؤ) لوگوں کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا اور پھر جب (چند روز بعد) لشکر سے ایک قاصد آیا اور اس نے (میدانِ جنگ کے حالات سنا کر) کہا کہ اے امیر المؤمنین! ہم دشمن سے

ہارنے اور بھاگنے لگ گئے تھے کہ اچانک ہمارے کانوں میں ایک شخص کی آواز آئی جو چلا چلا کر یہ کہہ رہے تھے کہ یاساریۃ الجبل چنانچہ (یہ آواز سن کر) ہم نے (میدان کے بجائے پہاڑ کے دامن میں جاکر) پہاڑ کو اپنا پشت بان بنالیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کو شکست دی۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے میدانِ جنگ کا معائنہ عین خطبہ کے وقت کیسے کیا؟ اور کن آنکھوں سے کیا؟ پھر ان کی آواز کو اللہ تعالیٰ نے ہزاروں میل دور کن ذرائع سے پہنچایا وہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے خواہ وہ ہواؤں کے ذریعے پہنچائے یا فرشتوں کے ذریعے یہ اسی کا کام اور قدرت ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ مادی آنکھ اور کان کے بغیر دوسرے ذرائع سے اور بلا کسی سبب کے بھی اپنے بندوں کو چیزیں دکھلاتے ہیں اور سنواتے ہیں۔

۶.... حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب جنگ اُحد پیش آئی تو رات کو میرے والد صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ مجھے دکھائی دیتا ہے کہ (اس جنگ میں) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جو صحابہ شہید ہوں گے، ان میں سب سے پہلے قتل ہونے والا شخص میں ہوں گا اور اس میں شک نہیں کہ میں اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہیں چھوڑ رہا ہوں جو مجھے تم سے زیادہ عزیز ہو، سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے (یعنی وہ تو ایسی ہستی ہیں جو مجھے تمام لوگوں سے زیادہ، بلکہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہیں باقی میرے پسماندگان میں تم ایسے شخص ہو جو مجھے زیادہ محبوب و عزیز ہو، لہٰذا اسی خصوصی تعلق کی بنا پر تمہیں یہ کہتا ہوں کہ) میرے ذمہ جو قرض ہے اسے ادا کر دینا، نیز اپنی بہنوں کے حق میں (جو نو "۹" ہیں) میری یہ وصیت سن لو کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، (حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) جب صبح ہوئی تو میرے والد ہی شہید ہونے والوں میں سے پہلے شخص تھے اور میں نے ان کو ایک اور شخص کے ساتھ ایک ہی قبر میں دفن کیا"۔ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

اس حدیث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے کسی الہام یا کشف وغیرہ کے ذریعے سے یہ بات بتلائی تھی کہ وہ جنگِ اُحد میں سب سے پہلے شہید ہونے والے ہیں۔ یہ پیشگی خبر خواہ الہام ہو یا کشف اور خواب وغیرہ جو بھی ہو بہر حال غیر مادی ذرائع ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جب چاہے اور جو کچھ چاہے بتلاتے ہیں اور سنواتے ہیں۔

۷.... حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) تو آیتوں (معجزات) کو برکت و خوشحالی کا سبب سمجھتے تھے اور تم لوگ سمجھتے ہو کہ آیات بس (منکرینِ حق کو) ڈرانے کے لیے ہیں۔ (اس کے بعد حضرت

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک معجزہ بیان کیا کہ) ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے کہ راستہ میں ہمارے پاس پانی کم ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر (کسی کے پاس تھوڑا سا بھی) بچا ہوا پانی ہو تو اس کو تلاش کر کے میرے پاس لاؤ، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک برتن پیش کیا جس میں تھوڑا سا پانی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس برتن میں ڈال دیا اور فرمایا آؤ جلدی سے، یہ پاک اور بابرکت پانی حاصل کرو اور یہ وہ برکت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے اور (حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک انگلیوں سے میں نے پانی ابلتے ہوئے خود دیکھا۔ نیز (حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) کھانا کھایا جارہا تھا اور ہم اس کی تسبیح کی آواز سنا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

بلاشبہ کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی حمد و تسبیح نہ کر رہی ہو، لیکن یہ بات ہر ایک کے بس میں نہیں کہ اس کی تسبیح و تحمید کو سنے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ

"اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد و ثنا نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے"۔ (الاسراء:۴۴)

البتہ اللہ تعالیٰ کسی پر حقائق کھول دیں اور اسے سنانا چاہیں تو وہ ہر ہر چیز سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تحمید کو محسوس کرتا ہے اور سنتا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا حدیث میں ساری تصریح موجود ہے۔

مذکورہ بالا چند آیتیں اور احادیث بطورِ نمونہ پیش کی گئیں جن سے ان لوگوں کی حماقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جن کی نظر مادی کان اور آنکھ سے آگے نہیں پہنچتی اور ان کا خیال یہ ہے کہ بس جو ظاہری اور مادی حواس کے علاوہ کسی چیز کے سننے یا دیکھنے کا قائل ہوا تو اس نے گویا اس ہستی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ صفت میں شریک کر دیا۔ اگر بنظرِ غائر ان لوگوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو محدود، بلکہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال کی نفی کر رہے ہیں جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آجائے گا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پیدا فرمایا ہے

ان حضرات کو سوچنا چاہیے کہ انسان تو اللہ تعالیٰ کی بہت ہی عمدہ اور بہترین مخلوق ہے۔ حیوانات میں بھی ایسے کمالات اور باطنی حواس موجود ہیں جن کے ذریعے وہ غیر مادی اشیاء کو دیکھتے ہیں۔ آج کل خاص قسم کے کتوں سے چوروں اور قاتلوں کو معلوم کیا جاتا ہے، ہزاروں کے مجمع کے درمیان چور یا قاتل کو چھپالو کتا پورے مجمع میں سے اسی ایک آدمی کو چھانٹ کر باہر نکال دے گا۔ یہ ایسے روز مرہ کے تجربات ہیں جن سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، لیکن

اس سلسلے میں ایک حدیث شریف بھی نقل کرتا ہوں تاکہ پوری حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

۸.... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا سَمِعْتُمْ صِيَاحَ الدِّيكَةِ فَاسْئَلُوا اللهَ مِنْ فَضْلِهِ فَاِنَّهَا رَأَتْ مَلَكًا وَاِذَا سَمِعْتُمْ نَهِيقَ الْحِمَارِ فَتَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ فَاِنَّهٗ رَاٰى شَيْطَانًا

"جب تم مرغ کو بانگ دیتے سنو تو اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل مانگو کیونکہ وہ فرشتے کو دیکھتا ہے اور جب تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو کیونکہ وہ شیطان کو دیکھتا ہے"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم کذا فی المشکوٰۃ)

فرشتے اور شیطان دونوں ایسی مخلوق ہیں جو عام نظروں میں آنے والی نہیں ہیں لیکن پھر بھی ایک انسان نہیں، بلکہ حیوان اور جانور بھی ان غیر مادی چیزوں کو دیکھ سکتا ہے، کیا یہ سب کچھ اس بات کی غمازی نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ نے مادی وسائل و ذرائع کے علاوہ اور بھی بہت سے ذرائع اور وسائل ایسے مہیا فرما رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنی مخلوق کو حقائق دکھاتے اور سناتے ہیں۔

کیا عالَمِ برزخ اور اس مادی دنیا کے درمیان رابطہ ممکن ہے؟

یہاں یہ شبہ درست نہ ہوگا کہ عالَمِ قبر اور برزخ کی زندگی چونکہ بالکل الگ زندگی اور عالَم ہے، اس لیے وہاں میت کے حالات کا جاننا یا سننا ناممکن ہے اور نہ یہاں کے حالات یا آواز اسے سنائی جاسکتی ہے، کیونکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ، احادیث اور لوگوں کے تجربات اس کے لیے کافی شافی ہیں۔ نیز بہت سے لوگوں کو اپنے رشتہ دار یا دوست وغیرہ میتوں کے ساتھ خواب میں ملاقات ہوتی ہے اور بہت بار ایسا ہوتا ہے کہ کسی میت کو کسی نے دیکھا بھی نہیں ہوتا اور خواب میں اس کے ساتھ ملاقات ہو جاتی ہے، پھر جب اس کے رشتہ داروں سے یا ان کا فوٹو دیکھ کر اس کی شکل و صورت معلوم کرتا ہے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ غرض اگر کسی پر برزخ کے حالات منکشف ہوئے یا کوئی اس بات کا قائل ہے کہ مردے سنتے ہیں تو ایسے لوگوں کو مشرکین کی صف میں داخل کرنا بہت ہی زیادتی ہے۔ میرے علم میں اول سے لے کر آج تک اہلِ علم حضرات میں سے کوئی ایسا شخص نہیں آیا جنہوں نے یہ حماقت کی ہو اور نہ مجھے کسی عالم پر بدگمانی ہے البتہ بعض کم فہموں سے باہمی تصادم و ٹکراؤ کے وقت ایک دوسرے پر جو ایسے غیر سنجیدہ اور ظالمانہ فقرے کسے جاتے ہیں اس کے سدباب کے لیے اس موضوع کو طویل کیا۔ برزخ کے متعلق بھی اگر کوئی شخص اس حماقت کا ارتکاب کرتا ہو اور اس کو کوئی تجربہ نہ ہوا ہو تو ایسے لوگوں کے لیے عالَمِ برزخ کے متعلق بھی بطورِ نمونہ چند حدیثیں پیش کی جاتی ہیں:

۱.... انبیا علیہم السلام خصوصاً سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالَم برزخ، بلکہ دوزخ، جنت کے حالات وحی کے ذریعے صرف بتلائے نہیں گئے، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا مشاہدہ بھی کرایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گذشتہ انبیا علیہم السلام کے ساتھ ملاقاتیں کیں، ان کو نماز پڑھائی، ان سے باتیں کیں، سوال وجواب ہوئے، اس میں تو کسی مسلمان کے لیے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور نہ اس سے کوئی معمولی لکھا پڑھا بے خبر ہے کہ اس کے متعلق کتبِ حدیث میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں جن سے فی الجملہ یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ عالَم برزخ کے حالات اگر کسی نے مشاہدہ کیے تو اس کی وجہ سے العیاذ باللہ وہ خدا کی خدائی میں شریک نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ جس کو جس قدر دکھلانا اور سنوانا چاہے دکھلا سکتا ہے اور سنوا سکتا ہے اور اس کے بنائے ہوئے دکھلانے اور سنوانے کے ذرائع اس کی مخلوق ہیں اسی کے حکم کے تابع ہیں۔

۲.... حضرت ام العلاء انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے خواب میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ جو وفات پا گئے تھے کے لیے ایک چشمہ جاری ہوتے ہوئے دیکھا تو میں نے اپنا خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ اس کے عمل کا ثواب ہے جو اس کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ (صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت ام العلاء رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے اس ثواب کو متشکل ہو کر جاری چشمہ کی صورت میں دیکھ لیا جو ان کے لیے جاری کیا گیا تھا۔

۳.... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا وُضِعَ فِیْ قَبْرِہٖ وَتَوَلّٰی عَنْہُ اَصْحَابُہٗ وَاِنَّہٗ لَیَسْمَعُ قَرْعَ نِعَالِھِمْ اَتَاہُ مَلَکَانِ

"جب بندہ قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی (یعنی رشتہ دار وغیرہ لوگ جو جنازہ کے ساتھ آئے تھے) واپس چل دیتے ہیں (اور ابھی وہ اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ) وہ مردہ ان کی جوتیوں کی آواز سن رہا ہوتا ہے کہ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں"۔ (صحیح بخاری و مسلم)

۴.... حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب جنازہ تیار کیا جاتا ہے اور لوگ اسے اپنی گردنوں پر اٹھاتے ہیں تو اگر وہ (میت) نیک ہوتا ہے تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ (مجھے میری منزل کی طرف) جلدی لے چلو اور اگر وہ نیک نہیں ہوتا تو کہتا ہے کہ ہائے افسوس! مجھے کہاں لے جاتے ہو اس (میت) کی اس آواز کو سوائے انسان کے ہر چیز سنتی ہے اگر انسان سن لے تو بے ہوش ہو کر گر پڑے"۔

(صحیح بخاری، مشکوٰۃ)

ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے بندے مرنے کے بعد بھی بول سکتے ہیں، اور سن بھی سکتے ہیں یہ اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کیسے بولتے ہیں؟ کس زبان سے بولتے ہیں؟ کیسے سنتے ہیں؟ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔

کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے اللہ تعالیٰ شانہ کی پاکی، تقدُّس اور اس کی قدرت زبان حال یا قال سے یاد کرتی ہے، لیکن ہم نہ ان کی زبان کو دیکھتے ہیں اور نہ ان کی آواز کو سنتے ہیں۔ اس آخری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ برزخ کے بعض حالات اور اس کی بعض آوازیں سوائے انسان و جنات کے دوسری مخلوقات کو محسوس ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسے وسائل اور ذرائع بنا رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ قبر و برزخ کی بعض آوازوں کو سنتے ہیں جیسا کہ بعد میں آنے والی حدیثوں میں اس کی صراحت موجود ہے۔

۵.... ایک طویل حدیث کے آخر میں ہے کہ کافر و منافق جب قبر اور برزخ کے سوال و جواب میں ناکام ہو جائیں گے تو انہیں گرزوں سے مارا جائے گا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

وَ يُضْرَبُ بِمَطَارِقَ مِنْ حَدِيْدٍ ضَرْبَةً فَيَصِيْحُ صَيْحَةً يَسْمَعُهَا مَنْ يَّلِيْهِ غَيْرَ الثَّقَلَيْنِ

”لوہے کی گرزوں سے اس کو مارا جاتا ہے تو اس سے وہ اس طرح چیختا ہے کہ انسانوں اور جنات کے علاوہ اس کے آس پاس کی ہر چیز اس کے چیخنے کو سنتی ہے“۔ (صحیح بخاری و مسلم، مشکوٰۃ)

٦.... حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر پر سوار تھے اور قبیلہ بنی نجار کے ایک باغ میں سے گزر رہے تھے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خچر بدک گیا اور قریب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گرا دے، اچانک نظر پڑی تو دیکھا کہ پانچ چھ قبریں نظر آئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان قبر والوں کو کوئی جانتا ہے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک نے عرض کیا کہ میں جانتا ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ لوگ کب مرے ہیں (یعنی حالتِ کفر میں مرے ہیں یا حالتِ ایمان میں) انہوں نے عرض کیا یہ حالتِ شرک میں مرے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ تُبْتَلٰى فِيْ قُبُوْرِهَا فَلَوْلَا اَنْ لَّا تَدَافَنُوْا الدَّعَوْتُ اللّٰهَ اَنْ يُّسْمِعَكُمْ مِّنْ عَذَابِ الْقَبْرِ الَّذِىْ اَسْمَعُ مِنْهُ

”بلاشبہ یہ لوگ اپنی قبروں میں عذاب میں مبتلا ہیں اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ تم (مردوں کو) دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا کہ وہ تم کو بھی عذاب قبر میں سے وہ کچھ سنا دے جو میں سن رہا ہوں“۔ (صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

عام انسانوں اور جنات پر عالَم برزخ کی حالت مخفی رکھنے کی وجہ

مذکورہ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا کہ برزخ کے حالات کا ادراک ناممکنات میں سے نہیں، بلکہ انسان اور جنات کے علاوہ دوسری مخلوقات کو ان کا ادراک اور احساس ہوتا ہے اور اس آخری حدیث نمبر٦ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان پانچ چھ قبروں میں جن لوگوں کو عذاب ہورہا تھا ان کے عذاب کو اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ موجود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محسوس نہیں کیا، لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس عذاب کو محسوس کیا اور سن لیا اور آپ ﷺ جس خچر پر سوار تھے اس کو بھی اس کا احساس ہوا اور اس پر اثر پڑا۔ انسان اور جنات پر برزخ کے ان شدائد اور مصائب کو جو چھپا لیا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ برزخی حالات اور اس کے عذاب کو اگر وہ دیکھ لیں تو اس سے العیاذ باللہ وہ اس قدر ترقی کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ سمع وبصر میں اشتراک پیدا کر سکیں گے۔ آخر گدھے، خچر اور آس پاس کی دوسری مخلوقات جب عذاب وعتاب کو محسوس کرتی ہیں تو اگر انسان سن لیں یا دیکھ لیں یا اگر اس دنیا والوں کے سلام وغیرہ کو قبر اور برزخ والے لوگ سن لیں یا جان لیں تو ان میں وہ کون سی بات ہے جس کی وجہ سے کوئی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی صفت میں ادنیٰ اشتراک پیدا کر سکتا ہے۔

البتہ انسان اور جنات کو حالاتِ برزخ نہ بتلانے کی وجہ یہ ہے کہ عام انسانوں میں اس کی صلاحیت نہیں ہوتی، کیونکہ انسان اور جنات کا واسطہ عالَم برزخ، دوزخ یا جنت سے ہوتا ہے، اب اگر برزخ کے حالات کسی پر کھل جائیں اور مردوں پر جو کچھ گزر رہا ہے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور سن لیں تو ایسی صورت میں ایک تو وہ "ایمان بالغیب" نہیں رہتا اور دوسرا یہ کہ دنیا کا نظام چل نہیں سکتا جیسا کہ حدیثوں میں اس کی وجہ یہی بیان فرمائی گئی کہ ان کی چیخ وپکار کا تحمُّل وبرداشت مشکل ہے، اس سے بے ہوش ہو کر گر جاؤ گے اور جب یہ برزخ اور قبر کی چیخ وپکار آپ کے سامنے ہو تو اپنے مردوں کو دفنانا چھوڑ دو گے اور دنیا کا نظام، لین دین درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔

البتہ اللہ تعالیٰ کے جن بندوں کا ایمان بالغیب اس قدر پختہ ہو اور غیبی امور پر ان کا ایمان ویقین اس درجہ کو پہنچ چکا ہو کہ ان کے لیے قبر کا عذاب اور جنت ودوزخ دیکھنا اور نہ دیکھنا دونوں برابر ہو جائیں اور ان میں ان چیزوں کی برداشت وتحمُّل بھی ہو جیسا کہ انبیا علیہم السلام خصوصاً سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو برزخ کے حالات، دوزخ وجنت کے مناظر صرف بتلائے نہیں گئے، بلکہ آپ ﷺ کو ان میں سے بعض حالات اور مناظر دکھلائے بھی گئے اور سنوائے بھی گئے۔

مذکورہ پوری بحث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ عالَم برزخ اور مادی دنیا کے مابین رابطے کے اسباب موجود

ہیں (اگرچہ ان اسباب کی حقیقت اور نوعیت کو ہم نہیں جان سکتے) ورنہ بعض مخلوقات پر اس کے حالات منکشف نہ ہوتے۔

بس مسئلہ صاف ہے اس میں مزید وقت خرچ نہیں کرنا چاہتا اور نہ یہاں سماع موتیٰ وغیرہ جیسے مسائل پر بحث کرنا مقصود ہے اور نہ اس کو ثابت کرنے کے درپے ہوں۔ یہاں تو صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایسی حماقت کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے کہ کسی کو کوئی کشف ہو جائے یا الہام ہو جائے تو اس کا سرے سے انکار کیا جائے یا کوئی سماعِ موتی کا قائل ہو جائے تو ان مسائل کو کھینچ تان کر ان سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں شرک کا مسئلہ بنایا جائے اور پھر اس کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر کی جائے۔

البتہ اگر کسی مخلوق (خواہ وہ انسان ہو یا فرشتہ اس) کے متعلق یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے چاہے بغیر از خود سننے یا دیکھنے کی براہِ راست قوت رکھتا ہے تو پھر یہ صفاتِ الٰہی میں شرک ہے، لیکن اس میں مردہ اور زندہ کا کوئی فرق نہیں خواہ وہ مردہ ہو یا زندہ بے جان ہو یا جاندار جس کے متعلق بھی یہ عقیدہ رکھا جائے تو یہ شرک و ضلالت ہے۔

نیز یہ مسئلہ بھی صاف ستھرا ہے کہ کسی نے مثلاً اگر سونے کے بازار کو دیکھ لیا تو وہ بے چارہ اس سونے کے بازار کا مالک تو نہیں بن گیا اور نہ وہ سونے کی دکانوں میں کسی تصرف کا حق دار ہے۔ اب اگر ایسے شخص کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ وہ جسے چاہے جتنا چاہے سونا اور سونے کے زیورات دے سکتا ہے تو جس طرح پہلا خیال غلط اور حماقت ہے، اسی طرح یہ دوسرا خیال بھی حماقت اور سراسر جہالت ہے، ساری بادشاہی اللہ تعالیٰ کی ہے اور تمام کائنات اسی کی ہے۔ اگر کسی انسان یا کسی اور مخلوق پر اللہ تعالیٰ نے کائنات کے کچھ حالات منکشف کیے یا انہیں آسمانوں وزمین کی سیر کرائی یا کسی مخلوق کو بعض حقائق سے آگاہ کیا تو اس کی بنا پر کوئی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کائنات اور اس کے اختیارات میں اشتراک پیدا نہیں کر سکتا کہ جس کی بنا پر وہ نفع و نقصان کا مالک بھی بن جائے اور پھر اسی کو ماویٰ و ملجا بنایا جائے اور اس سے اپنی مشکلات و حوائج میں مدد مانگی جائے۔ بلاشبہ یہ غلیظ حماقت کے ساتھ ساتھ شرک جیسے عظیم جرم کا ارتکاب بھی ہے جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا مفصل بیان آنے والا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ مسئلہ سماع موتیٰ نہ تو اسلام کے مسلّمہ عقائد میں سے ہے، نہ اس کا انکار کفر ہے اور نہ مردوں کا نہ سننا کوئی اجماعی عقیدہ اور شرک ہے، بلکہ یہ اختلافی نظریہ ہے جس میں پہلے سے دو رائے چلی آ رہی ہیں۔

باب .... عبادت میں شرک

عبادت کی تعریف

شریعتِ مطہّرہ کی رو سے عبادت اسے کہتے ہیں کہ کسی ہستی کو نفع و نقصان کا مالک مان کر اس کے تقرُّب اور خوشنودی کے لیے اس کے سامنے اپنی انتہائی عاجزی و انکساری اور بندگی کا اظہار کیا جائے۔

عبادت معنی کے لحاظ سے پرستش، بندگی، غلامی، عجز و انکساری، خشوع و خضوع، انتہائی تعظیم، محبت و خلوص اور اپنی پوری قوت کے ساتھ اطاعت جیسے تمام معانی کو شامل ہے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ دل و جان سے اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کو اختیار کیا جائے، عبادت کا درست مختصر معنی یہی ہو سکتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی دل و جان سے اور پوری قوت سے اطاعت و بندگی تو اس وقت ہی ممکن ہے جبکہ دل میں اللہ تعالیٰ کی انتہائی تعظیم و محبت ہو، اسی سے امیدیں وابستہ ہوں، اس کے خوف سے دل لرز رہا ہو، اسی پر اور اس کے قانون و حکم پر کامل بھروسہ ہو، اسی کی طرف انابت ہو، اسی کے سامنے جھکنے، سجدہ ریزی اور پرستش کا جذبہ ہو، ایسے مبارک جذبات کا نتیجہ تو یہی ہو گا کہ ایک انسان انتہائی محبت اور خلوص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے جھک جاتا ہے اور پوری قوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرتا ہے۔ اور اسی عقیدے اور جذبے کے ساتھ ہر مطلوب عمل اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی بن جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت اور غیر اللہ کی عبادت کے درمیان حدِّ فاصل

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو ایسے پکارنا یا اس کی تعظیم و تعریف اس انداز سے کرنا جس کا محرک عقیدہ شرکیہ ہو تو وہ شرک ہو گا یعنی عقیدہ شرکیہ کے ساتھ ہر تعظیم و پکار عملی شرک اور غیر اللہ کی عبادت کہلائے گی اور اگر یہ تعظیم وغیرہ عقیدہ توحید سے پھوٹنے والی ہے تو یہ خالصۃً توحید اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کہلائے گی۔ اس سے متعلق چند آیاتِ کریمہ یہ ہیں:

۱.... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿١٠٢﴾

”یہی اللہ تعالیٰ تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہر چیز کا خالق ہے اسی کی عبادت کرو اور وہ ہر چیز کا (حقیقی) کارساز ہے“۔(الانعام:۱۰۲)

۲.... وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ

”اور ہم نے تم سے پہلے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جس کی طرف میں نے وحی نہ کی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود

(یعنی عبادت کے لائق) نہیں لہٰذا میری ہی عبادت کرو"۔(انبیا:۲۵)

۳....اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ

"(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم سے فرمایا کہ) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہارے رزق (اور نفع ونقصان) کے مالک نہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی سے رزق طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اسی کا شکر ادا کرو اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤگے"۔(عنکبوت:۱۷)

۴....قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

"(اے پیغمبر ان سے) کہدو کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا اس کی عبادت کرتے ہو جو تمہارے نفع ونقصان کے مالک نہیں اور اللہ تعالیٰ ہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے"۔(المائدہ:۷۶)

مذکورہ بالا آیتوں سے بھی اور اس سے پہلے باب "اللہ تعالیٰ کی صفات کے نفاذ میں شرک" میں جو کچھ لکھا گیا اس سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہوگئی کہ اکثر مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ جن ہستیوں کے نام یہ بت بنائے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں جن کی وجہ سے وہ مافوق الاسباب غیبی طور پر نفع ونقصان پہنچاسکتے ہیں اور وہ جس کے حق میں بھی چاہیں ان اختیارات کو استعمال کرسکتے ہیں جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔یہی عقیدہ اور اس کے مطابق عمل ان کے آباواجداد میں چلا آرہا تھا جب بھی ان کو اللہ تعالیٰ کے کسی پیغمبر نے ٹوکا اور یہ تنبیہ کی کہ یہ کیسا بے ہودہ عقیدہ رکھتے ہو یا ان مورتیوں میں آپ نے دیکھا کیا ہے کہ ان کی عبادت میں مشغول ہوگئے تو ان کے پاس بطورِ فخر صرف ایک ہی جواب تھا کہ ہم نے اسی عقیدے وعمل پر اپنے اسلاف اور آباواجداد کو پایا ہے، وہ بہت بڑے ذہین اور ہوشیار تھے، وہ ایسے تھے اور ایسے تھے ضرور بالضرور ان بتوں میں کچھ کمال ہوگا، ورنہ وہ احمق اور بے وقوف تو نہ تھے کہ ان کی پرستش کرتے اور ان کے نام مال ودولت لٹاتے۔

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ انسان کی تعظیم وتعریف اور پکار اس کے عقیدے کے تابع ہوا کرتی ہے۔لہٰذا انسان کا ہر مطلوب فعل وعمل اس وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور توحید مانا جائے گا جبکہ اس کا محرّک عقیدۂ توحید ہو اور اس کا کوئی فعل وعمل اس وقت غیر اللہ کی عبادت اور اصطلاحی شرک ہوگا جب کہ اس کا محرّک عقیدۂ شرک یا مشرکین کی اندھی تقلید ہو۔

انسان کا ہر مطلوب عمل عبادت بن سکتا ہے

یہی وجہ تو ہے کہ اسلام نے دنیا والوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ ایمان اور عقیدۂ توحید کے بعد انسان کا ایک ایک لمحہ عبادتِ الٰہی بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی پوری زندگی میں دو باتوں کا خیال رکھے اور ان کا خوب اہتمام کرے۔

۱.... ایک یہ کہ اپنی زندگی کا ہر معاملہ اور ہر کام اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اختیار کرے۔

۲.... دوسری بات یہ ہے کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔

اگر ان دو باتوں کا اہتمام مؤمن کی زندگی میں آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی تاکیدی و ترغیبی احکامات تو کیا، بلکہ وہ تمام امور بھی جن کو دینِ اسلام میں مباح قرار دے دیا گیا ہے اور جن کو عام طور پر لوگ دنیا کے کام سمجھتے ہیں مثلاً کھانا، پینا تجارت، زراعت، صنعت و حرفت سب کے سب دین اور عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں جن پر انسان کو اجر و ثواب ملے گا۔

اس طرح عبادت کا مفہوم وہ تنگ مفہوم نہیں رہتا جو عام طور پر نماز، روزہ وغیرہ میں منحصر ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ اسلام کی رو سے عبادت کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ وہ انسان کی تمام زندگی پر احاطہ کرلیتا ہے۔ اب اس کے متعلق قرآن و حدیث سے چند مثالیں پڑھ لیجیے:

۱.... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾

”اے ایمان والو! جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں (کھانے پینے کے لیے) عطا کی ہیں ان میں سے (جو چاہو بے تکلّف) کھاؤ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اگر تم صرف اسی کی عبادت کرنے والے ہو“۔ (البقرہ:۱۷۲)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تعلیم فرمایا ہے اس میں یہ بات بھی بتلائی کہ پاک، ستھری چیزوں کو حلال اور جائز طریقے سے حاصل کرنا ان کو اللہ تعالیٰ کا فضل و نعمت سمجھ کر کھانا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا افضل ترین عبادت اور اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

۲.... حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ

”پوری سچائی اور امانت داری کے ساتھ کاروبار کرنے والا تاجر نبیوں اور صدیقوں اور شہدا کے ساتھ ہو گا“۔ (دارمی، ترمذی)

٣.... حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَامِنْ مُسْلِمٍ يَغْرِسُ غَرْسًا اَوْ يَزْرَعُ زَرْعًا فَيَاْكُلُ مِنْهُ طَيْرٌ اَوْ اِنْسَانٌ اَوْ بَهِيْمَةٌ اِلَّا كَانَ لَهٗ بِهٖ صَدَقَةٌ

"جو کوئی مسلمان درخت کا پودا لگائے یا فصل بوئے پھر اس میں سے پرندے کھائیں یا آدمی یا کوئی جانور کھائے تو وہ اس کے حق میں صدقہ ہو گا"۔(بخاری و مسلم)

٤.... حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا اَحَبَّ عَبْدٌ عَبْدًا لِلّٰهِ اِلَّا اَكْرَمَ رَبَّهٗ عَزَّ وَجَلَّ

"جس بندے نے بھی اللہ تعالیٰ کے لیے کسی بندے سے محبت کی اس نے اپنے رب عز و جل ہی کی تکریم و عظمت کی"۔(مسند احمد)

یعنی کسی بندے کا کسی دوسرے بندے سے اللہ تعالیٰ اور اس کے تعلق کی بنیاد پر محبت کرنا دراصل اللہ تعالیٰ کی عظمت و توقیر کرنا ہے۔ نیز حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَ الْبُغْضُ فِي اللّٰهِ

"بندوں کے اعمال میں سے اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اللہ تعالیٰ کے لیے محبت اور اللہ تعالیٰ کے لیے بغض رکھنا ہے"۔ (ابو داؤد، احمد)

٥.... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلسَّاعِيْ عَلَى الْاَرْمَلَةِ وَالْمِسْكِيْنِ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ كَالْقَائِمِ لَا يَفْتُرُ وَكَالصَّائِمِ لَا يُفْطِرُ

"کسی بیوہ اور بے سہارا عورت یا کسی مسکین (اور حاجت مند) آدمی کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (اجر و ثواب میں) اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کرنے والے شخص جیسا ہے۔ اور راوی کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا کہ یہ شخص اس شخص کی طرح ہے جو ساری رات کھڑا رہ کر مسلسل اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہو اور تھکتا نہ ہو اور جو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو، کبھی ناغہ نہ کرتا ہو"۔(بخاری و مسلم)

٦.... حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ مَسَحَ رَأْسَ يَتِيْمٍ لَمْ يَمْسَحْهُ اِلَّا لِلّٰهِ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ شَعْرَةٍ مَرَّتْ عَلَيْهَا يَدُهٗ حَسَنَاتٌ وَمَنْ اَحْسَنَ اِلٰى يَتِيْمَةٍ اَوْ يَتِيْمٍ عِنْدَهٗ كُنْتُ اَنَا وَهُوَ فِي الْجَنَّةِ كَهَاتَيْنِ وَقَرَنَ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ

”جو شخص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے یتیم (بچے یا بچی) کے سر پر (شفقت و مہربانی کی وجہ سے) ہاتھ پھیرے تو اس کے لیے ہر بال کے عوض جس پر اس کا ہاتھ پھرا ہے نیکیاں لکھی جاتی ہیں اور جو شخص اسی یتیم لڑکی یا یتیم لڑکے کے ساتھ جو اس کی پرورش اور تربیت میں ہو اچھا سلوک کرتا ہے تو وہ شخص اور میں جنت میں اس طرح (ایک دوسرے کے قریب) ہوں گے اور (یہ کہہ کر) آپ ﷺ نے دونوں انگلیاں (یعنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی) کو ملا کر دکھایا (کہ اس طرح ایک دوسرے کے قریب ہوں گے)“۔ (احمد و ترمذی قال الترمذی ھذا حدیث غریب)

۷.... حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ (یعنی عقبہ بن عمرہ بدری رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَهْلِهٖ وَهُوَ يَحْتَسِبُهَا كَانَتْ لَهٗ صَدَقَةٌ

”جب کوئی مسلمان اپنی بیوی پر کچھ نان نفقہ اللہ تعالیٰ کی رضا و ثواب کے لیے خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ (باعثِ اجر و ثواب) ہو جاتا ہے“۔ (بخاری و مسلم)

۸.... حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ کیا میں تمہیں روزہ اور نماز اور صدقہ سے بھی افضل درجہ کی چیز نہ بتلاؤں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ارشاد فرمایئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَيْنِ

”وہ آپس میں اصلاح اور آپس کے تعلقات کو درست کرنا ہے“۔ (ابو داؤد)

اس حدیث نے یہ بات بتلائی کہ مسلمانوں کے درمیان بغض و فساد کے اسباب کو دور کرنا اور آپس کے تعلقات کو درست کر کے بگاڑ کو ختم کرنا ایسی عبادت ہے جس کا درجہ نماز، روزہ اور زکوٰۃ سے بھی بڑھ کر ہے۔ ①

۹.... حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے:

اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ

”مؤمن شخص اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتا ہو اور دن کو ہمیشہ روزہ رکھتا ہو“۔ (ابو داؤد)

۱۰.... ایک حدیث میں یہ بھی آیا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ کیا جانوروں (کو

---

① اسلام میں کونسا عمل افضل ہے؟ اس کی تفصیل بندہ کی کتاب ”مسلک اعتدال“ میں ملاحظہ فرمائیں۔

کھلانے پلانے) میں بھی ثواب ہے؟ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ رَطْبَةٍ اَجْرٌ

"بلاشبہ ہر زندہ جانور (کے کھلانے پلانے اور اس پر رحم کھانے) میں ثواب ہے"۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ جو شخص اپنی نفسانی خواہش جائز طور پر پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب ہے، اس پر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ کیا کوئی اپنی نفسانی خواہش پوری کرتا ہے پھر بھی اس میں اس کے لیے اجر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

أَرَأَیْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِیْ حَرَامٍ أَکَانَ عَلَیْهِ فِیْهَا وِزْرٌ فَکَذٰلِكَ إِذَا وَضَعَهَا فِی الْحَلَالِ کَانَ لَهٗ اَجْرٌ

"بتلاؤ اگر وہ حرام طریقہ سے اپنی شہوت پوری کرتا تو کیا اسے گناہ ملتا یا نہیں (ظاہر ہے کہ یقیناً اسے گناہ ملتا) پس اسی طرح جب وہ حلال ذریعہ سے شہوت کو پورا کرتا ہے تو اس کے لیے اجر و ثواب ہے"۔ (مسلم کتاب الزکوٰۃ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص جائز و ناجائز کی تمیز کرتا ہے اور جائز راستہ کو اختیار کرکے ناجائز سے بچنے کا قصد کرتا ہے وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے خوفزدہ اور رضائے الٰہی کا طلب گار ہوتا ہے، نیز اس سے بیوی کے حق کی ادائیگی ہوتی ہے اس لیے اس پر اجر و ثواب ملتا ہے، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ تصریح بھی موجود ہے کہ شر و برائی سے اپنے آپ کو روکنا یہ ایک مسلمان کے لیے صدقہ (اور اجر و ثواب کا باعث) بن جاتا ہے۔

قَالَ فَلْیُمْسِكْ عَنِ الشَّرِّ فَإِنَّهٗ لَهٗ صَدَقَةٌ (بخاری و مسلم)

یہ چند مثالیں ذکر کی گئیں جن سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ انسان اگر ایمان کے بعد مذکورہ دو چیزوں کا اہتمام کرے تو وہ دنیا میں رہ کر اور دنیا کی چیزوں سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھی اپنی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی میں گزار سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جس مقصد یعنی اپنی بندگی کے لیے پیدا فرمایا ہے وہ اس میں کمال حاصل کرسکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ان دو چیزوں یا ان میں سے کسی ایک چیز کا لحاظ نہیں رکھتا تو پھر یہ دنیاوی معاملات تو کیا اس کے دینی کام بھی دنیا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جاتے ہیں۔

روزہ، نماز اگرچہ عبادات ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے خلاف ہوں تو ان کا شمار اس وقت عبادت میں نہ ہوگا مثلاً کوئی عورت حیض کی حالت میں نماز پڑھتی ہے یا روزہ رکھتی ہے یا کوئی مرد بے وضو نماز پڑھتا ہے یا نماز کی ایک رکعت میں تین سجدے کرتا ہے یا صبح کے دو فرضوں کے بجائے چار رکعت پڑھتا ہے یا باوجود علم کے مکروہ اوقات میں نفل پڑھتا ہے یا عید کے دن روزہ رکھتا ہے۔

اسی طرح انسان کا جو عمل بھی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے ماتحت نہیں یا یوں کہیے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے متصادم ہو تو ایسی صورت میں اگرچہ اس کے اس عمل کو لغوی اعتبار سے عبادت کہا جاتا ہے لیکن دینِ اسلام کی رو سے اس کا شمار عبادت میں نہیں ہو گا، بلکہ مخالفت اور نافرمانی کی نوعیت کے مطابق اس کو گناہ و سزا ہو گی۔

اسی طرح اگر انسان دینی کام عین قرآن و سنت کے مطابق کرتا ہے اس کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعلیم سے ذرہ برابر متصادم نہیں، لیکن اس سے مقصد ریاکاری اور اپنی نمائش ہے تو ایسی صورت میں اگرچہ ان اعمال کا ڈھانچہ تو عبادت کا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے اندر خدا پرستی کے بجائے خود نمائی اور خود پرستی کی روح دوڑ رہی ہوتی ہے ایسے اعمال کا اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی وزن نہیں، بلکہ یہ اعمال بدبودار اور موجب سزا ہیں۔

یہاں اس کے متعلق بھی قرآن و حدیث سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱.... وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

"اور وہ لوگ (بھی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہیں) جو اپنے مال محض لوگوں کے دکھانے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور (دیکھو کہ) شیطان جس کا ساتھی ہوا تو وہ بہت ہی برا ساتھی ہے"۔(النساء:۳۸)

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو شخص بظاہر کوئی اچھا کام صدقہ و خیرات کرتا ہو لیکن اس سے مقصد اپنی نمائش ہو تو ایسا شخص شیطان کا ساتھی ہے۔

۲.... يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

"اے ایمان والو! احسان جتلا کر اور (سائل کو طعن دے کر یا احسان جتلا کر وغیرہ طریقوں سے) ایذاء دے کر اپنی خیرات کو اس شخص کی طرح باطل مت کرو جو اپنا مال لوگوں کو دکھلانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا"۔(البقرہ:۲۶۴)

۳.... حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرماتے تھے:

مَنْ صَلّٰى يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ

”جس نے لوگوں کو دکھلانے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے دکھلاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ خیرات کیا اس نے شرک کیا“۔ (مسند احمد)

۴.... حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا کی دولت حلال طریقے سے اس مقصد کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے تا کہ دوسروں سے سوال کرنا نہ پڑے اور اپنے اہل و عیال کے لیے روزی یا ضروریاتِ زندگی اور سامانِ راحت مہیا کرے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بھی احسان اور مہربانی کر سکے تو وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس شان کے ساتھ حاضر ہوگا: وَوَجْهُهُ مِثْلُ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ ”کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا“۔ اور جو شخص دنیا کی دولت کو حرام اور ناجائز ذریعہ سے تو کیا، بلکہ اگر حلال ذریعہ سے (بھی) اس مقصد کے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ بہت بڑا مال دار ہو جائے (اور اس دولت مندی کی وجہ سے وہ دوسروں پر) فخر کرے اور لوگوں کی نظر میں بڑا بننے کے لیے داد و دہش اور نام نمود کر سکے تو قیامت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایسی حالت میں حاضر ہوگا: وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ ”کہ اللہ تعالیٰ اس پر سخت غضب ناک ہوں گے“۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ مسلمان کا ہر وہ قول و عمل اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے جس میں دو باتوں کا خیال رکھا جائے ایک یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے ماتحت ہو، دوسری بات یہ کہ اس کا محرّک اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کے حکم کی اطاعت کا جذبہ ہو۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی دل و جان سے اطاعت کرنا اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی بندگی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور احکامات کی دو قسمیں ہیں ان میں ایک قسم کا تعلق مخلوق کے ساتھ بھی ہے اور دوسری قسم کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے۔

پہلی قسم کے تحت اخلاقیات، معاملات، معاشرت، حقوق العباد وغیرہ آتے ہیں اور دوسری قسم کے تحت نماز، روزہ، ذکر و اذکار اور استعانت وغیرہ آجاتے ہیں جیسا کہ اس کا مختصر تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

عبدیت یعنی بندگی اور عباداتِ مخصوصہ میں فرق

عبدیت و بندگی اور عباداتِ مخصوصہ میں فرق یہ ہے کہ بندگی کا تعلق زندگی کے تمام امور سے ہے کہ ان تمام امور کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ادا کیا جائے یا بالفاظ دیگر اپنی تمام زندگی کے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، اس کی ایک خاص شکل اور ایک خاص قسم عبادات ہیں جو پوری زندگی کے امور میں اطاعت الٰہی

کی بنیاد ہیں اور یہی پورے دین کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اگر ان سے غفلت برتی جائے تو دینِ اسلام کی پوری عمارت بے بنیاد ہو کر دھڑام سے گر جاتی ہے۔

عبادات

عبادات سے مراد خاص و مشروع اعمال ہیں جن کے ذریعے ایک بندہ اپنے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، اس کی عظمت، محبت و کبریائی، توحید و یکتائی اور اس کے سامنے عجز و انکساری اور بندگی کا اظہار اپنے قول و عمل سے کرتا ہے۔ یہ وہ افعال و اعمال ہیں جو تعظیمِ مطلق کی علامت ہوتے ہیں مثلاً دعا، نماز، روزہ، حج و قربانی، تسبیح و تہلیل و استغفار وغیرہ جیسے مشروع اعمال و اذکار۔ یہی وہ افعال و اعمال ہیں جن کو شریعت کی خاص اصطلاح میں "عبادات" کہا جاتا ہے۔

دینِ اسلام میں عبادات کی امتیازی شان

۱.... ان کا پہلا امتیاز تو یہی ہے کہ یہ تعظیمِ مطلق کی علامت ہیں، کیونکہ بندے اور اللہ تعالیٰ کے تعلق کا جتنا مظاہرہ ان اعمال کی وجہ سے ہوتا ہے دینِ اسلام کے دوسرے امور سے اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔

۲.... عبادات کا تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، یعنی عمل کا ظاہری رخ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اس لیے کہ ویسے تو دینِ اسلام کے سارے احکام اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں کیونکہ حقوق العباد اور زندگی کے تمام تر معاملات میں حسن و خوبی اور احسان کے احکامات بھی تو اللہ تعالیٰ ہی نے دے دیے ہیں، لیکن حقوق العباد وغیرہ کا تعلق مخلوق سے بھی ہوتا ہے مثلاً اخلاق و معاملات، سیاست، تعلیم و تعلّم، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ ان سب اعمال کا ظاہری رخ انسانوں اور مخلوق کی طرف ہوتا ہے جبکہ عبادات کا تعلق اور ان کا ظاہری رخ بھی براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اس لیے ان سے انسان کے تزکیہ کے لیے اس کے دل کی کھیتی تیار ہوتی ہے۔

۳.... انسان کی روحانی اور ملکوتی پہلو کی درستی، اس کی نشو و نما اور ترقی عبادات سے ہی ہوتی ہے۔ عبادات ملاء اعلیٰ سے رابطہ و مناسبت پیدا کرنے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہونے کے لیے ایک خاص ذریعہ ہیں، ان سے انسان کے اندر صبر، شکر، رحم و کرم اور دیانت داری جیسے جذبات و اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔ عبادات کے علاوہ دین کے دوسرے احکام کی تعمیل میں بھی اگرچہ اجر و ثواب ہے، بلکہ موقع و محل کی ضرورت یا بعض پہلوؤں سے دین کے بعض دوسرے شعبوں کی شعبۂ عبادات سے بھی زیادہ اہمیت ہے لیکن اللہ تعالیٰ سے وابستگی اور ملاء اعلیٰ سے مناسبت پیدا کرنے کی جو تاثیر اور انسان کی روحانی، ملکوتی اور اخلاقی پہلو کی ترقی و تکمیل میں جو خاصیت عبادات کو

حاصل ہے وہ دوسرے اعمال میں نہیں۔

اس لیے عبادات اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے بمنزلہ اصل اور سرچشمہ ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ سے وابستگی نصیب ہوتی ہے تو پھر انسان اللہ تعالیٰ کے ان تمام احکامات کو جو اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اور اس کی خوشنودی کے لیے سرانجام دیتا ہے، ورنہ اگر نماز اور ذکر و اذکار میں کمی و کمزوری آجائے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں کمی اور کمزوری آجائے گی اور اس کمی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکامات کی تعمیل اور ان میں اخلاص وللّٰہیت کی کمی واقع ہوگی اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نماز کے متعلق فرماتے ہیں:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ أَضَاعُواْ ٱلصَّلَوٰةَ وَٱتَّبَعُواْ ٱلشَّهَوَٰتِۖ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

”ان (نبیوں) کے بعد ایسے ناخلف ان کے جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشاتِ نفسانیہ کے پیچھے پڑ گئے پس عنقریب وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں گے“۔ (مریم:۵۹)

اس آیتِ کریمہ میں یہ بتلایا کہ پچھلے تمام انبیا علیہم السلام کی امتوں کا بگاڑ نماز کو خراب کرنے سے شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز اور ذکر و اذکار کے ذریعے مؤمن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی پوری بندگی پر جم جانا نصیب رہتا ہے لیکن جب کوئی شخص نماز کو ضائع کر دے یا اس کی حقیقت کو ضائع کر دے تو نماز کی خرابی کی وجہ سے دل اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل رہتا ہے اور یہ غفلت جس قدر بڑھتی چلی جاتی ہے خواہشِ نفس کی بندگی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے اخلاق اور معاملات کا ہر گوشہ بے روح اور احکامِ الٰہی کے بجائے اپنی خواہش نفس کی راہوں پر پڑ جاتا ہے اور بالآخر گمراہی کے ہولناک اندھیروں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات میں بہت زیادہ زور اور بہت زیادہ سختی اور پابندی نماز اور ذکر و اذکار پر لگائی ہے کہ یہی انسانوں کی پوری زندگی کے لیے عملی اصول اور بمنزلہ روح کے ثابت ہوجاتے ہیں اور اس لیے یہ ارکانِ اسلام اور فرائض اسلام کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں یا واجب، سنت اور مستحبات کے نام سے۔

عبادات کا اصل مقصد اور اصل فائدہ

عبادات کے مذکورہ بالا امتیازات کو سامنے رکھ کر ان لوگوں کی غلطی واضح ہوجاتی ہے جو عبادات میں صرف

دنیاوی فائدے اور مصلحتیں تلاش کرتے ہیں اور یہی مادی فائدے اور مصلحتیں ان کا اصل مقصد قرار دیتے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فلاں عبادت میں جسمانی ورزش ہے، وقت کی پابندی اور امیر کی اطاعت کی تعلیم ہے یا فلاں عبادت کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ اس سے قوم میں نظم وضبط پیدا ہوتا ہے حالانکہ عبادات کا اصل مقصد اور اصل فائدہ مادی وجسمانی اور دنیاوی نہیں، بلکہ ان سے اصل مقصد اور ان کا اصل فائدہ عالم محسوسات سے ماوراء ہے جیسا کہ اس کا بیان "عبادات کے امتیازات" میں گزر چکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عبادات میں بہت سے فائدے موجود ہیں اور ان میں بعض ہمیں نظر بھی آرہے ہیں، لیکن یہ ان کے اصل مقاصد اور اصل فائدے نہیں، بلکہ ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہا جائے گا کہ یہ ان عبادات کے وہ فوائد وبرکات ہیں جو ہمیں بھی نظر آتے ہیں باقی عبادات کے اصل فوائد اور ان کا اصل مقصد تو عالَم محسوسات سے ماوراہے۔

جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کی وجہ سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قُرب حاصل کرتا ہے، اس سے ایمان کی بیج اور ایمانی صفات کی آبیاری اور نشوونما ہوتی ہے، اس طرح ایک مؤمن اپنی روحانی اور ملکوتی پہلو کی نشوونما کرتا ہے اور اسے ترقی دیتا ہے اور اس روحانی ترقی اور اللہ تعالیٰ سے وابستگی کی برکت سے انسان کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی میں ڈھل جاتی ہے اور اس کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے ماتحت ہو جاتی ہے اور اس کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے لیے مخلوق پر رحم وکرم کی روح دوڑتی رہتی ہے اور آخرت میں اسی روحانی ترقی اور نیک اعمال کے بدلے اس کو انعاماتِ الٰہی جنت کی صورت میں ملتے ہیں اور اسی کے بقدر اور اسی مناسبت سے اس کی روز افزوں ابد الآباد تک ترقی جاری ہو کے رہے گی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ عبادات اور پوری بندگی سے اللہ تعالیٰ کو کوئی بھی فائدہ نہیں ہے، بلکہ بندگی کے تمام تر فائدے صرف اور صرف انسان کو ہی پہنچتے ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم وکرم سے ہمیں ان عبادات کا حکم دیا ہے اور اسی طرح دوسری تعلیمات وہدایات دے دیتے ہیں تاکہ ان کے ذریعے ہم ترقی کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شرک

یہ بات پہلے بتلائی گئی ہے کہ اصطلاح میں عبادت اسے کہتے ہیں کہ کسی ہستی کو اسباب ① کی حد سے ہٹ کر نفع ونقصان کا مالک مان کر اسے راضی کرنے، خوش کرنے اور اس کا تقرّب حاصل کرنے کے لیے انتہائی تعظیم و

① یعنی انسان کو اسباب کے حصول اور استعمال میں اختیار دیا گیا ہے نہ نفع ونقصان اور نہ اسباب کے استعمال کے انجام اور نتیجہ کہ وہ سب کچھ نتائج اللہ تعالیٰ کے قوانین کے مطابق نکلتے ہیں۔ مختار

محبت کے ساتھ اس کے سامنے انتہائی عاجزی وانکساری اور بندگی کا اظہار کیا جائے۔

اس تعریف کی رو سے ہر اختیاری فعل و عمل (خواہ کسی ہستی کی تعریف ہو یا تعظیم یا اس کے لیے کوئی اور فعل) صرف اس وقت عبادت سمجھا جائے گا جب کہ اس میں اس ہستی کے متعلق یہ اعتقاد بھی ہو کہ اسے دائرۂ اسباب سے بالاتر کوئی تسلُّط و تصرُّف اور اقتدار حاصل ہے جس کی بنا پر وہ نفع و نقصان پر قدرت رکھتا ہے۔

کیا ہر تعظیم و تعریف عبادت ہے؟

اگر کسی شخص کے کسی فعل میں یہ اعتقاد نہ رہے تو وہ فعل عبادت وغیرہ کی حد سے خارج ہو جاتا ہے مثلاً کسی شخص کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ کسی غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرے وغیرہ تو اس کو عبادت نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس کے عمل میں کوئی اعتقاد نہیں پایا جاتا، بلکہ وہ مجبور ہو کر صرف ظاہری طور پر کوئی تعظیمی کام بجا لاتا ہے۔ تو ایسا عقیدہ اور اس کے مطابق عمل دونوں توحید و اصطلاحی شرک کے درمیان امتیازی لکیر کھینچتے ہیں اور اس عقیدہ کی بنیاد پر جو عمل شرک بن جاتا ہے وہ ظاہر و باطن ہر لحاظ سے شرک ہی شرک ہوا کرتا ہے۔

شرکیہ عقیدہ کے بغیر بھی بعض اعمال شرک یا حرام و ممنوع ہیں

لیکن بعض افعال ایسے بھی ہیں جن کو اگر کوئی عقل و ہوش کے ساتھ کسی غیر اللہ کے لیے بجالائے تو یہ اس بات کا واضح ثبوت ہوتا ہے کہ اس کا یہ عمل عقیدۂ شرک یا کفر سے پھوٹا ہے اور یہ وہ تعظیمی افعال ہیں جو کہ محض اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔ سجدہ، طواف، نذر و نیاز دعا وغیرہ، یہ افعال اور اعمال کسی بھی غیر اللہ کے لیے نہ ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں اگر کوئی یہ افعال اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کے لیے اس کے سامنے کرتا ہے یا اس کے نام پر کرتا ہے تو وہ شخص بلاشبہ جرمِ عظیم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس باب میں سب سے پہلے دعا کو لے لیتے ہیں۔

دعا مانگنے کی وجہ

کسی ہستی سے دعائے حقیقی و استعانت اس وقت لی جاتی ہے جب اس کے متعلق یہ خیال ہو کہ اسے غیبی اقتدار و تسلُّط حاصل ہے یا مستقل طور پر اسے نفع و نقصان کے اختیارات مل چکے ہیں، نیز اس کو جہاں اور جس جگہ سے پکارا جائے وہ اس دعا و پکار کو سنتا ہے اور اس پکارنے والے مدد کو پہنچ سکتا ہے ورنہ اگر کسی ہستی کے متعلق یہ عقیدہ نہ رکھا جائے تو پھر وہ کون سا احمق ہے جو رات کے اندھیروں اور تنہائیوں میں کسی ہستی کی عبادت کرے گا اور اس سے دعا مانگے گا اور یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے مذکورہ بالا عقیدہ رکھنا اللہ تعالیٰ کی صفات یا اس کی صفات کے نفاذ یا بالفاظ دیگر اس کے اختیارات میں شرک ہے، البتہ اگر یہ عقیدہ نہ ہو، بلکہ کسی سے

ظاہری اسباب کے تحت کوئی مدد مانگی جائے تو نہ یہ حقیقی استعانت ہے اور نہ اس کے متعلق بحث کی جائے گی کیونکہ اس کا مفصّل بیان گزر چکا ہے، البتہ یہاں قرآن و حدیث سے چند نصوص پیش کرتے ہیں جن سے دعا کا عبادت، بلکہ اہم عبادت ہونا معلوم ہو جائے گا۔

دعا و استعانت عبادت ہے

دعا کے معنی ہیں عاجزی، سوال کرنا، مدد چاہنا، مصیبت و مشکل کے وقت میں پکارنا، بلانا اور مدد طلب کرنا۔ دعا عبادت، بلکہ عبادت کا مغز ہے۔[1] چنانچہ اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے اپنی قوم اور برادری سے فرمایا:

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰۤى اَلَّاۤ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾

”اور میں تمہیں بھی چھوڑتا ہوں اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا (حوائج و مصائب کے وقت) پکارتے ہو اور میں اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکار کر (یعنی دعا) کے نامراد نہ ہوں گا۔ پھر جب وہ (یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام) ان (مشرک لوگوں) سے اور ان کے (باطل) معبودوں سے بھی جن کی وہ لوگ عبادت کرتے تھے الگ ہو گئے تو ہم نے اسے اسحٰق (جیسا بیٹا) اور یعقوب (جیسا پوتا) عطا فرمایا اور (ان دونوں میں سے) ہر ایک کو نبی بنایا“۔(مریم:۴۸---۴۹)

مذکورہ بالا دو آیتوں میں سے پہلی آیت میں جو وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ”اور انہیں بھی جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو“ آیا ہے دوسری آیت میں اسی تَدْعُوْنَ کے بجائے وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ یعنی ”اور ان میں سے بھی جن کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے“ کے الفاظ استعمال کیے گئے جس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ دعا بھی عبادت ہے، اسی طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ دعا پر عبادت کا اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ دعا بہت ہی اہم عبادت ہے چنانچہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْۤ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿٦٠﴾

”اور تمہارے رب نے فرمایا ہے مجھ سے دعا مانگو (یعنی مجھے پکارو) میں تمہاری دعا قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری

---

[1] یاد رہے کہ دعا کرنا اور دعا کرانا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آئے گا۔

عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے"۔ (المؤمن:۶۰)

اس آیت کے پہلے حصے میں جس چیز کو دعا کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے اسی کو دوسرے حصے میں عبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا اور عبادت میں اصلاً کوئی فرق نہیں اس لیے بعض مفسرین بھی تَدۡعُوۡنَ اور اُدۡعُوۡا کی تفسیر دعا اور پکارنے کے بجائے عبادت سے کرتے ہیں۔

بلاشبہ عبادت اور دعا اگرچہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے دونوں جدا جدا ہیں مگر مصداق کے اعتبار سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں کیونکہ عبادت نام ہے کسی کے سامنے انتہائی درجہ کی عاجزی اور انکساری اختیار کرنے کا اور ظاہر ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرکے اس سے دعا مانگتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اسی کے سامنے گڑگڑاتا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل و کمتر اور عاجز سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، کبریائی اور عظمت کا اقرار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کمالِ بندگی کا اظہار کرتا ہے تو یہ اظہارِ بندگی خود عبادت، بلکہ خلاصۂ عبادت ہے شاید اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الۡعِبَادَةِ

"دعا عبادت کا مغز ہے" (ترمذی)

نیز حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلدُّعَاءُ هُوَ الۡعِبَادَةِ

"دعا ہی عبادت ہے"

اس کے بعد آپ ﷺ نے سند کے طور پر یہ آیت "وقال ربکم الخ" تلاوت فرمائی۔① (مشکوٰۃ کتاب الدعوات)

بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی کی غلامی اور بندگی اس لیے اختیار کی جاتی ہے کہ اس کو نفع و نقصان کا مالک مان کر اس سے امیدیں وابستہ کی جاتی ہیں، ورنہ جس سے یہ امید نہ ہو تو اس کی عبادت و بندگی اور غلامی کرنے کے کیا معنی؟ یہی امید ہی تو عبادت و بندگی کا اصل محرّک ہے۔

کسی مخلوق سے دعا کروانا کیوں شرک نہیں؟

دعا اگرچہ عبادت ہے اور کسی بھی غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے لیکن دوسروں سے دعا کی درخواست کرنا

① دعا کے فضائل و آداب ان شاء اللہ تعالیٰ "دعا کے بیان" میں آئیں گے۔

صرف جائز ہی نہیں، بلکہ مستحسن ہے، اس میں دعا اور حقیقی استعانت اللہ تعالیٰ سے ہی کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں یہ اختیار دیا ہے کہ ہم اپنے خالق و مالک اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجتیں بھی مانگیں اور دوسروں کے لیے بھی دعائیں کرتے رہیں۔

جو شخص کسی اور سے دعا کرواتا ہے تو وہ اسے نفع و نقصان کا مالک نہیں سمجھتا، بلکہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کا ایک محتاج بندہ سمجھ کر اس سے دعا کی درخواست کرتا ہے، صرف اتنی بات ہوتی ہے کہ جس شخص سے دعا کرائی جاتی ہے اس کے متعلق یہ گمان ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ فرمانبردار اور زیادہ نیکوکار ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے زیادہ آہ وزاری کرنے والا، زیادہ گڑگڑانے والا اور زیادہ توجہ اور حسن و خوبی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے والا ہے۔ یہ حسنِ ظن، نیک گمان، دوسرے مسلمان کو اپنے سے اچھا سمجھنا، اپنی کم مائیگی اور خطاکاری کا احساس اور تواضع وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو محبوب اور پسند ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مہربانی کو کھینچتی ہیں، یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ دعا کرنے والے کے ہاتھ میں نہ نفع ہے اور نہ نقصان، ورنہ پھر دعا کرنے والے سے یہ کہنا بے سود ہوتا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے فلاں چیز مانگیں۔

بہر حال جو شخص کسی دوسرے شخص سے دعا کی درخواست کرتا ہے تو اس کی وجہ اس کا دوسروں کے ساتھ حسنِ ظن اور تواضُع و انکساری ہوتی ہے یا وہ صرف اس لیے دعا کی درخواست کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مسلمان کی دعا دوسرے مسلمان کے حق میں قبول فرماتا ہے۔

بلاشبہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائیوں اور رشتہ داروں کے لیے دعائیں مانگتا ہے تو یہ باہمی ہمدردی اور خیر خواہی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس سے آپس میں محبت واُلفت بڑھتی ہے اور اللہ تعالیٰ ایک مسلمان کی دعا دوسرے مسلمان کے حق میں زیادہ قبول فرماتے ہیں اس لیے شریعتِ مطہّرہ میں دوسروں سے دعا کی درخواست کو بھی صرف جائز نہیں، بلکہ مستحسن قرار دیا گیا ہے۔

دوسروں کے لیے از خود اپنی طرف سے دعائیں کرنا، اس سے تو کتاب اللہ قرآن مجید اور کتبِ احادیث بھری ہوئی ہیں اور کسی سے دعا کروانے میں بھی اگرچہ کسی مسلمان کو اختلاف نہیں ہو سکتا، لیکن پھر بھی بطورِ نمونہ یہاں قرآن و حدیث میں سے کچھ نقل کرکے پیش کرتا ہوں:

ا.... وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِـيْمًا ۝

”اور ہم نے (کبھی) کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور جب یہ لوگ (نافرمانی کر کے) اپنے نفسوں پر ظلم کر بیٹھے تو اگر تیرے پاس آتے اور وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے اور اللہ تعالیٰ کے رسول بھی (اپنا حق معاف کر کے) ان کے لیے (اللہ تعالیٰ سے) معافی کی درخواست کرتے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پاتے“۔ (النساء:٦٤)

٢.... والدین کے لیے دعا کرنے کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے یوں دعائیں کریں:

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا

”اے میرے پروردگار! ان دونوں (میرے والدین) پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا“۔ (الاسراء:٢٤)

٣.... ایک طویل حدیث میں آیا ہے کہ قحط سالی کے زمانہ میں ایک مرتبہ خطبہ کے وقت ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں دعا کی درخواست کی:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ هَلَكَ الْمَالُ وَجَاعَ الْعِيَالُ فَادْعُ اللّٰهَ لَنَا

”یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے مال (واسباب یعنی کھیتی باڑی مویشی اور باغات پانی نہ ملنے کی وجہ سے) برباد ہو گئے اور اہل وعیال بھوکے ہیں اللہ تعالیٰ سے ہمارے لیے دعا کریں..... تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (یہ سنتے ہی) اللہ تعالیٰ سے بارش کی دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے مسلسل دوسرے جمعے تک بارش نازل فرمائی اور پھر خطبہ کے دوران اسی صحابی یا کسی دوسرے صحابی نے کھڑے ہو کر یہ درخواست کی:

يَارَسُوْلَ اللّٰهِ تَهَدَّمَ الْبِنَاءُ وَغَرِقَ الْمَالُ فَادْعُ اللّٰهَ لَنَا

”اے اللہ کے رسول! مکان گر رہے ہیں اور مال واسباب ڈوب رہے ہیں، آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں (کہ بارش تھم جائے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا وَلَا عَلَيْنَا

”اے اللہ! ہمارے اردگرد (اطراف میں جہاں بارش کی ضرورت ہو) میں بارش ہو اور ہمارے اوپر نہ برسا (اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بارش تھم گئی)“۔ (پوری تفصیل کے لیے دیکھیے صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہ)

٤.... حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چند کھجوریں لے کر آیا اور عرض کیا ادع اللہ فیھن ”یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے ان کھجوروں میں (برکت کی) دعا کیجیے“۔ تو ان کھجوروں کو

آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر میرے لیے ان کھجوروں میں برکت کی دعا کی اور اس کے بعد فرمایا کہ لو اور ان کھجوروں کو اپنے توشہ دان میں رکھو جب تم ان میں سے کچھ لینا چاہو تو توشہ دان میں ہاتھ ڈال لو اور نکال لو اور اس توشہ دان کو جھاڑ کر کبھی خالی نہ کرنا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ان کھجوروں کو توشہ دان میں رکھ لیا اور پھر ان چند کھجوروں میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اتنی برکت آئی کہ میں نے اس توشہ دان سے نکال نکال کر اتنے وسق کھجوریں تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دیں اور ہم (بھی) ان کھجوروں سے کھاتے رہتے تھے اور وہ توشہ دان میری کمر (پر باندھا رہتا تھا اور وہ بلا ضرورت میری کمر) سے کسی وقت جدا نہ ہوتا تھا، یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے شہید ہونے کے دن وہ توشہ دان میری کمر سے کھل کر گر پڑا (اور ضائع ہو گیا)۔ (ترمذی)

۵.... حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں نے عمرہ کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے مجھے اجازت عطا فرمائی اور ساتھ میں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

اَیْ اُخَیَّ فِیْ دُعَاءِكَ اَشْرِكْنَا وَلَا تَنْسَنَا

"اے میرے چھوٹے بھائی اپنی دعا میں ہمیں بھی شریک کر لینا اور ہم کو (دعا کے وقت) نہ بھول جانا"۔ (ترمذی، ابوداؤد)

کسی شخصیت کے توسُّل سے دعا

بہتر تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کے توسُّل سے دعا مانگی جائے لیکن اپنے نیک اعمال کے توسُّل سے دعا مانگنا بھی بالاتفاق جائز ہے۔ اور کسی شخصیت پر توسُّل کرنے کے وقت اگر یہ سمجھا جاتا ہو کہ اس طرح توسُّل کرنے سے اللہ تعالیٰ کے ذمہ یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور اس کی دعا کو قبول کرے گا یا یہ خیال کیا جائے کہ جس شخص کے ساتھ توسُّل کیا جاتا ہے اس کا اللہ تعالیٰ پر کوئی زور چلتا ہے تو اس طرح توسُّل کرنا بالاتفاق ناجائز ہے، کوئی مسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جو ایسا عقیدہ رکھے اور پھر اس عقیدہ کی بنیاد پر کسی شخصیت کے ساتھ توسُّل کرے۔

البتہ اگر کوئی کسی شخصیت پر اس عقیدے اور خیال کے بغیر توسُّل کرتا ہے مثلاً یوں کہتا ہے کہ یا اللہ! رسول اللہ ﷺ کے توسُّل یا طفیل میری فلاں حاجت پوری فرما۔ اور اس کا یہ مطلب ہو کہ "یا اللہ میرا کوئی عمل ایسا نہیں جو میں آپ کی بارگاہ میں پیش کر کے اس کے توسُّل اور ذریعے سے آپ سے کوئی سوال کروں، البتہ رسول اللہ

ﷺ کے ساتھ محبت وعقیدت ہے، اے اللہ! اس تعلق اور ان پر ایمان لانے کی لاج رکھ کر میری فلاں حاجت پوری فرما تو اس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں، کیونکہ اس طرح توسُّل دعا میں انتہائی عاجزی وانکساری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی اور جلال کے غلبہ کی بنا پر اس شخص کو نہ اپنا کوئی عمل نظر آرہا ہوتا ہے اور نہ اپنے اعمال کی کوئی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ایک محبت اور اس کی خاطر ایک خاص تعلق کا اظہار کرکے توسُّل کرتا ہے۔

اس صورت میں بندہ دراصل اللہ تعالیٰ ہی کے تعلق ومحبت اور اس پر ایمان لانے کے توسُّل سے دعا مانگ رہا ہوتا ہے اس لیے ایسا توسُّل سراسر توحید اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی وانکساری کا اظہار ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ توسُّل بالاتفاق جائز، بلکہ مستحسن ہے چنانچہ حضرت حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کسی ذات کے ذریعے سوال کرنے کے مختلف معانی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فيحمل قول القائل أسئلك بنبيك محمد على أنه أراد أني بإيماني به و بمحبته و أتوسل إليك بإيماني به و محبته و نحو ذلك فقد ذكرتم أن هذا جائز بلا نزاع قيل من أراد هذا المعنى فهو في ذلك بلا نزاع و إذا حمل على هذا المعنى كلام من توسّل بالنبي ﷺ بعد مماته من السلف كما نقل عن بعض الصحابة و التابعين و عن الإمام احمد و غيره كان هذا حسنا و حينئذ فلا يكون في المسئلة نزاع، لكن كثيرا من العوام يطلقون هذا اللفظ و لا يريدون هذا المعنى فهؤلاء الذين أنكر عليهم من أنكر.

"اس قول کے کہنے والے "(اے اللہ!) میں تجھ سے تیرے نبی محمد ﷺ کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں" کو اس پر محمول کیا جائے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ (اے اللہ!) میں تجھ سے محمد ﷺ پر ایمان لانے اور ان کے ساتھ محبت کے وسیلہ سے سوال کرتا ہوں یا اسی طرح اور معنی مراد لیا جائے تو آپ کو یاد ہوگا کہ یہ بلا نزاع (یعنی بالاتفاق) جائز ہے اور کہا گیا ہے کہ جس کا یہی مقصد ہو تو وہ بلا نزاع صحیح ہے اور (اگر) اسی معنی پر ان اسلاف کے کلام کو محمول کیا جائے جنھوں نے آپ ﷺ کی وفات کے بعد بھی آپ ﷺ پر توسُّل کیا جیسا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم تابعین اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا گیا ہے تو یہ اچھا ہوگا اور ایسی حالت میں مسئلہ اختلافی نہیں رہتا، لیکن بہت سے عوام اس لفظ کو مطلق بولتے ہیں اور اس سے یہ معنی مراد نہیں لیتے، یہی لوگ ہیں جن پر انکار کرنے والوں نے انکار کیا ہے"۔ (قاعدہ جلیلۃ التوسل والوسیلۃ: ۶۲)

بندہ کے نزدیک حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہی صحیح معلوم ہوتی ہے، اسی میں ایمان و توحید کی حفاظت ہے اور انسان کی فکر خالص ہو سکتی ہے۔ اس مسئلہ کی پوری تفصیل کتاب "عقیدہ اور عقیدت" میں موجود ہے جسے شوق ہو وہ اسے ملاحظہ فرمائے۔

جن ہاتھوں سے مدد کی صورت نظر آتی ہے ان کو نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کو ہر حال میں پکارنا چاہیے

لوگوں کو بار بار یہ تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو کسی حاجت یا کسی مشکل و مصیبت میں پکارتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرماتے رہتے ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ رحیم و کریم کی عظیم الشان ذات اس سے کہیں بالا و برتر ہے کہ وہ خوذ (العیاذ باللہ) متشکّل ہو کر کسی کی مصیبت کو دور کرے، بلکہ یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی امداد مادی یا غیر مادی اسباب کے پردے میں ہی کی جاتی ہے مثلاً وہ فرشتے وغیرہ کو ایسے انسان کی صورت میں متشکل فرماتے ہیں جس سے پکارنے اور دعا کرنے والے کو اُلفت و محبت ہوتی ہے حالانکہ ایسی صورت میں اس شخصیت کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ میں فلاں کی مدد کر رہا ہوں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سچ مچ کوئی روحانی ہستی اس کی مدد کے لیے بھیج دی جاتی ہے یا کسی اور ذریعے سے نجات مل جاتی ہے۔ مگر یہاں آکر بعض لوگ یہ غلطی کرنے لگتے ہیں کہ پھر وہ تصرف کا مالک اسی مخلوق کو سمجھنے لگتے ہیں اور پھر اسی ہستی اور مخلوق (جس کے متعلق یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے مدد کی گئی تھی) کو اپنے مصائب و حوائج میں پکارا کرتے ہیں، حالانکہ حق تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو حقیقی حاجت روا جان کر صرف اسی کو اپنے حوائج و مصائب میں پکارتے۔ اس بات کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر کسی نے بادشاہ یا کسی دولت مند سے یہ درخواست کی کہ میں بہت ہی فقیر ہو چکا ہوں اس لیے میری کچھ مدد کیجیے! بادشاہ یا اس مال دار نے اپنے غلام و خادم سے کہہ دیا کہ اس کو اتنا مال دے دے، اور اس نے دے دیا۔ اب اس شخص کو تو یہ تجربہ ہو چکا کہ فلاں غلام یا خادم کے ہاتھوں مجھے اتنا مال بادشاہ یا فلاں مال دار کی طرف سے ملا ہے تو اس فقیر کی بڑی حماقت ہو گی اگر وہ پھر کچھ مانگنے کے لیے اسی خادم کو پکارے کہ آپ نے پہلے بھی مدد کی تھی اب بھی کیجیے۔ وہ غلام اس کو یہی کہے گا کہ میری کیا حیثیت میں پہلے جو کچھ دے چکا ہوں وہ تو بادشاہ ہی کا حکم تھا۔

مسلمانوں کو یہ تجربہ ہو چکا ہے اور ان کے سامنے یہ واقعہ آیا ہے کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دونوں کی مدد ایک مکڑی کے ذریعے کی گئی تھی کہ اس نے دہانۂ غار پر جالا تان دیا جس کی وجہ سے دشمن کی عقل پر پردے پڑ گئے اور انہوں نے غار میں جھانکنے کو بھی فضول سمجھا نیز بہت سے فرشتوں کے ذریعے جنگ بدر وغیرہ میں مسلمانوں کی مدد کی گئی اور حضرت خضر علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے گرتی ہوئی دیوار

کو ایک آن میں ٹھیک اور درست کیا۔ غرض جن جن مخلوقاتِ الٰہی کے بارے میں یہ تجربہ ہو چکا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کسی کی مدد ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پھر اس کو پکارا جائے۔ کیا اگر اب بھی کوئی دشمن سے کسی غار میں چھپ گیا یا کسی کے ساتھ لڑ رہا ہے یا کسی کی دیوار گر رہی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مکڑی، فرشتوں یا حضرت خضر علیہ السلام کو پکارے گا؟ ہرگز نہیں۔

بس حاجتوں اور مرادوں کو پورا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہیں، ہر مصیبت اور حاجت میں اسی کو پکارا جائے گا، پھر اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ وہ کسی فرشتے کے ذریعے سے مدد کرتے ہیں یا کسی روحانی ہستی سے یا کسی اور مخلوق کے ذریعے۔ یہ آپ کا اور ہمارا کام نہیں اسے وہ خوب جانتے ہیں اور وہی سب کچھ جاننے والا اور سننے والا ہے اور صرف وہی نفع و نقصان کا مالک ہے۔ یہ نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت و اختیار نہ کسی میں بالذات موجود ہے اور نہ اپنی جانب سے اللہ تعالیٰ نے کسی اور مخلوق کو یہ اختیار عطا کیا ہے۔

ہر ندائے غیب دعائے حقیقی اور استعانت نہیں ہوا کرتی

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ندائے غیب اور خطاب کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں اس لیے ہر نداء و پکار پر دعا اور حقیقی استعانت کے احکام جاری نہیں ہو سکتے اور نہ اس سے استدلال کرنا صحیح ہے۔ یہاں چند صورتوں کو نقل کرتے ہیں:

ا.... ندا و خطاب کی ایک صورت وہ ہے جو شاعروں اور عاشقوں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ایک شاعر اپنے محبوب کو (خواہ محض خیالی ہو یا حقیقی) یا ہواؤں اور پہاڑوں وغیرہ کو خطاب کرتا ہے، اسی طرح ایک عاشق اپنے محبوب کے ساتھ اپنے خیال ہی خیال میں باتیں کرتا ہے، وہ اپنے ان خیالات و جذبات کو الفاظ کا جامہ بھی پہناتا ہے وہ اس کی تعریفیں کرتا ہے، اس سے گلے شکوے کرتا ہے کہ ہجر اور جدائی کی اس مصیبت سے مجھے نکالو یا مجھ پر ترس کھاؤ اور رحم کرو وغیرہ حالانکہ وہ شاعر عاشق بھی اس بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کے محبوب، پہاڑ اور ہوائیں اس کی بات کو نہ تو سنتے ہیں اور نہ وہ ان کی باتوں کا جواب دے سکتے ہیں اور نہ اس کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔

۲.... دوسری قسم خطاب لکھنے والوں کی ہے۔ خط لکھنے والا اور مضمون لکھنے والا خط لکھتے وقت اور مضمون لکھتے وقت مخاطب کے صیغوں سے کام لیتا ہے اس لیے کہ وہ لوگ اگرچہ اس وقت وہاں حاضر نہیں ہوتے، مگر وہ اس کے ذہن میں حاضر ہوتے ہیں۔

۳.... تیسری قسم ندا و خطاب کی ان لوگوں کا ہے جو بعض ذرائع سے کسی اور کو اپنا پیغام بھجوانا چاہتے ہیں۔ مثلاً کوئی

مسافر اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو کیسٹ میں باتیں ریکارڈ کر کے بھیج دیتا ہے یا کوئی دور سے صرف اس لیے اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ کہتا ہے کہ اس کا خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتے مقرر فرمائے ہیں وہ اس صلوٰۃ وسلام کو انہی الفاظ میں آپ ﷺ پر پیش کر دیں گے تو اس میں عقیدے کی کوئی خرابی نہیں، البتہ لوگوں کے سامنے ایسا کہنا اور کسی مقدّس شخصیت کو محبت وغیرہ کی وجہ سے اس طرح پکارنا اس لیے درست نہیں کہ سننے والوں کے عقائد خراب ہو جاتے ہیں حالانکہ مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ توحید اور لوگوں کے عقائد کی حفاظت کریں۔ نیز یہ کہ یہ الفاظ شرکیہ ہے انہی الفاظ کے اندر شرک اپنے انڈے دیتا ہے اور بالآخر شرک کے لیے فضا ہموار ہو جاتی ہے۔

۴.... چوتھی صورت غائبانہ نداو خطاب کی غیر اختیاری اور جذباتی ہوا کرتی ہے مثلاً کوئی بچہ کہیں جاتا ہے یا مارا جاتا ہے بلکہ جوانوں اور بوڑھوں کو بھی دیکھا جاتا ہے کہ درد و تکلیف پہنچ جائے تو ہائے ابا! یا ہائے امی! کہہ کر چلاتے ہیں حالانکہ وہ اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ نہ یہاں ہمارا باپ ہے اور نہ ماں، لیکن وہ صرف ان کے جذبات ہوتے ہیں جو اس وقت بے اختیار ان کے منہ سے الفاظ بن کر نکل جاتے ہیں۔

۵.... پانچویں قسم خطاب اور ندائے غیب کی کسی واقعہ پر غم و افسوس اور حسرت کا اظہار ہوتا ہے یا زجر و توبیخ مراد ہوتی ہے۔ بعض لڑکے بچھو اور سانپ کو جب مارتے ہیں تو اس کو پتھروں وغیرہ سے خوب مار مار کر اس کو گالیاں دیتے ہیں اور اس کو کہتے ہیں کہ آپ کو پتہ چل جائے گا وغیرہ تو ایسی صورتوں میں ان لڑکوں کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ یہ مردہ سانپ، بچھو نہ ہماری باتوں کو سنتا ہے اور نہ اس کو اس سے کوئی فائدہ یا نقصان ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی کا بچہ مر جاتا ہے تو اس کی ماں وغیرہ رو کر بار بار اس کو خطاب کرتی ہے۔ حالانکہ کبھی بچہ چار پانچ دن کا ہوتا ہے جو کسی کی باتوں کو جانتا بھی نہیں تھا یا وہ قبرستان میں مدفون بھی ہوتا ہے لیکن اس کی ماں وغیرہ گھر میں بیٹھ کر اس کو پکارتی ہے خطاب کرتی ہے کہ میرے بیٹے تم ایسے تھے وغیرہ وغیرہ۔

۶.... ندائے خطاب کی چھٹی صورت یہ ہے کہ اس سے صرف وہاں موجود لوگوں کو نصیحت وغیرہ مقصود ہوا اور بس۔ اسی طرح ندائے غیب جو ایک شخص کسی مخلوق کو کرتا ہے اس کی اور بھی صورتیں ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام صورتوں میں ندائے غیب اور خطاب یا تو صرف اس لیے ہوتا ہے کہ مخاطب کو ذہن میں حاضر کر کے اس سے بات کی جاتی ہے یا اپنے جذبات کا عکس الفاظ میں اتارا جاتا ہے یا مراد صرف زجر و توبیخ ہوا کرتی ہے یا پھر دوسروں کو نصیحت یا اسی طرح اور کوئی مقصد ہوتا ہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو ندائے غائب اور استعانت میں داخل نہیں

ہو سکتیں، کیونکہ ایسی صورتوں میں کسی کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہوتا ہے کہ میرا مخاطب حاضر وناظر ہے یا جہاں سے میں اس کو پکاروں وہ بلا کسی اسباب کے سن سکتا ہے یا وہ میری پکار کو سن کر میری کوئی مدد کر سکتا ہے، بلکہ ان صورتوں میں جو تخاطب اور باتیں کرتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ صرف اس کے جذبات اور خیالات ہوتے ہیں اس کا خطاب بھی خیالی ہوتا ہے اور استمداد بھی خیالی جن کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔

اس لیے اس کو ندائے غائب اور خطاب غائب کا مسئلہ بنانا کسی طرح درست نہیں اور نہ یہ کہ اگر ایسا خطاب کسی صادق زبان پر پایا جائے تو اس سے استدلال کیا جائے اور اس کو بنیاد بنا کر مخلوق سے استعانت کے لیے ندا کی جائے یا اس طرح کی نداؤں کے لیے جواز ڈھونڈ لیا جائے۔ اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

۱.... حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ (سے نکلتے وقت مکہ مکرمہ) کو (خطاب کرکے) فرمایا:

مَا اَطْيَبَكِ مِنْ بَلَدٍ وَاَحَبَّكِ اِلَیَّ وَلَوْلَا اَنَّ قَوْمِیْ اَخْرَجُوْنِیْ مِنْكِ مَا سَكَنْتُ غَيْرَكِ

"(اے مکہ) تو کتنا ہی اچھا ہے اور تو مجھے بہت ہی پیارا ہے اگر میری قوم مجھے یہاں سے نہ نکالتی تو میں اس شہر کے علاوہ کہیں نہ رہتا"۔ (ترمذی، مشکوۃ)

۲.... اور حضرت عبد اللہ بن عدی بن حمراء رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے مکہ معظمہ سے نکلتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام حزورہ پر کھڑے ہوئے دیکھا (کہ مکہ مکرمہ کو مخاطب کرکے یوں) فرما رہے تھے:

وَاللّٰهِ اِنَّكِ لَخَيْرُ اَرْضِ اللّٰهِ وَاَحَبُّ اَرْضِ اللّٰهِ اِلَى اللّٰهِ وَلَوْلَا اِنِّیْ اُخْرِجْتُ مِنْكِ مَا خَرَجْتُ

"(اے مکہ) اللہ تعالیٰ کی قسم تو اللہ تعالیٰ کی زمین میں سب سے بہتر قطعہ ہے اور تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی زمین کا سب سے محبوب حصہ ہے اگر مجھے تجھ سے نہ نکالا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا"۔ (ترمذی وابن ماجہ، مشکوۃ)

۳.... ایک مرتبہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک باغ میں تشریف لے گئے اور کسی پرندے کو درخت پر بیٹھے ہوئے دیکھا اور (ٹھنڈی سانس لے کر چڑیا کو مخاطب ہو کر یوں) فرمایا:

واللہ انی لو ددت انی مثلك تقع علی الشجر و تا کل من الثمر ثم تطير و ليس عليك حساب ولا عذاب

"تم بڑی خوش نصیب ہو اللہ تعالیٰ کی قسم میں اس کو پسند کرتا ہوں کہ میں بھی تیرے جیسا ہوتا تو (جس) درخت (پر چاہے) بیٹھتی ہے اور اس کا پھل کھاتی ہے پھر اڑ جاتی ہے تجھ سے (کل قیامت میں اس کی) نہ کوئی باز پرس ہے

اور نہ کوئی عذاب"۔ (ازالۃ الخفاء بحوالہ ابن ابی شیبہ)

یہ خطاب چڑیوں کو اس لیے نہیں تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ خیال تھا کہ چڑیاں ان کی باتوں کو سمجھتی ہے اور وہ جواب دیں گی، بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر قیامت کی فکر سوار تھی اس لیے وہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ چڑیاں کیسی خوش نصیب مخلوق ہیں جن سے زندگی اور اس کے کھانے پینے وغیرہ کا حساب و کتاب نہ ہو گا اور ہمیں تو ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہو گا۔

۴.... حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی نئے مہینے کا چاند دیکھتے تو اس طرح دعا کرتے:

اَللّٰهُمَّ اَهِلَّهٗ عَلَيْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِيْمَانِ وَالسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّيْ وَرَبُّكَ اللّٰهُ

"اے اللہ! یہ چاند ہمارے لیے امن و ایمان و سلامتی اور اسلام کا چاند ہو (پھر چاند کو مخاطب ہو کر فرماتے تھے) اے چاند! تیرا پروردگار اور میرا پروردگار اللہ ہے"۔ (حصن حصین بحوالہ ترمذی، دارمی وابن حبان)

مذکورہ بالا حدیثوں میں مکہ مکرمہ سے خطاب ہے جس میں مکہ مکرمہ سے محبت کا اظہار اور مکہ مکرمہ کا اللہ تعالیٰ کی محبوب اور پسندیدہ جگہ ہونے کی تعلیم وہدایت ہے اور چاند کے متعلق چونکہ بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کوئی خدا یا کوئی دیوتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب چاند کو دیکھ کر دعا کرتے تو اپنی دعا میں اس بات کا اعلان کرتے کہ چاند اللہ تعالیٰ کی صرف ایک مخلوق ہے اور جس طرح ہمارا خالق مالک اور رب اللہ تعالیٰ ہے اسی طرح اس کا خالق و مالک اور رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے تو اس طرح کہنے سے وہ ان لوگوں کے مشرکانہ اور گمراہانہ عقیدہ پر ایک ضرب بھی لگا دیتے تھے جن کا عقیدہ یہ ہو کہ چاند بھی کوئی با اقتدار اور با اختیار ہستی ہے۔

۵.... حضرت عابس بن ربیعہ رحمۃ اللہ علیہ (تابعی) کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا وہ حجرِ اسود کو بوسہ دیتے اور یہ فرماتے تھے:

إني لأعلم أنك حجر لا تضرُّ ولا تنفعُ ولو لا أني رأيتُ رسول الله صلى الله عليه وسلم استلمك ما استلمتُك

"یقیناً میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ضرر نقصان، اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں کبھی تجھے بوسہ نہ دیتا"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم، مشکوٰۃ)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ خطاب صرف اس لیے تھا کہ لوگ کہیں اعتقادی گمراہی میں نہ پڑ جائیں اور کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی پتھر کو پوجنا شروع کر دیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ پتھر بذاتِ خود نہ نفع پہنچا سکتا

ہے اور نہ نقصان اگر اس کی ذات سے کوئی نفع پہنچتا ہے تو صرف اس حد تک کہ رسول اللہ ﷺ کی تعمیل میں اس کو بوسہ دینے کا ثواب ملتا ہے۔

بہر حال تمام تر وہ ندائیں اور خطاب جن کا محرک کوئی فاسد عقیدہ نہ ہو ان کو دعا اور حقیقی استعانت میں کھینچ تان کر لانا کسی طرح درست نہیں اور نہ ایسی نداؤں اور خطابوں پر کوئی حکم جاری کیا جاسکتا ہے اگر کسی صادق کی زبان سے ایسی ندا و خطاب نکلا ہے تو اس سے ندائے غائب وغیرہ پر استدلال نہیں کیا جاسکتا اس طرح کے تمام خطابوں کو مذکورہ بالا اقسام میں سے کسی قسم پر محمول کرنا ہوگا اور آج بھی اگر کسی مسلمان کے منہ سے بے ساختہ ایسے کلمات نکلیں تو اس پر خواہ مخواہ شرک و کفر کے فتوے نہیں لگانے چاہئیں جب تک اس کے کلام میں اس بات کی تصریح نہ پائی جائے کہ وہ واقعی اس مخلوق کو نفع و نقصان کا مالک سمجھتا ہے کیونکہ ندائے غائب و پکار صرف اسی وقت شرک سمجھی جائے گی جب کہ اس کا محرِّک فاسد عقیدہ ہو جس کا بیان بار بار کر چکا ہوں، البتہ ایسی نداؤں کے ساتھ کو بر سر عام پکارنا، لوگوں کے سامنے لانا اور ان کو رواج دینا ہر گز جائز نہیں جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے، اسی طرح جن کلمات سے لوگوں کے عقائد بگڑنے کا خطرہ ہو تو ایسے کلمات ناجائز اور ممنوع ہوں گے۔

لہٰذا سنجیدہ اور بااثر لوگوں سے بھی یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ حتی الوسع ایسی ندا سے قطعاً پرہیز کریں جس کی وجہ سے بالآخر دوسرے لوگوں کے عقائد خراب ہو جائیں۔ اور اگر کہیں چند جملے بے اختیار نکل گئے جن سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ عام لوگ ان جملوں سے غیر اللہ سے دعا اور استعانت حقیقی مراد لیں گے تو ایسی صورت میں اس نظم و شعر یا نثر کی کھلی تشریح کریں اور صحیح عقیدہ لوگوں کے سامنے رکھیں تاکہ اس کے برے اثرات آنے والی نسلوں اور لوگوں پر نہ پڑیں۔

دعا کے بارے میں بحث کا خلاصہ

۱.... ہر مشکل ہر حاجت میں صرف ایک اللہ تعالیٰ کو پکارا جائے۔

۲.... اپنے اعمال کے توسُّط، نیز اللہ تعالیٰ کے رسول پر ایمان اس طرح انبیا علیہم السلام اور امام الانبیاء ﷺ کے ساتھ جو محبت ہے اس ایمانی محبت کے توسُّط سے دعا مانگنا بھی بالاتفاق جائز ہے۔

۳.... اچھا یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے توسُّط سے دعا مانگی جائے

۴.... دعا صرف اللہ تعالیٰ سے براہِ راست ہوگی اس میں کسی کو سفارشی نہیں بنایا جاسکتا، یہ چیز ایک طرف تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد و بھروسہ کو نقصان پہنچاتی ہے دوسری بات یہ کہ اس طرح دعا سے مخلوق کو خالق پر بڑھانا یا خالق کے

ساتھ کسی نہ کسی طرح برابر یا شریک کرنا ہے۔

۵.... کسی بھی مخلوق کو نفع یا ضرر کا مالک سمجھ کر کچھ مانگنا بالاتفاق شرک ہے۔

۶.... اگر کوئی شخص کسی مخلوق سے اس انداز میں سوال کرے جس سے گمانِ غالب یہ ہو کہ اس مخلوق ہی کو مالک اور مختارمان کر مانگا جارہا ہے مثلاً یوں کہا جائے کہ اے فلاں میری بینائی لوٹا دے یا مجھے بیٹا دے دے تو یہ الفاظ شرکیہ اور ممنوع ہیں، البتہ ان الفاظ کا کہنے والا اگر مسلمان ہے تو اس پر اس وقت تک مشرک ہو جانے کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا جب تک اس سے پوچھ گچھ نہ کی جائے اور اس کا عقیدہ معلوم نہ کیا جائے۔ اگر استفسار کے بعد وہ کہتا ہے کہ میرا مطلب یہ تھا کہ اے فلاں آپ خدا سے دعا کریں کہ وہ مجھے بیٹا دے دے تو وہ شرک نہیں البتہ ایسے الفاظ بولنے سے آئندہ کے لیے منع کیا جائے گا کیونکہ یہ الفاظ شرکیہ اور ممنوع ہیں اور شریعتِ مطہّرہ نے صرف شرکیہ ہی نہیں، بلکہ موہم شرک الفاظ کے استعمال کو بھی ممنوع اور کارِ گناہ ٹھہرایا ہے۔

۷.... اگر کوئی شخص مسلمان ہونے کے باوجود اس تاویل کو نہیں مانتا، بلکہ صاف صاف کہتا ہے کہ میں نے فلاں سے جو بیٹا مانگا ہے یا بینائی لوٹانے کے لیے جو کہا ہے اس سے میرا مطلب دعا کی درخواست نہیں، بلکہ خود اس سے مانگنا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مافوق الاسباب اختیار دے کر نفع اور ضرر کا مالک بنا دیا ہے تو اس صورت میں وہ مشرک قرار دیا جائے گا۔

۸.... اگر کوئی شخص کسی بزرگ کے پاس جاتا ہے اور صرف اتنا کہتا ہے کہ میری بینائی چلی گئی ہے یا میری اولاد نہیں ہے یا بارش نہیں ہو رہی ہے تو ان الفاظ کا واضح مقصد یہی ہوتا ہے کہ یہ مصیبت پیش آئی ہے آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دے اور ایسا کرنا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے اس لیے اس طرح کے الفاظ حرام اور ممنوع نہیں ہیں البتہ اگر کسی جاہل کی ان الفاظ سے بھی مراد وہی ہے جو کہ اوپر گزری تو اس صورت میں اگرچہ یہ الفاظ شرکیہ نہیں لیکن شرکیہ عقیدہ ہونے کی وجہ سے وہ شخص مشرک ہو جائے گا اور ایسے لوگوں کے عقائد کی اصلاح کرنا ضروری ہے۔

مسلمانوں کو سمجھانے کا طریقہ

مسلمان عوام کو سمجھانا بھی چاہیے لیکن ان کے سمجھانے کے لیے ایسا رویہ اختیار کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کا عمل اور عقیدہ بھی ٹھیک ہو جائے اور ان کی تحقیر و تذلیل بھی نہ ہو مثلاً ایک واعظ اپنے وعظ میں اگر صرف اتنا کہتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مخلوق سے مافوق الاسباب چیز مانگے مثلاً یہ کہے کہ مجھے بیٹا دے دو تو اس سے کوئی اس وقت

تک مشرک نہیں ہو جاتا جب تک عقیدہ بھی شرکیہ نہ ہو یا یوں کہتا ہے کہ زنا، غیبت، جھوٹ کی وجہ سے کوئی شخص کافر نہیں ہو سکتا اور پھر اپنے وعظ و تبلیغ کا رخ دوسری طرف کر دیتا ہے تو اس سے نقصان یہ ہو گا کہ لوگ اس گناہ کو ہلکا سمجھ لیں گے کیونکہ اگرچہ زنا وغیرہ سے انسان کافر تو نہیں ہو تا لیکن ان جرائم کی شدت اور حرام ہونے کا ذکر بھی ضروری ہے تاکہ لوگ حرام میں نہ پڑ جائیں۔ نیز حرام کو حلال سمجھنے سے کافر نہ ہو جائیں۔ اسی طرح اگر معاملہ شرک اور شرکیہ افعال کا ہو تو مسلمان بھائیوں کو سمجھایا جائے کہ اگر کسی بزرگ سے کوئی درخواست کرتا ہے کہ مجھے شفا دے دو اور اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بزرگ شفا دینے پر قدرت رکھتا ہے تو اس کی وجہ سے ایک انسان مشرک ہو جاتا ہے اور اگر اس کا مقصد ان الفاظ سے صرف یہ ہو کہ یہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بیٹا دے دے تو اس صورت میں اگرچہ وہ مشرک نہیں ہو جاتا مگر پھر بھی چونکہ یہ الفاظ شرکیہ ہیں جو شریعتِ مطہّرہ میں ناجائز اور ممنوع ہیں اس لیے ایسے الفاظ سے بھی قطعاً پرہیز کریں کیونکہ ایسے الفاظ اگرچہ درست عقیدے کے بنیاد پر ہوں پھر بھی ایک تو یہ شریعت میں ممنوع ہیں دوسرا نقصان اس سے یہ ہو گا کہ سادہ عوام یہ دیکھ کر کہ فلاں شخص نے ان الفاظ کے ساتھ دعا مانگی ان کا عقیدہ بھی خراب ہو جائے گا۔ اور جب دوسروں کا عقیدہ آپ کی وجہ سے خراب ہو گا تو اس کا وبال بھی آپ پر ہو گا۔

نیز یہ بھی خیال رہے کہ جب وقت کے لحاظ سے وعظ و نصیحت میں سختی اور نرمی کا ہونا پہلے سے چلا آرہا ہے، انبیائے کرام اور علمائے ربانیین کا شیوہ رہا ہے کہ وہ لوگوں کے رخ دیکھ کر نہیں چلتے، بلکہ وہ جرائم کے طوفان کے ساتھ ٹکر لیتے تھے اور جس قدر کوئی جرم عام ہو تا تو اس جرم کے دور دور کے اسباب کو بھی ختم کر دیتے تھے مثلاً جب شرک اور بت پرستی عام تھی تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو قبروں کی زیارت سے بھی روک دیا تھا لیکن جب مسلمان اسلام میں پختہ ہو گئے اور یہ خدشہ جاتا رہا تو حکم فرمایا:

نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا

"میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا لیکن اب ان کی زیارت کر لیا کرو"۔ (مسلم، مشکوٰۃ)

نذر و منت اور نیاز وغیرہ

نذر عربی کا لفظ ہے اردو میں اس کو منت کہا جاتا ہے۔ نذر قولی، مالی اور جانی عبادات میں سے کسی نفلی عبادت کو اپنے اوپر لازم کرنا ہوتا ہے مثلاً قربانی واجب بھی ہو سکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام کی نفلی قربانی بھی، روزہ فرض بھی ہوتا ہے اور نفلی بھی اور صدقہ نفلی بھی ہو سکتا ہے اور فرض واجب بھی، حج فرض بھی ہو سکتا ہے اور نفلی

بھی۔ غرض یہ کہ نذر عبادت کی ہی مانی جاتی ہے، لیکن اس میں یہ ہوتا ہے کہ کسی ایسی عبادت کو اپنے اوپر لازم کیا جاتا ہے جو پہلے اس پر لازم نہ تھی۔ نذر یا تو اس لیے مانی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے کوئی نفلی عبادت ادا کی جائے خواہ مال کی صورت میں ہو، ذبح اور قربانی کی صورت میں ہو یا نماز، روزہ، اعتکاف وغیرہ کی صورت میں۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے اپنے اوپر کوئی نفلی عبادت لازم کرلیتا ہے تو وہ اس پر واجب اور لازم ہوجاتی ہے، اس کے پورا کرنے پر اس کو بہت اجر و ثواب ملتا ہے اور انسان کے اندر استقامت کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی یہ کہہ دے کہ اے اللہ! میری فلاں حاجت پوری ہوجائے تو میں تیرے نام پر بکرا ذبح کروں گا یا اتنا مال صدقہ کروں گا یا اتنی رکعت نفل پڑھوں گا وغیرہ تو یہ بھی نذر و منت کی ایک صورت ہے لیکن یہ اس وقت لازم ہوجاتی ہے جب اس کی حاجت پوری ہوجائے۔ اس نذر کے پورا کرنے میں بھی ثواب ہے، اس کے مفصّل احکام تو ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی جگہ پر آئیں گے لیکن یہاں یہ بات تو معلوم ہوگئی کہ یہ بھی وہی عبادات ہیں لیکن کوئی نفلی چیزوں کو اپنے اوپر لازم کرلیتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ دوسروں کے لیے جائز نہیں ہوسکتیں، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے کسی بھی غیر اللہ کے نام کوئی نذر و منت ماننا مثلاً کسی غیر اللہ کے نام پر بکرا ماننا اور ذبح کرنا، یا کسی کی قبر پر مٹھائیاں وغیرہ مان کر اس پر رکھنا، ایسے اعمال ہیں جو بالاتفاق حرام اور ممنوع ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی عبادات میں شرک اور مشرکین کا عمل ہے، اس کے متعلق کبھی علمائے اسلام میں دو رائے نہیں ہوئی ہیں۔

غیر اللہ کے نام قربانی اور غیر اللہ کے نام پر جانور چھوڑنے اور غیر اللہ کے نام نذر و نیاز ماننے کی رسم جو پہلے چلی آرہی تھی اسے اسلام نے آکر پوری طرح مٹادیا ہے اور یہ بتلادیا ہے کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہوسکتے ہیں کسی اور کے لیے قطعاً نہیں ہوسکتے۔ اب اس کے متعلق قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں میں سے کچھ پیش کرتے ہیں:

۱.... اللہ جل شانہ ایک مقام پر نیکوکاروں اور جنتیوں کو آخرت میں ملنے والے کچھ انعامات کا ذکر کرتے ہیں اور آگے جنتیوں اور نیکوکاروں کی کچھ صفات کو بیان کیا ہے جن میں سے ان کی یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے:

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ﴿٧﴾

”یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی نذروں کو پورا کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کا شر ہر طرف پھیلا ہوگا“۔

(الدھر:۷)

۲.... وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

"اور تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اور جو کوئی نذر (یعنی منت) مانتے ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ کو سب معلوم ہے اور ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں"۔ (البقرہ:۲۷۰)

یعنی تمہارے اموال جن جن راہوں کے لیے خرچ ہوتے ہیں اور تمہاری نذر اور منتیں جن جن کے لیے اور جن جن مقاصد کے لیے ہوتی ہیں اور جو کچھ مال یا عمل تم لوگ نذریں مانتے ہو اللہ تعالیٰ کے علم میں سب کچھ ہے اس لیے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے پر مالوں کو خرچ کرتے اور نذروں کو مانتے اور پورا کرتے ہیں ان کو تو ان کا پورا پورا اجر ملے گا، اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کے لیے نذر و منت مانی ہوگی تو ایسے اور اسی طرح کے تمام ظالموں کو کوئی مدد گار نہ مل سکے گا جو ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکے۔

۳.... ابو طفیل کا بیان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے علیحدہ کچھ خاص خاص تعلیمات بھی دی ہیں انہوں نے فرمایا ہمیں ایسی کوئی بات نہیں بتلائی ہے جو عام لوگوں کو نہ بتلائی ہو بجز ان چند امور کے جو میری اس تلوار کی میان میں لکھے ہیں اس کے بعد انہوں نے وہ تحریر نکالی جس میں یہ احکام درج تھے:

لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَرَقَ مَنَارَ الْاَرْضِ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ لَّعَنَ وَالِدَهٗ وَلَعَنَ اللّٰهُ مَنْ اٰوٰى مُحْدِثًا

"اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے (یعنی کسی اور کے تقرُّب اور منت و نیاز کی نیت سے) ذبح کرے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو زمین کے نشانات کو چرائے (یعنی پڑوسی اور ہمسایہ کے ساتھ حدود متعین کرنے کے لیے جو نشانات لگائے جاتے ہیں ان میں رد و بدل کر کے چوری کرے) اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو اپنے ماں باپ پر لعنت کرے اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اس پر جو کسی مجرم کو پناہ دے"۔ (صحیح مسلم)

طارق بن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص مکھی کی بدولت جنت میں چلا گیا اور دوسرا شخص مکھی کی بدولت جہنم میں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے ہوا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو آدمیوں کا ایک قوم پر گذر ہوا جن کا دستور تھا کہ کوئی شخص اس پر چڑھاوا چڑھائے بغیر ادھر سے نہ گذر سکتا تھا تو انہوں نے اپنے دستور کے مطابق ان دونوں میں سے ایک کو کہا "کچھ نیاز چڑھاؤ، اس نے

کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے انہوں نے کہا کہ کچھ نہ کچھ ضرور چڑھاؤ اگر چہ ایک مکھی ہی ہو اس نے ایک مکھی (پکڑ کر اس کی نیاز) چڑھادی، انہوں نے اس کو تو چھوڑ دیا اور اسی (شرک کی) وجہ سے وہ جہنم میں گیا (اس پہلے شخص کو چھوڑ دینے کے بعد) دوسرے سے کہنے لگے کہ تو بھی کچھ چڑھادے وہ بولے اللہ تعالیٰ کی ذات کے سوا میں کسی اور کے نام کچھ (نیاز) نہیں چڑھاتا ہوں تو انہوں نے اس کی گردن ماردی (اور شہید کر دیا) اور اس لیے وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ (مسند امام احمد)

یہاں اس حدیث میں یہ بات تو صاف ہے کہ یہ دوسرا شخص جس نے دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی وجہ سے شرک سے کھل کر بغاوت کا اعلان کیا اور وہ اس کی وجہ سے قتل ہو کر شہید بھی ہو گیا، پکا مسلمان ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

لیکن پہلے شخص کے بارے میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر چہ عزیمت اور بہتری اسی میں ہے کہ انسان کسی بھی حال میں بظاہر بھی کوئی کفریہ کلمہ نہ کہے اگر چہ اس کی جان چلی جائے یا جلا دیا جائے، لیکن ایک کمزور انسان کے لیے اسلام میں اتنی بھی گنجائش موجود ہے کہ حالتِ اضطراری اور سخت مجبوری کے وقت جب کہ جان چلی جانے کا اندیشہ ہو اگر کوئی دل سے توحید و ایمان پر ڈٹا ہوا ہو لیکن بظاہر قتل سے بچنے کی خاطر کفر کا کلمہ کہے یا کوئی کفریہ کام کرے تو قرآن مجید و اسلام ایسے شخص کو بدستور مسلمان قرار دیتا ہے اور ایسے شخص کو اس وجہ سے شرک و کفر کا مرتکب نہیں سمجھا جائے گا اور نہ اسی وجہ سے وہ جہنم کا مستحق ہو گا۔ تو سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے پہلا شخص جس نے مکھی کی نیاز چڑھائی کیونکر جہنم کا مستحق بن گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص سے جب چڑھاوے کا کہا گیا تو اس نے چڑھاوے کا اس لیے انکار نہیں کیا تھا کہ وہ اس چڑھاوے کو دل سے برا سمجھتا تھا، بلکہ اس نے عذر یہ پیش کیا کہ میرے پاس کچھ نہیں کہ چڑھا سکوں اس لیے جب انہوں نے مکھی تک چڑھانے کی اجازت دے دی تو اس نے مکھی پکڑ کر بت پر چڑھائی اور وہ اسی وجہ سے جہنم واصل ہو گیا کہ وہ اس کو کوئی مکروہ اور خطرناک عمل نہیں سمجھ رہا تھا۔

بلاشبہ کسی غیر اللہ کے لیے نذر و منت اور نیاز یا غیر اللہ کے تقرُّب کے لیے قربانی اور ذبح کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں اور نہ کوئی مسلمان ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو دیکھ کر بھی بے چین نہ ہو البتہ ایصالِ ثواب (یعنی اپنے اجر و ثواب کو دوسروں کی طرف منتقل کرنا اس) میں کوئی شرک اور کوئی کراہت نہیں اور نہ اس میں شرک کی راہ ہموار ہوتی ہے اس لیے شریعتِ مطہّرہ نے اسے جائز قرار دیا ہے اور اس حقیقت کو ظاہر فرمایا ہے کہ جس

شخص میں یہ صلاحیت ہو کہ اس کو ثواب پہنچ سکے (یعنی صاحبِ ایمان اور مسلمان ہو) تو اس کے لیے ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے مثلاً کوئی اللہ تعالیٰ کے لیے صدقہ، خیرات، تلاوت کرتا یا حج عمرہ کرتا ہے اور اس کا ثواب اپنے مسلمان اقربا، اساتذہ یا مشائخ کو بخش دیتا ہے مثلاً یوں کہہ دے کہ یا اللہ! اس عمل کا ثواب فلاں استاد یا میرے والدین کو پہنچا دے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہو جائے تو وہ اس عمل کا ثواب اسے پہنچا دیتا ہے۔ ان شاء اللہ ایصالِ ثواب کے متعلق اپنی جگہ پر قدرے تفصیل سے بیان آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اطاعت پر دوسروں کو ترجیح دینا شرک ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی اچھی طرح ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کے قانون و حکم اور اس کی اطاعت کے مقابلہ میں دوسروں کے قوانین اور اطاعت و حکم میں نفع و خیر سمجھنا اور دوسروں کی اطاعت اور قوانین کو اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم پر ترجیح دینا ظلم عظیم اور شرک ہے اور جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے حکم و قانون کے بجائے اپنی اطاعت اور اپنے قانون یا دوسرے لوگوں کے قوانین اور اطاعت کو ترجیح دے دے وہ پکا مشرک ہے۔

اہلِ عرب مشرکین کو اللہ تعالیٰ کی خالقیت و ربوبیت سے انکار نہیں تھا، لیکن خالقیت و ربوبیت کے لوازم یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی بندگی اور پھر کے لوازم یعنی صرف تنہا اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت میں ٹھوکر کھا کر راہِ حق سے ہٹ گئے تھے، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و ہدایت کی جگہ اپنے نفس، اپنے آباو اجداد، اپنے سرداروں اور لیڈروں کی اطاعت کرتے تھے۔ قرآن مجید نے ان کی اس روش پر سخت ملامت اور تنبیہ کی اور فرمایا:

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَ ۞ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ

"بے شک ہم نے یہ کتاب تمہاری طرف حق (قول فیصل) کے ساتھ اتاری ہے پس تم اللہ تعالیٰ ہی کی بندگی کرو اس کے خالص دین (یعنی اطاعت) کے ساتھ خبر دار (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خالص دین (خالص اطاعت) ہے"۔ (الزمر: ۲-۳)

یعنی بندگی وہی معتبر ہے جو خالص اطاعت کے ساتھ ہو، اگر بعض امور میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت یا پرستش ہو اور بعض امور میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور قانون کے خلاف دوسروں کے قوانین میں نفع و خیر سمجھ کر اختیار کیا جائے تو یہ شرک ہے، اگر کوئی شخص اپنی رائے اور اپنے خود ساختہ قانون کو اللہ تعالیٰ کے قوانین پر ترجیح دیتا ہے تو اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے دوسروں کو یا خود اپنے نفس کو الٰہ اور معبود ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۙ

”کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے پس کیا تم اس پر داروغہ مقرر ہوئے ہو“۔ (الفرقان:۴۳)

تحلیل و تحریم جائز و ناجائز، شریعت اور قانون سازی بھی اللہ تعالیٰ کا خاص حق ہے

اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ ہم پر اس کے بے شمار و بے انتہا احسانات ہیں۔ وہی ہمارے ماضی، مستقبل اور ہمارے لیے کسی چیز یا فعل نے نافع و مضر ہونے کو خوب جانتے ہیں اس لیے صرف اس کی ربوبیت کا حق اور اس کی بندگی کا تقاضا ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے ہمارے لیے حلال کر دے اور جس چیز کو چاہے حرام کر دے اور وہی جس طرح مناسب سمجھے ہمارے لیے زندگی گذارنے کے قانون بنائے اس لیے قرآن مجید اور دینِ اسلام اسی حقیقت کا داعی ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم و علیم اور خبیر ذات ہی حقیقی حاکم اور فرمانروائے مطلق ہے اور شریعت سازی صرف اسی کا حق ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ

”اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا حکم (یعنی کسی کی حکومت) نہیں اسی کا حکم یہ ہے کہ اس کے سوا تم کسی کی بندگی نہ کرو“۔ (یوسف:۴۰)

بہر حال شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کا تعین، جائز و ناجائز کی تفریق اور اوامر و نواہی سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور ان کے معلوم کرنے کا واحد راستہ انبیا و سیدنا و سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ ہیں تو جس چیز کی تحلیل و تحریم کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی جاتی ہے اس کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ اس کی تحلیل اور تحریم کے لیے قطعی اور یقینی علامت ہیں، اس لیے یہی کہا جاتا ہے کہ اطاعت صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

”جس نے رسول (ﷺ) کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی“۔ (النساء:۸۰)

اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت کے علاوہ دوسروں مثلاً حُکّام، علما اور والدین وغیرہ کی اطاعت مشروط ہے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کے ساتھ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ

فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝

"اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ (ﷺ) کی اطاعت کرو اور ان کی فرمانبرداری کرو جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں (یعنی حکما، علما وغیرہ) پھر اگر تم کسی بات میں باہم جھگڑ پڑو (یعنی تمہارے درمیان اختلاف ونزاع پیدا ہوجائے) تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (کے فرمان) کی طرف لوٹا دو اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ تعالیٰ پر اور روزِ آخرت پر یہی بہتر (اور سراسر خیر ہے) اور بہت اچھا ہے اس کا انجام"۔(النساء:۵۹)

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

"اور ہم نے انسان کو وصیت کی ہے (یعنی تاکیدی حکم دیا ہے) کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے (لیکن) اگر وہ یہ کوشش کریں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک بناؤ جس کے شریک ہونے کا تمہیں کوئی علم نہیں تو (اس بات یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف بات میں) ان کی فرمانبرداری نہ کرنا تم سب کو میری طرف لوٹ کر آنا ہے پھر میں تمہیں ان اعمال (کی حقیقت اور انجام) سے آگاہ کروں گا جو تم کیا کرتے تھے"۔ (العنکبوت:۸)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ مَا لَمْ يُؤْمَرْ بِمَعْصِيَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ

"(اپنے امیر وحاکم کی بات کو) سننا اور (اس کے حکم کی) فرمانبرداری کرنا ہر حالت میں مسلمان پر واجب ہے ان امور میں بھی جو اس کو پسند ہوں اور ان امور میں بھی جو اس کو ناپسند ہوں جب تک کسی گناہ کی بات کا حکم نہ دیا جائے لہٰذا جب اس کو گناہ کی بات کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور نہ (اس گناہ ونافرمانی کی بات میں اس کی) اطاعت کرنا"۔(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا طَاعَةَ فِيْ مَعْصِيَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ

"معصیت اور گناہ کی بات میں (کسی کی بھی) اطاعت وفرمانبرداری نہیں (خواہ گناہ اور نافرمانی کا حکم دینے والا

حاکم ہو یا ماں باپ اور استاد وغیرہ) اطاعت اور فرمانبرداری تو صرف اچھے یا جائز حکم میں واجب ہے"۔(حوالہ بالا)

اور ایک دوسری حدیث شریف میں ہے کہ:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ

"مخلوق کے کسی ایسے حکم میں اطاعت و تابعداری جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی ہو"۔(مشکوٰۃ)

تحلیل و تحریم اور شریعت سازی کا حق غیر اللہ کے لیے تسلیم کرنے کی مذمت

جب یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ تحلیل و تحریم اور شریعت سازی صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے تو اس کے بعد یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حق کو کسی دوسرے کے لیے تسلیم کرنا بہت عظیم جرم ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگوں نے دین کے نام پر حلت و حرمت کے متعلق جو خود ساختہ قوانین مقرر کر رکھے تھے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ اس کی سخت تردید کی ہے اور اس غلط رویہ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ؕ﴿۱۱۶﴾

"اور تمہاری زبانیں جو جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تو ایسی باتیں نہ کرو (اسی طرح احکام لگانے کی بنا پر) تم اللہ تعالیٰ پر افترا باندھو گے، بے شک جو لوگ اللہ تعالیٰ پر افترا پردازیاں کرتے ہیں وہ کبھی فلاح نہ پائیں گے"۔(النحل:۱۱۶)

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کبھی ایسا رویہ اختیار نہ کریں کہ بغیر کسی ماخذ شرعی کے حلال و حرام کا حکم لگایا کریں۔

شریعتِ مطہّرہ کی وسعت اور گنجائش کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا

اسی طرح متعدد آیتوں میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو تحریم و تحلیل کے مختار بن جاتے ہیں، بلکہ حرام کو حلال کرنے کے بجائے حلال کو حرام کرنے پر زیادہ سخت گرفت کی گئی ہے کیونکہ اس کی وجہ سے بلا وجہ لوگ تنگیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اس لیے اس بات کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ جن چیزوں اور معاملات میں شریعتِ مطہّرہ نے ضرورت کا لحاظ کر کے کوئی وسعت اور گنجائش دی ہو ایسے امور میں شریعتِ مطہّرہ کی وسعت و فیاضی کو نظر انداز کر کے عام مسلمانوں پر زندگی تنگ کرنا دین کی کوئی خدمت نہیں، بلکہ اگر اس وجہ سے دین

سے کوئی متنفر اور بے زار ہو گیا تو یہ کس قدر گناہ عظیم ہو گا اور یہ کتنا سنگین جرم ہے کہ شریعت کی آسانیوں کو تنگیوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دین سے متنفر کیا جائے۔ بہر حال حلال و حرام کے متعلق بہت ہی احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے، اس میں جرأت اور غیر محتاط رویہ کے بد انجام سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ ایک جگہ اہلِ کتاب کے متعلق ارشاد ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ

"انہوں (اہلِ کتاب) نے اپنے علما اور راہبوں کو اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنا رب بنا رکھا ہے"۔(التوبہ:۳۱)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میری گردن میں سونے کی صلیب تھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عدی! اس بت کو اتار پھینکو۔ (حضرت عدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سورۂ برأت کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ اور (اس آیت کی تفسیر میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ (یعنی اہلِ کتاب) اپنے علما اور راہبوں کی عبادت نہیں کرتے تھے لیکن جب ان کے علما اور راہب ان کے لیے کوئی چیز حلال کرتے تو یہ اسے حلال قرار دیتے تھے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کرتے تو یہ اس کو حرام قرار دیتے تھے"۔(ترمذی)

کسی کو حلت و حرمت کا مکمل اختیار دینا اس کی عبادت کرنے کے مترادف ہے

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ تحلیل و تحریم کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، حلال و حرام وہی ہو سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے اپنے بندوں پر حلال و حرام کیا ہو۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کرنے کی جرأت کرتا ہے یا ان کی حرام کردہ چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حق پر ڈاکہ ڈال کر اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے اور جو لوگ کسی شخص کے لیے ایسے اختیارات تسلیم کرتے ہیں وہ گویا اس کی عبادت اور پرستش میں مبتلا ہیں۔

حلال و حرام اور دینی مسائل کے متعلق عوام کا علما کی طرف اور رسمی علما کا متبحّر علما کی طرف رجوع کرنا اگر جائز ہے تو پھر اہلِ کتاب کے اندازِ فکر پر اس انکار کی کیا وجہ ہے؟

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اہلِ کتاب کے علما بدتر سے بدتر بھی ہو چکے تھے تو اس میں ان عوام کا کیا قصور تھا کیونکہ ان کو علما سے پوچھے بغیر کوئی چارہ نہ تھا؟

بلاشبہ اس بات کا تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے کہ عوام براہِ راست کتاب سے اللہ تعالیٰ

کے احکامات کو نہیں جان سکتی، نہ ہر پڑھا لکھا اور رسمی عالم قرآن و سنت سے استنباط کر کے دقیق اور اجتہادی مسائل کو معلوم کر سکتا ہے، اس لیے عوام کا حلال و حرام اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جاننے کے لیے علما کی طرف اور کم درجے والے رسمی علما کا دقیق اور اجتہادی مسائل میں متبحرّ علما کی طرف رجوع کرنا ضروری بھی ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں۔ اگر اہلِ کتاب کے عوام کا اندازِ فکر بھی یہ ہوتا کہ وہ کسی چیز یا فعل کے متعلق اپنے علما سے اللہ تعالیٰ کا حکم پوچھتے اور وہ اپنے علما کو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکامات کو بیان کرنے والے خیال کرتے تو پھر وہ نہ اپنے علما کو رشوت دیتے اور نہ ان کی منت کرتے کہ فلاں چیز ہمارے لیے حلال کر دیں کیونکہ ایسی صورت میں تو وہ یہی سمجھتے کہ حکم تو وہی ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بھیجا ہے، ان کے ہاتھ میں تو سوائے اس کے کوئی اختیار نہیں کہ وہ اس حکمِ الٰہی کو ہمیں بیان کریں جو اس کی نازل کردہ کتاب میں صراحۃً موجود ہے یا اس سے مستفاد ہے ایسی صورت میں اگرچہ ان کے علما کتنے ہی بدتر کیوں نہ ہوں تاہم ان کے عوام کو تب داد دینی چاہیے تھی کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کو جان کر اس کی مرضیات پر چلنا اور اس کی نامرضیات سے بچنا چاہتے۔

لیکن اہلِ کتاب کے اکثر علما اور عوام کا اندازِ فکر یہ تھا کہ انہوں نے حلت و حرمت کا مکمل اختیار اور اقتدار اپنے پادریوں اور راہبوں کو دے رکھا تھا، ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حلت و حرمت کا مکمل اختیار ان کے پاس ہے اور وہ معصوم عن الخطاہیں، چنانچہ ابن اثیر نے "کامل" میں تاریخ وار لکھا ہے کہ فلاں فلاں سن میں نصاریٰ کے بڑے بڑے پادری جمع ہوئے اور ان کی شریعت میں بعض حرام شدہ چیزوں کو انہوں نے حلال کیا اور اسی طرح بالعکس، اس کے بعد وہ چیزیں ان کے نزدیک حلال شمار ہوئیں حالانکہ وہ چیزیں بنص صریح ان کی شریعت میں حرام تھیں اور وہ بھی پہلے ان کو حرام ہی جانتے تھے، پادریوں کے حلال کر دینے سے اب وہ حلال ہو گئیں، اس طرح یہود نے بھی اپنے علما کے متعلق ایسا ہی خیال و عقیدہ باندھ رکھا تھا، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جس چیز کو یہ حلال کہیں تو وہ حلال ہے نفس الامر میں اس میں کوئی حرج نہیں اور جس کو وہ حرام کہیں وہ حرام ہے جو نفس الامر میں مؤاخذہ کے قابل ہے۔ (فضل الباری:۱/۲۲۲)

نیز انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں احبار و رہبان (جن کو اہلِ کتاب اپنی اصطلاح میں پوپ کہتے ہیں ان) کے اختیارات کے بارے میں یہ لکھا ہے:

"لہٰذا پوپ عقائد کے معاملہ میں مقتدرِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسی حُجّیت اور اسی معصومیت کا حامل ہے جو

پورے کلیسا کو مجموعی طور پر حاصل ہے، چنانچہ پوپ واضح قانون اور قاضی کی حیثیت میں وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو کلیساؤں کی اجتماعی نسل کو حاصل ہیں۔ چنانچہ پوپ کے اقتدارِ اعلیٰ کے دو لازمی حقوق ہیں ایک عقائد وغیرہ کے معاملہ میں معصوم عن الخطا ہونا اور دوسرے تمام اہل عقیدہ پر ہر پہلو سے مکمل قانونی اختیار"۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا:۱۸/ ۲۲۲-۲۲۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء مقالہ پوپ)

اس کتاب میں دوسری جگہ "پوپ کی معصومیت" کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"رومن کیتھولک چرچ پوپ کی جس معصومیت کا قائل ہے اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ جب تمام اہلِ عقیدہ پر نافذ ہونے والا کوئی ایسا فرمان جاری کرے جو عقائد یا اخلاقیات سے متعلق ہو تو وہ غلطی نہیں کر سکتا"۔

(حوالہ بالا:۱۲/۳۱۸ مقالہ معصومیت)(ماخوذ از تقلید کی شرعی حیثیت:۱۲۴-۱۲۵)

نیز قرآن مجید نے بھی جگہ جگہ ان کی اس گمراہی کو واضح طور پر بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿٢٩﴾

"اہلِ کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو اللہ اور روزِ آخرت پر (سچا) ایمان نہیں رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے جو حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے اور نہ دینِ حق کو اپنا دین بناتے ہیں (ان ظالموں سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے ایسی حالت میں جزیہ دیں کہ وہ چھوٹے (یعنی ذلیل اور مغلوب) ہوں"۔ (التوبہ:۲۹)

اس آیتِ کریمہ سے بھی معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب کو اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم ہونے کے بعد بھی اگر ان کے پوپ اور کاہن اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کو بدل دیتے تو وہ اسے تبدیل مان کر اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ دیتے تھے۔

نیز خود عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ والی حدیث کی ایک روایت میں بھی اس بات کی تصریح موجود ہے کہ حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جب یہ مذکورہ بالا آیت اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ سنی تو انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کی عبادت تو نہیں کرتے تھے؟ اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا یہ بات نہیں کہ احبار و رہبان نے ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا تو انہوں نے ان کی متابعت کر لی، یہی ان احبار و رہبان کی عبادت تھی"۔ (مسند امام احمد)

اس حدیث سے بھی اس بات کی پوری وضاحت ہو گئی کہ اہلِ کتاب احبار ورہبان کو تحلیل و تحریم کے حق دار سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا حکم خوب معلوم تھا کہ مثلاً شراب حرام ہے اور دودھ حلال، لیکن اگر بالفرض رہبان واحبار ان کو یہ کہتے کہ شراب حلال ہو گئی اور دودھ حرام تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے واقفیت کے باوجود وہ اب دودھ کو حرام اور شراب کو حلال سمجھتے، ورنہ اگر ان کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے واقفیت نہ ہوتی تو عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ اس سوال کے جواب میں کہ "کیا یہ بات نہیں کہ احبار ورہبان نے ان کے لیے حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دیا تو انہوں نے ان کی متابعت کر لی" صاف یوں کہہ دیتے کہ یارسول اللہ! انہیں کیا معلوم تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بدل دیتے ہیں؟ انہوں نے تو ان سے اللہ تعالیٰ کا حکم پوچھا تھا جس کو معلوم کر کے وہ اس پر عمل کرتے تھے کہ یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا، وہ تو اللہ تعالیٰ کے احکامات کی اتباع کرتے تھے نہ کہ مستقل طور پر اپنے علماو مشائخ کی، لیکن اس سوال کے بجائے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ایسا ہی کرتے تھے کہ حلال و حرام معلوم ہونے کے باوجود وہ اپنے علماو مشائخ اور کاہنوں کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے تھے کیونکہ وہ اپنے علماو مشائخ کو خطاؤں سے معصوم سمجھتے تھے اور ان کو حلال و حرام کے معاملہ میں کامل و مکمل اختیارات کا حامل سمجھتے تھے۔

غرض اہلِ کتاب کے نزدیک پوپ ایک مستقل حُجّت تھا گویا حق و باطل، حلال و حرام، جنت و دوزخ کی تقسیم کا سارا اختیار ان کے قبضہ میں تھا اس لیے ان کے عوام اپنے علما اور مشائخ کو پیسے دے کر یا ان کو داد دے کر ان سے اپنی مرضی کے مطابق کتابِ الٰہی کے خلاف فتوے حاصل کر لیتے تھے۔

قوم کے امرا، بااثر و دولت مند لوگ اپنے علما اور مشائخ کو داد یا انعام و اکرام یا ان کے منہ مانگے نذرانے دے کر ان سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرایا کرتے تھے، معاملات اور قضایا میں رشوت دے کر ان سے اپنے معاملات اور مقدمات کے فیصلے کروایا کرتے تھے، بلکہ کیتھولک فرقے کے پوپ تو جنت کے ٹکٹ دے کر بخشش گناہ کے پروانے لکھ دیا کرتے تھے جیسا کہ مؤرخین نے اس کی تشریح کی ہے۔ قرآن مجید نے اپنے معجزانہ کلام میں ان کے علماو مشائخ کے ان تمام کرتوتوں کو چند جملوں میں یوں بیان فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ

"اے ایمان والو! (اہلِ کتاب کے) زیادہ علما اور درویش لوگوں کا مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں"۔ (التوبہ:۳۴)

قرآن مجید نے اس آیتِ کریمہ اور متعدد مقامات میں اہلِ کتاب کے علما اور درویشوں کی ایک بہت بڑی

گمراہی یہ بتلائی ہے کہ وہ ناجائز طریقوں سے لوگوں کا مال کھالیتے تھے، حالانکہ ان کے علما و مشائخ تو اعلانیہ ڈاکے ڈال کر لوگوں کے مال نہیں لوٹتے تھے، بلکہ وہ یہی کچھ تھا کہ قانون سازی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر مختلف طریقوں سے لوگوں کا مال ناحق کھالیتے تھے مثلاً کہیں اللہ تعالیٰ کا حکم چھپایا، کہیں تلبیس سے کام لیا اور کہیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑ مروڑ کر یا کوئی حیلہ بہانہ نکال کر اللہ تعالیٰ کا حکم بدل ڈالا وغیرہ وغیرہ اور ادھر ان کے عوام کا یہ حال تھا کہ انہوں نے اپنے علما و مشائخ کو خدائی اختیارات دے رکھے تھے وہ جو بھی کچھ غلط سلط کہتے اگرچہ وہ حکم ان کے نزدیک بھی صریح طور پر کتاب کے خلاف ہوتا تب بھی وہ اس کو قبول کر لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ اہلِ کتاب نے حلت و حرمت کے مکمل اختیارات اپنے علما و مشائخ کو دے رکھے تھے اور ان کی اکثریت اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کی مرضیات کے متلاشی نہ تھی، ورنہ اگر وہ واقعی اپنے علما و مشائخ کو صرف اللہ تعالیٰ کے احکامات بیان کرنے والے اور صرف اس کی کتاب کی تشریح کرنے والے مانتے تو پھر انعام، نذرانہ اور رشوت دے کر ان سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرانے کی زحمت نہ اٹھاتے۔

یاد رہے! اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو بھی متنبہ کیا جارہا ہے کہ کہیں وہ اس عظیم جرم میں مبتلا نہ ہو جائیں لیکن جو کچھ آج کل ہو رہا ہے وہ کسی بیدار شخص پر پوشیدہ نہیں۔

مجتہدین کا نئے واقعات میں نئے حکم لگانا

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں نئے نئے واقعات اور مسائل پیش آتے ہیں اور علمائے اسلام ان کے متعلق حکم دیتے ہیں تو کیا وہ ان کا اپنا حکم نہیں ہوتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ علمائے اسلام قرآن و سنت سے احکام کے کلی اصول، ان کے علل و اسباب اور مصالح و مقاصد کو سامنے رکھ کر ان کے مطابق نئے پیش آنے والے واقعات اور صورتوں کا فیصلہ نکالتے ہیں، اس بنا پر وہ اپنے اجتہاد اور قیاس سے کوئی نیا حکم نہیں دیتے، بلکہ وہ تو صرف یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ احکام و تعلیمات کے تحت اس نئے واقعہ اور صورت کا حکم یہ ہے، یہی ایک معقول طریقہ بھی ہے اور اسی طریقے کو اختیار کرنے کی متعدد حدیثوں میں ہدایت بھی دی گئی ہے۔ یہاں صرف ایک حدیث شریف نقل کرتا ہوں، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ وَإِذَا حَكَمَ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ

"جب کوئی فیصلہ کرنے والا فیصلہ کرے اور اجتہاد کرے اور اجتہاد کرتے ہوئے (قرآن و سنت کے اصول اور منشا کے عین مطابق) درست فیصلہ کرے تو اس کو دوہرا اجر ملے گا اور اگر اس نے اجتہاد (اور انتہائی کوشش) کر کے فیصلہ ایسا کیا جس میں اس سے خطا سرزد ہوئی تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اجتہاد اور قیاس کے متعلق ایک ضروری وضاحت

لیکن یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ہر شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دینی مسائل میں اجتہاد کرتا رہے، بلکہ اجتہاد کے لیے مخصوص صلاحیتوں کا ہونا لازم ہے جو مجتہد کو اس قابل بنا دیں کہ وہ احکام کے نکالنے اور استدلال کے کام کو کما حقہٗ انجام دے سکے۔ پھر اجتہاد کی بھی مختلف قسمیں ہیں مثلاً تمام فقہی اور فروعی مسائل میں اجتہاد کرنا یا کسی ایک خاص مسئلہ میں اجتہاد کرنا وغیرہ وغیرہ، ان سب کے لیے مخصوص شرائط ہیں مثلاً یہ کہ وہ صاحب الرائے ہو، صاحبِ فراست و بصیرت ہو، انصاف پسند ہو، پاکیزہ اخلاق کا مالک ہو، احکام سمجھنے کی پوری بصیرت رکھتا ہو یعنی دلائلِ شرعیہ اور احکام نکالنے کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو، عربی زبان پر پورا عبور حاصل ہو، قرآن مجید کی تفسیر اور احادیث کے راویوں کے حالات، جرح و تعدیل کے طریقوں اور ناسخ و منسوخ کی حقیقت سے پوری طرح باخبر ہو اور وہ شریعت کے مقاصد و مصالح سمجھنے کی پوری مہارت رکھتا ہو، متقی اور پرہیز گار ہو وغیرہ وغیرہ جو لوگ اجتہاد کی شرائط پر پورا اترے بغیر مسائل کے استنباط و استخراج کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں ایسے لوگوں کو تو مسائل میں پوری کوشش کرنے کے باوجود ان کے فیصلے جہنم میں جھونک دیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ:

اَلْقُضَاةُ ثَلَاثَةٌ وَاحِدٌ فِي الْجَنَّةِ وَاثْنَانِ فِي النَّارِ فَاَمَّا الَّذِي فِي الْجَنَّةِ فَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَقَضٰى بِهٖ وَرَجُلٌ عَرَفَ الْحَقَّ فَجَارَ فِي الْحُكْمِ فَهُوَ فِي النَّارِ وَرَجُلٌ قَضٰى لِلنَّاسِ عَلٰى جَهْلٍ فَهُوَ فِي النَّارِ

"قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں ایک قسم جنت میں جانے والے ہیں اور دو قسم دوزخ میں، جنت میں جانے والا قاضی تو وہ شخص ہے جس نے حق کو جانا اور پھر حق ہی کے مطابق فیصلہ کیا اور جس نے حق جانا مگر (اس کے باوجود) اپنے حکم و فیصلہ میں ظلم کیا تو وہ دوزخ میں چلا جائے گا اور (اسی طرح) جو شخص جہالت پر (یعنی منصب و اجتہاد کے قابل نہ ہونے کے باوجود) لوگوں میں فیصلہ کرتا ہے تو وہ دوزخ میں جائے گا"۔ (ابو داؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

نیز ایسے لوگوں کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں یوں آیا ہے:

اِتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوْسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا

"لوگ جاہلوں کو پیشوا بنائیں گے اور ان سے مسئلے پوچھیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے لہٰذا وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے"۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

غور فرمائیے! آج کل علمائے راسخین کا حال تو یہ ہے کہ وہ فقہی اختلافی مسائل میں سلف صالحین اور ائمہ حق کی تقلید و اتباع کرتے ہیں اور نئے مسائل کا حکم نکالنے میں قرآن و سنت کے اصول کے ساتھ اسلاف اور ائمہ متبوعین کے فیصلوں کو بھی سامنے رکھ کر قرآن و سنت کی منشا تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس کے برعکس وہ لوگ جن کو عربی زبان سے بھی پوری طرح واقفیت نہیں، بلکہ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جو قرآن مجید و حدیث کے اردو ترجموں کو بھی اچھی طرح نہیں سمجھتے وہ بھی اسلاف اور مجتہدین پر نکتہ چینی کر کے اپنے آپ کو ان سے زیادہ اجتہاد کے حق دار سمجھتے ہیں اور ان میں سے بعض سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکہ دے کر یوں کہتے ہیں کہ اسلاف کی پیروی کو چھوڑ کر قرآن و سنت کی پیروی کرو یا اسی طرح دوسرے خوشنما الفاظ کے پردے میں مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتے ہیں حالانکہ وہ کون سا مسلمان ہے جو قرآن و سنت سے انکار کرتا ہوگا یا ان کے واضح احکامات کو چھوڑ کر دوسروں کی تقلید کرتا ہوگا۔ لیکن فرق صرف یہ ہے کہ یہ جاہل لوگ اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ قرآن و سنت کے غیر واضح اور مبہم احکامات کی جو تشریح اپنی خواہش اور جہالت میں ہم کرتے ہیں اس کو مان لو۔ اس کے برعکس اسلاف کی تقلید کرنے والے کہتے ہیں کہ ایسے غیر واضح مسائل میں سیدھی سادھی راہ یہی ہے کہ ایسے مسائل میں اسلاف کے فیصلوں کو دیکھا جائے اور ایسے مسائل میں ہم ان پر اعتماد کرتے ہیں کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں کہ ان میں اجتہاد کی شرائط موجود ہونے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایسی پاک ہستیوں سے دینی علم و تربیت حاصل کی تھی جو براہِ راست صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا ان کے خاص شاگردوں کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے تو کہاں ان پاکیزہ اور سچوں کا اجتہاد جن کی رگ رگ میں شریعتِ مطہّرہ کی روح دوڑ رہی تھی اور کہاں یہ جھوٹے لٹیرے جن کا نہ علم ہے اور نہ عمل، بلکہ عصرِ حاضر میں مغرب کے کچھ شیدائی ایسے بھی ہیں جو اجتہاد صرف غیر واضح اور مبہم مسائل میں نہیں کرتے، بلکہ وہ تو قرآن و سنت کے واضح اور متفقہ احکامات میں بھی اصلاح و تبدیلی کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ایسا شخص کا عالم دین ہونا تو کیا یہ تو سرے سے مسلمان ہی نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی یہ لوگ اسلامی معاشرہ میں جی رہے ہیں، بلکہ ان کو طرح طرح کے القابات سے نوازا جا رہا ہے۔ فالی اللہ المشتکیٰ

پس ایسی حالت میں جبکہ اجتہاد اتنا آسان اور سستا ہو گیا ہے کہ جن کو اردو کے ترجمے بھی اچھی طرح نہیں

آتے وہ بھی اپنے کو اجتہاد کا حق دار سمجھتے ہیں سلامتی کی راہ یہی ہے کہ فروعی اور فقہی مسائل میں ائمہ حق میں سے ایک کی تقلید اور اسلاف کی اتباع پر مضبوطی سے جما جائے، بلکہ اس وقت امت جس حالت اور جس تنزل کا شکار ہے اس کے لیے فقہی طے شدہ مسائل میں نئے نئے اجتہادات کی ضرورت ہی نہیں، بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں ایمان اور ایمان والی زندگی پیدا کی جائے اور ان کو اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ دینِ اسلام کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے والے بن جائے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنی جان و مال کو کچھ بھی نہ سمجھے اور عین شہادت کے وقت ان کی آرزو یہ ہو کہ

رضائے جان جاناں جان دینے پر بھی سستی ہے — جان دی دی ہوئی انہی کی تھی

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ دینِ اسلام میں حلت و حرمت اور قانون سازی کا سارا اختیار صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کو ہے وہ اپنی کتاب قرآن مجید یا رسول اللہ ﷺ کی زبانی بندوں کو آگاہ کرتا ہے۔

مجتہدین کا اجتہاد کن مسائل میں ہوتا ہے؟

اسلام میں مجتہدین کا جو اجتہاد ہے اس کے متعلق تو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قیاس و اجتہاد صرف انہی مسائل میں ہو سکتا ہے جو غیر منصوص ہوں یعنی جن مسائل کی تصریح و وضاحت میں قرآن و حدیث خاموش ہوں ان میں قرآن و حدیث کی روح کو پیش نظر رکھ کر غیر منصوص یعنی غیر مذکور مسائل کو معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کا نام اجتہاد ہے۔ یہ نہیں کہ ذکر شدہ احکام و مسائل ہی کو بدل دیا جائے یا انہیں معطّل کر دیا جائے اس کا نام اجتہاد نہیں، بلکہ یہ دین میں تحریف و تنسیخ ہے اور یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے کہ وہ اپنے جس حکم کو چاہے اپنے رسول ﷺ کے ذریعے منسوخ کر دے اور جس کو چاہے برقرار رکھے، لہٰذا ایک مجتہد کبھی شارع نہیں بن سکتا اور نہ کبھی وہ اس منصب پر فائز ہو سکتا ہے اور یہ بات تو معلوم ہے کہ مسلمان اور اہل سنت والجماعت جو فقہا و علما اور سلف صالحین کی اتباع کرتے ہیں تو وہ ان کو خدا یا خدا کے قائم مقام سمجھ کر یا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں لا کر نہیں کرتے، بلکہ وہ تو غیر واضح مسائل میں اسی وجہ سے ان کی اتباع کرتے ہیں کہ عام علما اور عوام قرآن و حدیث سے مسائل کے استنباط و استخراج کی قدرت نہیں رکھتے[1] اس لیے وہ غیر واضح مسائل میں ان لوگوں کی طرف رجوع کرتے ہیں جو استنباط کی اہلیت اور قابلیت رکھتے ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کا صحیح حکم معلوم کر کے اس کی تعمیل کی جائے، یہ تو اللہ

① اس کی پوری تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "عقیدہ اور عقیدت باب شرک فی الطاعت"۔

تعالیٰ کی اطاعت ہے اور یہی طرز و طریقہ صرف عقلی نہیں، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھی اس کی ہدایت فرمائی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾

"اگر تم خود نہیں جانتے تو اہلِ علم سے پوچھ لو"۔ (النحل:۴۳)

الحمد للہ مسلمانوں کے خواص و عوام اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ علما اور فقہائے اسلام کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بیان کرتے ہیں اور قرآن و سنت ہی سے استنباط کر کے کسی چیز کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں چیز یا فعل شریعتِ مطہّرہ کی رو سے جائز ہے یا ناجائز۔

علما اور فقہائے اسلام شارع (شریعت ساز) نہیں، بلکہ شارحینِ قانون (یعنی قرآن و سنت کی تشریح کرنے والے) ہیں وہ مستقل حُجّت اور خطا سے معصوم نہیں، بلکہ ان کے ہر اجتہادی مسئلہ میں خطا کا احتمال موجود ہے اور عوام کا بھی ان کے متعلق یہی عقیدہ ہے اس لیے وہ رشوت دے کر ان سے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کروانے کی جرأت نہیں کرتے، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم معلوم کر کے اس کی اتباع کرتے ہیں اور جو کوئی اس کے خلاف نظریہ اور رویہ اختیار کر لیتے ہیں تو یہ ان کی اپنی گمراہی ہو گی۔

اسلام اور امتِ مسلمہ کا دامن اس سے پاک ہے نیز الحمد للہ قرآن مجید ایک ایسی کتاب ہے جس میں لفظی تحریف ناممکن ہے اس لیے اگر کوئی غلطی اور ٹھوکر کھا کر یا کوئی بدبخت قصداً لوگوں کو خوش کرنے کے لیے معنوی تحریف کر کے شریعتِ مطہّرہ کے کسی حکم کو غلط جامہ پہناتا ہے تو دوسرے علما اس کی اس غلطی یا خیانت کو منظر عام پر لا کر مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہمیشہ اپنے پیارے دین، دینِ اسلام سے وابستہ رکھے، اس سے وفادار رکھے اور ہمیشہ حق والوں کے ساتھ راہِ حق پر چلائے رکھے۔ آمین

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ

عبادت اور اطاعت میں فرق

اطاعت کے متعلق ضروری باتیں سمجھنے کے بعد آخر میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہیے کہ بعض لوگ عقیدۂ شرکیہ کے بغیر صرف اطاعت اور سیاسی طور پر کسی کا امر اور حکم ماننے کو اصطلاحی عبادت کا درجہ دے دیتے ہیں یہ صحیح نہیں، بلکہ اطاعت اس وقت شرک ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے حکم و قانون کے خلاف اپنے یا دوسروں کے قوانین و اطاعت میں نفع و خیر سمجھ کر ان کو اختیار کیا جائے اگرچہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اطاعت پر

عبادت کا اطلاق ہوتا ہے صرف یہ نہیں، بلکہ اطاعت عبادت کا رکن اعظم بھی ہے، لیکن اس کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ ہر اطاعت شرک ہی ہو گی۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کسی چیز پر کسی چیز کا اطلاق ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس سے وہی اصطلاحی یا حقیقی معنی مراد ہو گا۔

دیکھیے! شیطان کے ماننے کو قرآن مجید نے شیطان کی عبادت بتلادیا ہے، لیکن اس کا مطلب تو یہ ہر گز نہیں کہ شیطان کی اغوا پر خواہشِ نفس کی وجہ سے جو بھی گناہ کیا جائے اسے اصطلاحی شرک سمجھا جائے گا۔

لوگ شیطان کے ورغلانے پر ایک دوسرے کو گالیاں دے دیتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ یہ ساری چیزیں گناہ ضرور ہیں اور ان میں سے بھی بعض بعض کے مقابلہ میں بڑے بڑے گناہ ہیں لیکن یہ اصطلاحی شرک نہیں۔

اسی طرح انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر اپنے نفس کی خواہش کو پورا کر کے گناہ کرتا ہے، یہ گناہ ضرور ہے لیکن اس سے مراد اصطلاحی عبادت ہر گز نہیں ورنہ پھر تو جذبات کی رو میں بہہ کر انسان کا جو قدم بھی شریعت کے خلاف اٹھے گا وہ نفس و شیطان کی عبادت کی وجہ سے مشرک ہو جائے گا حالانکہ شریعت کے خلاف کاموں میں خلافِ اولیٰ یعنی نامناسب کام سے لے کر شرک و کفر تک کے تمام افعال شامل ہیں۔

نیز لوگ باہمی محبت کی بنیاد پر ایک دوسرے کی اطاعت کرتے ہیں اور بعض فائدے حاصل کرنے کی خاطر اور بعض دباؤ کی خاطر مخلوق کی اطاعت اور تابعداری کرتے ہیں لیکن ان تمام تابعداریوں کو غیر اللہ کی عبادت اور شرک اس وقت قرار دیا جائے گا جب کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قانون اور ہدایت کے خلاف بھی ہوں اور یہ کہ ان تابعداریوں اور حکم کو اللہ تعالیٰ کے حکم و قانون کے مقابلے میں بالذات نافع سمجھ کر اختیار کیا جائے جیسا کہ بہت سے مسلمان ممالک کے حکمران اللہ تعالیٰ کی ہدایات قرآن مجید کے مقابلے میں عوام کی حکمرانی مغربی قوانین کو ترجیح دے دیتے ہیں اور قرآن مجید کے مقابلے میں خدا سے بے زار مغربی قوانین اور تہذیب کو بہتر سمجھ کر اپنا چکے ہیں بلاشبہ ایسے حکمران پکے مشرک اور کافر ہیں۔

نیز بعض پڑھے لکھے علمانے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جہاں کسی شخص نے ان کے معتقدات میں سے (خواہ وہ خلاف واقعہ اور خلاف اصل ہی ہوں) کسی چیز کا ذرا سا بھی انکار کیا تو اس پر کفر و شرک اور بدعت کا فتویٰ لگا دیتے ہیں گویا کفر و اسلام، توحید و شرک، بدعت اور سنت ان کے معتقدات کے ماننے یا نہ ماننے پر منحصر ہے، یہ نہایت سنگین غلطی ہے دیدہ دلیری اور دیدہ دھنی ہے اور یہ وہی فرعونی ذہنیت ہے کہ اپنے آپ کو حلال و حرام کا ٹھیکیدار

باور کرا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں شریک کرتے ہیں اور عوام کو دھوکہ دینے کے لیے نام قرآن و سنت یا دینِ اسلام کا استعمال کر کے اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر جھوٹ باندھنے کے عظیم جرم کے بھی مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی ذہنیت اور ایسی ظالمانہ حرکتوں سے بچائے رکھے اور اگر کوئی اس مرض میں مبتلا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے دے اور سچی توبہ کی توفیق عنایت فرمائے۔

اقسامِ شرک کا خلاصہ

شرکِ اصلی کی اقسام کا خلاصہ یہ ہوا:

۱.... اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ مثلاً دوسرے خدا کو ماننا یا اللہ تعالیٰ کو کسی کا جزو ماننا یا کسی کو اس کا جزو ماننا۔

۲.... اللہ تعالیٰ کی صفات میں (جس مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ کے لیے مستعمل ہیں اسی مفہوم میں) کسی مخلوق کو شریک ماننا۔

۳.... اللہ تعالیٰ کے اختیارات میں کسی مخلوق کو شریک کرنا، یعنی اسباب سے بالاتر کسی کے لیے کسی طرح ملک اور اختیار کا قائل ہونا یا کسی کو نفع و نقصان یا عزت و ذلت کا مالک ماننا۔

۴.... اللہ تعالیٰ کا اطاعت میں شرک یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے متعلق یہ سمجھنا کہ اس کو حلال و حرام اور شریعت بنانے کا حق حاصل ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے احکامات میں تبدیلی کا اختیار رکھتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کی پیروی کرنا۔

۵.... مذکورہ بالا اقسام شرکِ اصلی کی اقسام ہیں، ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ شرک نہیں ہیں لیکن صورتِ شرک یا ذریعہ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کے دروازے کھول دیں گی، ایسی چیزیں بھی شریعت میں ممنوع اور حرام ہیں اور ان کو شرکِ صوری یا شرکِ عملی کہا جاتا ہے مثلاً کسی کے متعلق یہ عقیدہ نہ ہو کہ وہ نفع و نقصان کا مالک ہے لیکن اس کے سامنے صرف بطورِ ادب و سلام رکوع یا سجدہ میں گر پڑنا یا کسی مخلوق کے متعلق یہ عقیدہ نہیں کہ وہ حاضر و ناظر ہے اور وہ میری بات کو سن رہا ہے کہ میں اس کو گواہ بنا رہا ہوں، بلکہ صرف بقصدِ تعظیم اس کی قسم کھانا اس طرح کی چیزیں چونکہ شرکِ اصلی کا سبب بن سکتی ہیں اس لیے دینِ اسلام جو آخری اور مکمل شریعت ہے اس نے اس طرح کی تمام صورتیں بھی ختم کر دیں جو ذریعہ شرک ہو سکتی تھیں۔ اس قسم کے شرک کو، شرکِ صوری یا شرکِ شبہی یا شرکِ عملی کا نام دیا جاتا ہے اور یہ

تمام چیزیں شریعتِ مطہرہ کی رو سے ناجائز اور حرام ہیں۔

شرک کا سدِّباب

مذکورہ بالا بیان میں شرک کی اقسام کا جو ذکر ہوا اور جو اس کی کچھ تفصیلات سامنے آئیں یہ شرک کی اصولی اقسام ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جو اگرچہ بذاتِ خود شرک نہیں ہیں لیکن وہ شرک کے ذرائع یا صورتیں ہیں اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی اس لیے شریعتِ مطہّرہ نے شرک کے سدِّباب کے لیے ان ذرائع اور صورتوں کو بھی بند کر دیا مثلاً:

قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا یعنی اگرچہ قبلہ رو ہو کر نماز پڑھی جائے لیکن سامنے قبر ہے تو شریعتِ مطہّرہ اس بات کو ناپسند کرتی ہے کہ قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی جائے، بلکہ بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ قبرستان میں بھی نماز نہ پڑھی جائے۔

اسی طرح غیر اللہ کے نام قسم کھانے کو ممنوع کر دیا کیونکہ جو شخص کسی کے نام پر قسم کھاتا ہے تو وہ اس کو
۲ بطورِ شاہد اور گواہ کے پیش کرتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس نے غلطی کی ہے تو وہ شاہد اور گواہ اس کو تباہ سکتا ہے اس لیے شریعتِ مطہّرہ نے اس کو شرک قرار دیا ہے اور جاندار چیزوں کی تصویر پر پابندی لگا دی، کسی کے سامنے دست بستہ کھڑے ہونے کو منع فرمایا، بلکہ اگر دست بستہ نہ بھی ہو لیکن کوئی بادشاہ وغیرہ بیٹھا رہے اور دوسرے لوگ اس کے اردگرد تعظیم کے لیے کھڑے ہوں تو اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا جیسا کہ اس کی تفصیل "عقیدہ اور عقیدت" میں بیان کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعض خاص ناموں کو بغیر "عبد" کے ممنوع قرار دیا مثلاً رحمٰن کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے، بلکہ عبد
۳ الرحمٰن کہنا چاہیے۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے متعلق بھی یوں فرمادیا ہے کہ میری مدح و تعریف میں مبالغہ نہ کرو جیسا
۴ کہ نصاریٰ نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) ابن مریم کی مدح میں مبالغہ سے کام لیا، میں تو صرف اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں لہٰذا مجھے اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول کہا کرو۔

نیز کسی چیز سے بدفالی اور بدشگونی کو شرک کے مترادف قرار دیا۔

۵ ..... عمل میں بے اخلاصی کو خفی شرک قرار دیا اور بتلا دیا کہ جو عمل (خواہ اپنی شکل و صورت میں کتنا توحید کا عمل
۶ سمجھا جاتا ہو لیکن اگر وہ) ریا اور شہرت پسندی سے آلودہ ہو جائے تو وہ ایک قسم کا شرکیہ عمل ہو جائے گا۔

ے.... ماشاء اللہ

اللہ تعالیٰ کے کام کے ساتھ صرف لفظی مساوات اور برابری کو بھی ممنوع قرار دیا اور بتلایا کہ
و شاء فلان ماشاء اللہ ثم شاء فلان
”جو اللہ تعالیٰ اور فلاں چاہے“ مت کہا کرو، بلکہ یوں کہا کرو ”جو اللہ تعالیٰ
چاہے پھر اس کے بعد فلاں چاہے“۔

۸.... یہی نہیں، بلکہ نمازی اپنی نماز کے لیے جو سترا (یعنی لکڑی وغیرہ) کو اپنے سامنے کھڑا کر دیتا ہے اس کے متعلق بھی یہ ہدایت ہے کہ وہ بالکل پیشانی کی سیدھ میں کھڑا نہ کیا جائے دائیں یا بائیں جانب ہونا چاہیے جیسا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض امور جو تفصیل طلب ہیں، ان کا بیان اپنی اپنی جگہ پر آ جائے گا۔

یہ چند مثالیں تھیں جو آپ کے سامنے رکھ دی گئیں، آگے کتاب میں ان شاء اللہ تعالیٰ اور بھی ایسے امور آ جائیں گے جس کے بعد آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ دینِ اسلام شرک کے معاملہ میں کس قدر حسّاس ہے۔

شرک اور اسبابِ شرک سے پوری طرح محتاط رہنا چاہیے

اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات واختیارات، اس کے خاص حقوق اور اس کی عبادت میں شرک کرنا یہ سب صاف اور ظاہر شرک کی اقسام ہیں اور ان کے علاوہ مثلاً اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوق کے نام پر قسم کھانا، ریا و شہرت پسندی یا عقیدہ توحید کے ساتھ بعض دیگر نازیبا طریقے یہ سب شرک یا شرک کے ذرائع واسباب ہیں یہ سب کے سب قابلِ ترک ہیں ان میں سے بعض تو شرک ہیں اور بعض کی سرحدیں حقیقی شرک کے ساتھ اتنی ملی ہوتی ہیں کہ ان میں ذرا سا قدم ڈگمگانے سے حقیقی شرک میں جا پڑنے کا خطرہ ہوتا ہے اس لیے دینِ اسلام کی صحیح اتباع یہ نہیں کہ شرک اور مشرکین کے مشابہ افعال تاویل کر کے اختیار کیے جائیں، البتہ تاویل حسن ظن کی بقا کے لیے دوسرے مسلمان کے قول میں اختیار کریں لیکن اپنے متعلق تو صحیح راستہ یہی ہے کہ جن افعال سے کفر و شرک کی ذرہ برابر بھی بو آئے ان کو بھی کفر و شرک کی طرح سمجھ کر ان سے عملاً بے زار رہا کریں۔

مومن اور موحّد کے ایک ایک عمل اور اس کی ایک ایک حرکت سے توحید ٹپکنی چاہیے

یہ بھی یاد رہے کہ شریعتِ مطہّرہ صرف یہ نہیں چاہتی کہ مسلمان غیر مسلموں سے صرف عملی لحاظ سے ممتاز نظر آئے، بلکہ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ مسلمان کی ایک ایک حرکت اور اس کی ایک ایک ادا سے توحید اور بندگی ظاہر ہو تا کہ ایک مسلمان غیر مسلموں سے صرف عقیدہ اور چند اعمال میں مختلف نظر نہ آئے، بلکہ لباس، وضع قطع اور معاشرت وغیرہ ہر لحاظ سے اس قدر ممتاز ہو کہ پہلی نظر سے اس کو پوری طرح جان لیا جائے کہ یہ مسلمان ہے اس لیے شریعتِ مطہّرہ نے مسلمانوں کو غیر مسلم قوموں کے شعار، ان کی معاشرت اور ان کے طرز پر لباس

اور وضع قطع سے روک دیا ہے اور صاف اعلان فرمایا ہے: من تشبہ بقوم فھو منھم "جو شخص (وضع قطع وغیرہ میں) جس قوم کی مشابہت اختیار کرے وہ انہی میں سے ہے"۔ (ابوداؤد، احمد، مشکوٰۃ، کتاب اللباس)

جس کا مطلب یہ ہے کہ کفر و اسلام اور توحید و شرک کا امتیاز صرف اعتقادی مرتبہ میں نہ رہے، بلکہ عملی وضع قطع، طرزِ زندگی چال ڈھال ہر ہر چیز سے ٹپکنے لگے اور کفر و اسلام، توحید و شرک میں ہر لحاظ سے امتیازی لکیر کھینچی جائے۔

تشبُّہ کا غلط معنی

یہاں یہ بات یاد رہے کہ تشبُّہ کا یہ معنی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے بتلائے ہوئے اعمال یا طرزِ زندگی لباس وغیرہ کو اگر کفار و مشرکین اختیار کرلیں تو ہمیں اسے چھوڑ دینا چاہیے ایسا ہر گز نہیں کیونکہ پھر تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمانوں کا خود کوئی اصل مرکز اور مقام نہیں بلکہ صرف دوسروں سے مخالفت برائے مخالفت ہے حالانکہ ایسا ہر گز نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان جس راہِ حق پر چل رہے ہیں اگر اس میں دوسرے لوگ ان کی اتباع کرتے ہیں تو یہ ان کے کفر و شرک میں اسلامی تعلیم کا ایک عکس ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی کمزوری اور ناگواری کی بات ہو تو ان کے لیے ہونی چاہیے کہ انہوں نے اپنی تہذیب وغیرہ کو برا سمجھ کر چھوڑ دیا اور مسلمانوں کی اتباع کرکے ان کے طریقوں کو اپنالیا نہ یہ کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے طریقوں کو چھوڑ کر اپنے مقام اور راہِ حق سے ہٹ جائیں، اس لیے کفار و مشرکین اور گمراہ فرقوں کی مخالفت میں اسلامی لباس اور طرزِ زندگی وغیرہ کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ تو ان گمراہوں پر الزام لگایا جائے کہ وہ اپنی تہذیب وغیرہ چھوڑ کر مسلمانوں کے پیچھے چلنے والے ہیں لہٰذا ایسی صورتوں میں کبھی بھی ہم اپنے اصل مرکز اور اپنے اصل مقام راہِ حق سے دست بردار نہیں ہوں گے خواہ کوئی ہمارے طریقوں، ہمارے لباس کو اپنائے یا چھوڑے۔

توحید کا پورا پورا نقشہ

مذکورہ بالا پوری بحث سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ توحید اور ایمان کا پورا نقشہ صرف زبان سے کلمہ پڑھ لینے سے سامنے نہیں آسکتا جب تک کہ وہ انسانی زندگی کے ہر بڑے چھوٹے گوشے میں ظاہر نہ ہونے لگے اور مسلمان کا ہر عمل اللہ تعالیٰ ہی کے لیے اس طرح خالص ہو کر نہ رہ جائے کہ اس میں الحب فی اللہ و البغض فی اللہ مثبت اور منفی ہر دو پہلو ممتاز نظر آنے لگے، یعنی ایک طرف تو وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا پرچم لہراتا ہو، اللہ تعالیٰ کے احکامات اور اس کے بتلائے ہوئے طریقوں پر دل و جان سے چلتا ہو، اللہ تعالیٰ کے شعائر سے محبت رکھتا

ہو، ان کی تعظیم و تکریم کرتا ہو۔ اور دوسری طرف توحید کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور سے سخت متنفر اور بے زار ہو کر ان کی سرکوبی کی بھی کوشش میں لگا رہے۔ بلاشبہ توحید اور ایمان کے دعویٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید و ایمان کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور کے ساتھ موافقت کی ادنیٰ گنجائش باقی نہیں رہتی۔ گذشتہ صفحات سامنے رکھیے اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ کفر و شرک کی عام فضاؤں میں جب کبھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی آئے تو ان کا مقصد صرف توحید و ایمان اور نیک اعمال پھیلانا نہ تھا، بلکہ وہ کفر و شرک اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور سے سخت بے زاری اور ان کے مٹانے کی مسلسل کوشش بھی کرتے تھے، مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھیے انہوں نے تنہا بلا کسی خوف کے پوری قوم سے ٹکر لی اور ان سے یوں فرمایا:

وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ اَدْعُوْا رَبِّيْ ؗ

"اور میں تم سب سے الگ ہو جاتا ہوں اور ان سے بھی جنھیں تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو میں تو اپنے پروردگار ہی کو پکارتا ہوں"۔ (مریم:۴۸)

ان کے بتوں کے متعلق یوں خطاب فرمایا:

فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝

"پس یہ سب میرے دشمن ہیں بجز ایک رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہ (ہر قدم پر) میری رہنمائی کرتا ہے"۔ (الشعراء:۷۷-۷۸)

اور کبھی قوم کو چیلنج کرتے ہوئے یوں فرمایا:

وَ تَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝

"اور اللہ کی قسم میں ضرور تمہارے بتوں کا بندوبست کروں گا جب تم لوگ پیٹھ پھیر کر چل دو گے"۔ (الانبیاء:۵۷)

اور پھر ایسا ہی کر کے دکھا دیا جیسا کہ فرمایا تھا۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے منکرینِ حق کو کہلوایا گیا:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝

"کہہ دو کہ اے کافرو! میں ان (بتوں) کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو"۔ (الکفرون:۱-۲)

بہر حال اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کی تعلیمات اور ہدایات کو لے کر ان کے خلاف سے سخت بے زار ہیں، انہوں نے کبھی توحید کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور کے ساتھ

مصلحت اور جوڑ کی راہ اختیار نہیں کی اور انہوں نے ایک ایسی جماعت بنائی جو ہر طرف سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کی ہو کر اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں گم ہو کر رہ جاتی، بلکہ اگر کوئی شخص یا جماعت اپنی نظر آتی تھی جس نے بظاہر تو اتفاق کیا مگر وہ دوسروں کے ساتھ لگے رہنے کا بھی ارادہ رکھتے تھے تو انہوں نے ایسے لوگوں کو منافق کا لقب دے کر اپنی جماعت سے بالکل ایک علیحدہ جماعت سمجھا۔

خلاصہ یہ کہ ایمان و توحید کا مثبت پہلو جتنا اہم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے لیے دوسروں سے محبت، توحید اور اعمال صالحہ اتنا ہی اہم منفی پہلو ہے اور وہ ہے توحید و ایمان کے خلاف اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ امور سے بے زاری، ان سے بغض اور ان کو مٹانے کی کوشش کرنا۔

توحید کی فضیلت اور شرک کی مذمت

اب اس کے بعد توحید کے متعلق چند فضائل اور شرک کے متعلق چند وعیدیں پیش کی جاتی ہیں ان کو پڑھ لیجیے:

۱..... اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

"جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو ظلم (یعنی شرک) سے آلودہ نہیں کیا تو ان ہی کے لیے امن ہے اور وہی راہِ راست پر ہیں"۔ (الانعام: ۸۲)

۲..... حضرت عبداللہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ

"جو شخص یہ گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ گواہی دے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور کلمہ ہیں جو اس نے حضرت مریم کی طرف القاء فرمایا اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح ہیں نیز جنت و دوزخ کی شہادت دے تو ایسے شخص کے اعمال کیسے بھی ہوں اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا"۔ (بخاری و مسلم)

۳..... ایک حدیث شریف میں ہے:

فَاِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِىْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ

"جو شخص محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے لا الہ الا اللہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ کو حرام

کر دیے ہیں

(حوالہ بالا)

۴....مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَ مَنْ لَقِيَهٗ يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ
جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس طرح پیش ہو کہ اس کا دامن شرک سے پاک ہو وہ جنت میں جائے گا اور جو شرک کرتا رہا اور اسی حالت پر مر گیا وہ جہنم میں جائے گا"۔

(مسلم) [1]

۵....لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَ قَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾
بے شک کافر ہوئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح ابن مریم ہے حالانکہ خود مسیح (علیہ السلام) کی تعلیم تو یہ تھی کہ اس) نے کہا اے بنی اسرائیل! تم اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا پروردگار ہے، بلاشبہ جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا"۔

(المائدہ:۷۲)

۶....اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾
کیا پھر بھی ان کافروں کا یہ گمان ہے کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا (سرپرست اور کارساز بنالیں، بے شک ہم نے کافروں کی مہمانی کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے"۔

(الکھف:۱۰۲)

۷....اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾
بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں جس کے لیے چاہتا ہے معاف کرتا ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹک کر بہت دور نکل گیا گمراہی میں"۔

(النساء:۱۱۶)

مذکورہ بالا آیت میں یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ توحید پر جس کا ایمان ہے اور جو اللہ تعالیٰ کو اپنا الٰہ دل سے

---

[1] اس طرح کی حدیثوں کا مطلب اور تفصیل باب اسلام وایمان میں موجود ہے۔

بغیر کسی تذبذب اور شک کے مان چکا ہے اور اس کی عبادت اور بندگی خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ ہی کو اپنی تمام حاجتوں کو پورا کرنے والا اور مشکل کشا یقین کر چکا ہے تو ایسے شخص سے اگر کبھی ایسا عمل ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اسلام کے خلاف ہو تو اگرچہ وہ بھی سزا کا مستحق ہے، لیکن پھر بھی چونکہ شرک کے نہ مٹنے والے داغ سے اس کا دامن پاک ہے اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے قانونِ مشیت کے مطابق اس کو یا تو بالکل ہی معاف کر دے گا اور یا اگر چاہے گا تو اس کو سزا دے کر بالآخر اپنی رضا و خوشنودی کی آغوش میں لے کر جنت میں داخل کر دے گا۔ البتہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کی مرضیات کی اطاعت اور بندگی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھتا، بلکہ دوسروں کو بھی اس میں شریک قرار دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو بھی الٰہ بنالیتا ہے تو ایسا شخص اگر اس شرک کی حالت میں مر جاتا ہے تو بہت ہی بری حالت میں مرتا ہے، کیونکہ شرک خالقِ کائنات کے ساتھ بغاوت بھی ہے اور شرک کی خاصیت یہ ہے کہ وہ انسان کے جسم اور روح دونوں کو باطل اور نجس کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ شرک پر مرنے والوں کے لیے نہ ٹلنے والی دائمی سزا ہوتی ہے، پھر جس شخص کا شرک جس قدر شدید ہو گا اس کی سزا بھی اسی قدر ہولناک ہو گی۔

۸.... حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ﴿٣١﴾ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿٣٢﴾

”صرف ایک اللہ کے لیے ہو کر اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا تو اس کی حالت ایسی ہے گویا کہ آسمان سے گر پڑا اور پرندے نے اس کو اچک لیا یا ہوا نے اس کو دور جگہ میں دے پھینکا، یہ ہے حقیقت اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کی تعظیم اور احترام کرتا ہے تو یہ دل کے تقویٰ کی علامت اور نشانی ہے (کیونکہ ان کی تعظیم و احترام وہی شخص کرتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور خوف ہو)“ (الحج:۳۱-۳۲)

مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے ایک حقیقت کو بیان فرمایا ہے کہ انسان جب اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کو اپنا ماویٰ و ملجاء بنالیتا ہے اور شرک یا کفر میں گرفتار ہو جاتا ہے تو وہ مقامِ عزت اور مقامِ اشرفیت کی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کے بجائے پستیوں اور ذلت کے عمیق گڑھوں میں گر جاتا ہے۔ بلاشبہ جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی ذلت اور پستی کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کائنات اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پیدا فرمائی ہے اور اس کی خدمت و تابعداری پر لگا رکھی ہے وہ خود اسی کائنات اور اس کی چیزوں کی تابعداری اور پرستش میں لگا رہتا ہے اور وہ حقیر سے حقیر چیز سے ڈرتا اور کانپتا ہے، وحشت و اوہام اور خوف و ہراس کی نذر ہو جاتا ہے،

حیوانات کی معمولی حرکت اور پرندوں کی پھڑ پھڑاہٹ سے اس پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے اور غلط تصورات کی بدولت وہ حقیقی کمالات، روحانی ترقیات اور زندگی میں خوشحالی کے کافی وسائل سے محروم رہ جاتا ہے اور اس جرم کی وجہ سے خداداد صلاحیتوں کو تباہ و برباد کر کے اپنے آپ کو دنیا و آخرت میں ذلت کے گڑھوں میں پھینکتا ہے اور اس کے اندر آگے ترقی کرنے کی رمق باقی نہیں رہتی اور ہمیشہ کے لیے ذلت والے عذاب سے دوچار ہو جاتا ہے۔

ایک بار پھر سمجھ لو! کہ اگر شرک پر ہی موت آ گئی تو ایسے شخص کی فطرت سے سعادت اور کامیابی کا تخم ہی فنا ہو جاتی ہے، اس کی تمام تر روحانی استعدادیں باطل ہو جاتی ہیں، اس کا جسم اور روح دونوں شرک کی نجاست اور گندگی میں پڑ کر نجس ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ دنیا میں بھی ذلت اور پستی کے گڑھوں میں گر کر اپنی پوری زندگی کو تباہ و برباد کرتا ہے اور آخرت میں بھی دائمی پریشانی اور دائمی عذاب میں اپنے آپ کو گرفتار کر لیتا ہے۔

قرآن مجید نے توحیدِ الٰہی کو کامل و مکمل انداز میں پیش کیا ہے

بلاشبہ قرآن مجید نے فطری عقیدہ عقیدۂ توحید کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے جو اعلیٰ ترین اور کامل و مکمل ہے اور عقلِ انسانی کو تمام خرافات واوہام کے زنگ سے پاک کر دیتا ہے۔ بے شک قرآن اللہ تعالیٰ کے متعلق ان تمام نسبتوں کا بالکل انکار کر دیتا ہے جو ذرہ برابر بھی توحیدِ خالص کے منافی ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہ کسی کو زوجیت کا رشتہ ہے اور نہ اخوّت و برادری کا، وہ نہ کسی کا بیٹا اور جزء ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا اور جزء ہے، وہ ہر طرح کی مشابہت و مماثلت سے پاک اور بلند و برتر ہے حتی کہ وہ ہر اس خیال و مشاہدہ اور احساس سے وراء الوراء ہے جس سے انسان واقف و مانوس ہے اور جس سے انسان اس مادی دنیا میں کام لیتا ہے۔

پھر جس طرح دینِ اسلام نے توحید کو ہر طرح کی کمزوری سے پاک و صاف بیان کر کے اور ہر قسم کے تجسُّم سے وراء الوراء بتلا کر توحید خالص کی طرف دعوت دی ہے۔ اسی طرح توحید کے اس فلسفیانہ عقیدے کی بھی تردید کی ہے جو یہ کہتا ہے کہ وہ قادر ہے بغیر قدرت کے، وہ خالق ہے بغیر خلق کے، وہ سمیع ہے بغیر سمع کے وغیرہ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو جاتا ہے کہ خدا کوئی ایسی ہستی ہے جس کے لیے تعطُّل لازم ہے۔ اسلام نے بتلا دیا اور ثابت کیا کہ وہ سمیع و بصیر ہے، دیکھتا اور سنتا ہے، وہ قدرتِ کاملہ کے ساتھ قادر ہے اور صفتِ کرم و رحم کے ساتھ کریم و رحیم ہے، البتہ اس کی صفات جیسے سمع و بصر جو مخلوق میں دکھائی دیتی ہیں ان کا اللہ تعالیٰ کی صفت سمع و بصر کے ساتھ دور کی بھی کوئی ادنیٰ مشابہت و نسبت نہیں جس طرح وہ اپنی ذات میں یکتا ہے اسی طرح صفات میں بھی ہے: لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ "کوئی چیز اس کی مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے"۔

کیا اسباب سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں؟

اسلام اگرچہ مخلوقات میں خصوصیات و حکمت اور ان میں فائدہ و نقصان کو مانتا ہے، اور اس کا منکر نہیں ہے کہ اسباب و ذرائع اور دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھایا جائے اور ان سے مدد لی جائے لیکن ان تمام ذرائع و اسباب سے نفع اٹھانے کے ساتھ ساتھ یہ تعلیم بھی دیتا ہے کہ ہر نفع و نقصان کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لہٰذا ہر نفع و نقصان اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھیں، کیونکہ وہی ذات بابرکت ان تمام مخلوقات کے اسباب و ذرائع کا خالق بھی ہے اور مالک بھی اور وہی ان مخلوقات اور ذرائع سے نفع و نقصان اٹھانے کی صورتوں کو پیدا کرتا ہے، اس لیے ان اسباب و ذرائع کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر حسبِ مراتب ان کا احترام اور قدردانی ضروری ہے، لیکن ان ذرائع اور اسباب کی پرستش و عبادت کرنا یا ان ذرائع و اسباب میں مستقل طور پر نفع و نقصان ماننا باطل، ظلمِ عظیم اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی ناقدری و ناشکری ہے کیونکہ وہی مؤثِّرِ حقیقی اور نفع و نقصان کا خالق و مالک ہے، اس لیے اسباب پر تکیہ اور بھروسہ کرنے کے بجائے ہر حال میں خالق و مالکِ کائنات پر توکل اور بھروسہ کرنا چاہیے، اس کی ہر بات کو ماننا چاہیے اور ہر دکھ، درد، تکلیف اور تمام امور میں خواہ بڑے سے بڑے ہوں یا چھوٹے سے چھوٹے اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اسلام نے غیر اللہ سے نفع و نقصان کے تمام رشتے توڑ ڈالے اور صرف مالکِ حقیقی اللہ رب العالمین سے امید کا یہ رشتہ انسان کے دل میں راسخ اور پیوست کر دیا۔ اسلام انسان کے دماغ کو صرف صریح کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک نہیں کرتا، بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں ایسا نازک بنا دیتا ہے کہ اگر گرد و پیش میں کہیں کفر و شرک کا احتمال بھی ہو تو اس کا دماغ اس بدبو اور تعفن کا تحمُّل نہیں کر سکتا۔

اسلام نے غیر اللہ سے غیبی استمداد ممنوع قرار دی ہے

پھر جس طرح دینِ اسلام نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسری تمام مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر سینوں سے نکال کر باہر پھینک دیا اور دعا و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر اس جھاڑ پھونک، تعویذ گنڈے، ٹونے ٹوٹکے جس میں غیر اللہ سے غیبی استمداد یا شرکیہ کلمہ ہو کو ناجائز قرار دیا اور اس قسم کے فاسد خیالات کے خاتمے کے لیے ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر سورۂ فاتحہ میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دے دیا:

اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ ﴿۴﴾

"اے پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں" (الفاتحۃ:۴)

اسی طرح اسلام نے یہ بھی بتلا دیا کہ مخلوق کو خالق کا کوئی حق اور خصوصیت نہ دی جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا

پوری کائنات میں کوئی ایسی چیز اور ایسی مخلوق نہیں جو کائنات میں متصرف ہو۔ عزت و ذلت اور شفا وغیرہ دینے والا وہی ہے، نیز یہ بھی بتلا دیا کہ اس کی حکمرانی صرف مادی کائنات کے ایک ایک ذرے پر نہیں، بلکہ اس کی حکمرانی انسان کے جذبات و احساسات، اس کی روح اور مخفی و پوشیدہ قوتوں، غیر مادی اور لطیف سے لطیف تر عناصر پر بھی ہے اس لیے اس کے اقتدارِ مطلق اور حاکمیتِ جامع کے جو تقاضے و مطالبے ہیں وہ صرف دل و زبان سے واجب القبول نہیں، بلکہ عملی زندگی میں ان کو رہنما بنانا اور افعال و اعمال سے ان پر یقین کامل پیش کرنا بھی ضروری ہے، اور اس کے ساتھ یہ عقیدہ رکھنا بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوری کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے جو انسانوں اور جنوں کے سجدہ و رکوع نماز و عبادت کی مستحق اور لائق ہو یا جس کے نام پر کسی جانور کا خون بہایا جاسکے یا اس کے نام نذر و منت مانی جائے یا اسی سے براہِ راست دعا مانگی جائے، بلکہ ہر عبادت، ہر پرستش صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی خاطر ہوگی اور ہر دعا اسی سے مانگی جائے اور اپنی پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں ڈھالنے اور اس کے احکامات پر گزارنے کی حتی الوسع کوشش کی جائے اور اپنی پوری زندگی اور مرنے میں اس کی خوشنودی کا لحاظ کیا جائے:

قُلۡ اِنَّ صَلَاتِیۡ وَ نُسُکِیۡ وَ مَحۡیَایَ وَ مَمَاتِیۡ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۶۲﴾

”بلاشبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک اللہ ہی کے لیے ہے جو کہ تمام عالَم کا پروردگار ہے“۔(الانعام:۱۶۲)

اسلام اس بات کا حکم دیتا ہے کہ جس چیز کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو یا جس شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ اور دینِ اسلام سے ہو جیسے انبیا علیہم السلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، علمائے امت وغیرہ ان کی اور تمام شعائر اللہ کی تعظیم و تکریم کی جائے اور ان سے محبت کی جائے اور اسلام نے ان کی ادنیٰ گستاخی اور بے ادبی کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ یہ حکم بھی دیتا ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی محبت میں برابر نہ کریں اور کسی بھی مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی عبادت و بندگی میں شریک نہ کریں اور نہ کسی مخلوق کے ساتھ وہ معاملہ کریں جو صرف عظیم رب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

عقیدۂ توحید کے ثمرات

جب ایک انسان عقیدۂ توحید کو اپنا لیتا ہے، اس راہ مستقیم پر چل پڑتا ہے اور اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرکے اپنی مرضی و خوشنودی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی و خوشنودی میں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے ذکر اور یاد میں مشغول ہو جاتا ہے اور عملاً اپنے کو صرف اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سپرد کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اور

اس کے رسول ﷺ کے سوا کسی کے حکم پر اپنی زندگی کا دار و مدار نہیں رکھتا تو اس کے دل میں خشوع و خضوع، استقلال، توکل اور اخلاص کی بے پناہ قوت آجاتی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی توحید کی حقیقی راہ کھول دی جاتی ہے، پھر وہ نفع و نقصان، خیر و شر، اور عزت و ذلت کا صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا یقین ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کے سامنے سے اسباب و وسائل کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور اس کا دل ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کا مشاہدہ کرلیتا ہے اور اس کو ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھائی دیتی ہے، اور اس بات کا مشاہدہ کرلیتا ہے کہ تمام تر برکات و انعامات اور فیوض کا منبع و سرچشمہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت ہے۔ ایسا شخص اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہوجاتا ہے اور اس کا قرار و سکون اللہ تعالیٰ کی ذاتِ جمیل بن جاتا ہے، وہ سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی محبت میں مست اور صرف اس کے جمال میں محو ہوجاتا ہے، یہ تو اس کی قلبی کیفیت اور مشاہدہ ہے جس کے لیے الفاظ نہیں ملتے جیسا کہ مادی چیزوں پھولوں اور پھلوں کی خوشبو اور ذائقوں کو چکھنے کے بجائے الفاظ کے سانچے میں ڈھالا جائے تو ذائقوں اور خوشبوؤں کو بیان نہیں کیا جاسکتا، بلکہ بعض اوقات تعبیر کی غلطی سے ذوق و شوق کے بجائے بدمزگی پیدا کردیتا ہے۔ بہر حال مؤمن اور سچے موحد کے دل و روح پر جو کیفیات آتی رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سکون و اطمینان اور جس ٹھنڈک کی لذت کو وہ پالیتا ہے اور پھر اس پر اللہ تعالیٰ کی صفات کی معرفت کھلنے کی وجہ سے جس قدر وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور قدرت میں حیران ہوتا چلا جاتا ہے تو یہ ایسی کیفیات ہیں کہ جس کا علم اور احساس چکھنے سے آسکتا ہے اور بس۔ البتہ ایک سچے مؤمن اور موحِّد کے یقین و عمل کو بیان کردیتے ہیں وہ یہ کہ جب ایک مؤمن پر توحید اور سچائی کی راہ پوری طرح کھل جاتی ہے تو وہ سب سے کٹ کر ایک اللہ جل شانہ کا ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ ہی کو وہ اپنا مقصود و مطلوب، ماویٰ و ملجا، وکیل و کارساز، مشکل کُشا، حاجت روا اور ناصر و مددگار سمجھتا ہے، اس کی پوری توجہ ہر حال میں خواہ راحت ہو یا مصیبت ایک اللہ جل جلالہ پر ہوتی ہے۔ وہ ساری دنیا سے بے نیاز اور خوف و خطر سے بالاتر زندگی گزارتا ہے۔ وہ موجودات عالم میں کسی طاقت سے نہیں ڈرتا، وہ کسی سے محبت بھی اللہ تعالیٰ کے لیے کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نام سے لگی ہوئی چیزوں، انبیا علیہم السلام، علمائے دین، صلحائے امت اور اسی طرح دوسرے شعائر اللہ جیسے مساجد وغیرہ کے ساتھ خود بخود اس کی محبت ہوجاتی ہے اور وہ ان کی حسبِ مراتب تعظیم و تکریم کرتا ہے۔

اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے بغض رکھتا ہے۔ کفر و شرک، فسق و بے حیائی سے بے زار اور متنفر ہوتا ہے اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر رحم آتا ہے، وہ یتیموں اور مسکینوں پر شفقت

کرتا ہے اور مخلوقِ الٰہی حتیٰ کہ جانوروں کو بھی تکلیف دینے سے گریز کرتا ہے، اس کی آنکھوں میں استغنا کا نور چمکتا ہے اور اس کی پیشانی سے قناعت واطمینان برستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ہر ہر حرکت کا مرکز اور مقصود اللہ تعالیٰ کی ذات جمیل بن جاتا ہے، اس کی نگاہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہوتا، اس کی ہر ادا اور ہر فعل اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے عین مطابق ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اس طرف دیکھتا ہے جس طرف اللہ تعالیٰ کو پسند ہو اور وہ آواز سنتا ہے جس کا سننا اللہ تعالیٰ کو پسند ہو۔ غرض اس کا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ فاعلِ حقیقی کے تجلی کرنے کا اثر ہو جاتا ہے جیسا کہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ایک حدیث کے حوالے سے یوں فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُہٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَرِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا وَاِنْ سَأَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّہٗ

"اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص میرے ولی اور دوست سے دشمنی کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ اپنی لڑائی کا اعلان کرتا ہوں اور میرا بندہ میرا تقرّب کسی اور عمل سے اتنا حاصل نہیں کر سکتا ہے جتنا کہ اس عمل سے جو میں نے اس پر فرض کیا ہے (اور میرا بندہ جسے فرائض کی ادائیگی کی وجہ سے میرا تقرّب حاصل ہو وہ) بندہ ہمیشہ کے لیے نفلوں (فرائض کے علاوہ نفلی نمازوں، ذکر و اذکار، نفلی خیرات و صدقات وغیرہ جیسی نفلی عبادات کو بھی اپنا لیتا ہے اور ان) کے ذریعے میرا تقرّب حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی ساعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور میں اس کی بینائی بن جاتا ہوں جس کے ذریعے وہ دیکھتا ہے اور میں اس کا وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ چاہتا ہے تو میں اسے ضرور پناہ دیتا ہوں"۔ (صحیح البخاری، مشکوٰۃ باب ذکر اللہ عزوجل)

اسی طرح قرآن مجید میں مؤمن کے بارے میں آتا ہے:

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا

"اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (تقویٰ کی زندگی اختیار کر کے اس کی نافرمانی سے بچتے رہو) تو وہ تم میں (حق و باطل کے درمیان) امتیاز کرنے والی قوت پیدا کر دے گا"۔ (الانفال:۲۹)

یہی وہ مؤمن ہے جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے:

اِتَّقُوْا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَاِنَّهٗ يَنْظُرُ بِنُوْرِ اللهِ

"مؤمن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے"۔(ترمذی)

اور یہی وہ مؤمن ہے جس کے متعلق آپ ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُؤْمِنُ لَا يَخْدَعُ وَلَا يُخْدَعُ

"مؤمن نہ (خود کسی کو) فریب دیتا ہے اور نہ اسے فریب دیا جاسکتا ہے"۔(وہ فراست کی وجہ سے لوگوں کے فریب اور دھوکہ کو بھانپ لیتا ہے)۔(مشکوٰۃ)

یہی وہ مؤمن ہے جو مجاہد ہوتا ہے، ہر مخلوق سے بے نیاز ہوتا ہے، اس کی گردن کبھی بھی کسی مکار، دجال اور کسی بھی غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے محفوظ رہتی ہے اور یہی وہ مرد مؤمن ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے والا، مٹا دینے والا اور بالآخر سر کٹا دینے کے لیے بے قرار اور بار بار اللہ تعالیٰ کی راہ میں جام شہادت کی تمنائیں کرتا ہے، یہی وہ بندگی اور اللہ تعالیٰ کی محبت ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور اس کا مقصد پیدائش ہے۔

اس طرح کی توحید نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سینوں کو ایمان سے معمور کیا تھا اور اسی توحید اور ایمان کی شیرینی اور مٹھاس نے ان کے لیے دہکتے ہوئے انگاروں پر لیٹنے اور دوسری تکلیفوں کو بالکل آسان بنا دیا تھا۔ مخلوقات کا حسن و جمال، دنیا کی آرائش و زیبائش اور اس طرح کی شان و شوکت ان حضرات کی نظروں میں ہیچ تھی، وہ جب ملوک و سلاطین کی جاہ و حشم اور ان کے درباروں کی سجاوٹ اور زیب و زینت پر نظر ڈالتے تو ان کے نزدیک یہ سب کچھ چند بے جان مجسموں یا مٹی کے ٹیلوں سے زیادہ کچھ نہ ہوتا تھا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ساٹھ ہزار (٦٠،٠٠٠) فوج سے اکیلے لڑنے کے لیے تیار ہوگئے، کیونکہ ان کو خوب معلوم تھا کہ کفار کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور یادِ الٰہی سے خالی ہیں اور انہیں یہ بھی یقین تھا کہ جن کے دل اللہ تعالیٰ کی محبت اور یادِ الٰہی سے خالی ہوں ان کی حیثیت بے جان مردوں سے زیادہ کچھ نہیں، ان کے بیٹے اگر کفار کے ساتھ مقابلہ میں شہید ہوکر خون میں تڑپتے تو انہیں اس پر فخر ہوتا اور اگر ان کی روح کفار کے مقابلہ میں جنگ کے دوران پرواز کرتی تو قسم کھا کر اور چیخ مار کر پکارتے کہ واللہ ہم کامیاب ہوگئے، وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت کی وجہ سے ایک دوسرے کی تعظیم و تکریم کرنے والے، اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنے اوپر مقدّم کرنے والے اور کسی ایک مسلمان بھائی کی تکلیف سے سارے مسلمان ایک جان کی طرح بے آرام ہونے والے تھے، پس مؤحِّد اور مؤمن وہی تو ہے

جس کے دل و دماغ پر توحید حاوی ہو چکی ہو، اس کی فکر اور شعور توحید کے رنگ میں رنگا ہو اور اس کی رگ رگ اور دل و روح توحید سے سرشار ہو اور اس کے بدن سے جو قول و فعل صادر ہوتا ہے وہ سراپا عقیدۂ توحید سے معطر ہو، اس کا ایک ایک قول و فعل صحیح نصب العین کی طرف رہنمائی کرتا ہو۔ اور اس کے دل و دماغ پر اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت کا اس قدر استحضار اور غلبہ ہوتا ہے اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے ہر حکم کو پورا کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور دوسری طرف وہ کفر و شرک اور دوسرے جرائم سے متنفر اور بے زار ہوتا ہے اور ان کے مٹانے کی کوشش کرتا رہتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے شعائر اور اس کے نام کے ساتھ لگی ہوئی چیزوں کے ساتھ محبت و ان کا ادب و احترام کرتا ہو گا، تمام مسلمانوں پر مہربان ہو گا، ان کا اعزاز و اکرام کرتا ہو گا لیکن اس کے برعکس وہ کفر و شرک سے سخت متنفر اور دشمنانِ توحید کا شدید مخالف اور ان کے مقابلے میں پوری طرح ڈٹ جانے والا ہوتا ہے۔ جس مؤمن کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانے پر اس قدر غیور نہ ہو تو وہ مقامِ محبت سے آشنا نہیں ہو سکتا اور نہ وہ شرک و کفر وغیرہ کی تلخی کو محسوس کر سکتا ہے، بلکہ ایسی صورت میں توحید کے لیے لمبے چوڑے دعوؤں اور اس پر تفصیلی بیانات اور اس کی گہرائیوں میں غوطے لگانے کے باوجود اس کی توحید صرف اس کی زبان، سوچ اور خیال تک محدود ہو کر توحید ایک دماغی فلسفہ ہوتا ہے۔

توحید الٰہی اور آج کل کی توحید و محبت

اس کے مقابلہ میں آج کے مسلمان اپنی حالت پر بھی نظر ڈالیں کہ توحید اور رسول اللہ ﷺ سے محبت و عقیدت کے دعوؤں اور ایمان و یقین کے زبانی نعروں سے پوری فضا لبریز ہے، لیکن پھر حالت یہ ہو رہی ہے کہ ہم جیسے نام نہاد موحد ایک طرف اپنے اسلاف یہاں تک کہ سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کے آثار کو مٹانے اور آپ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کیچڑ اچھالنے اور تنقید کرنے پر فخر کرتے ہیں اور اسلاف کی توہین و تنقیص، آنکھوں کی ٹھنڈک بن گئی ہے اور دوسری طرف یہی موحدین عملی لحاظ سے دولت اور قوت کے سامنے سر جھکانے اور دنیا پرستی میں دوسری مشرک قوموں سے کسی طرح پیچھے نظر نہیں آتے۔

اس کے برعکس نام کے محب رسول اور اسلاف کے شیدائی مزارات پر سجدہ ریزی کی لعنت پر تو فخر کرتے ہیں لیکن آپ ﷺ کی اتباع اور اسلاف کی پیروی میں دوسری مشرک قوموں کی طرح عار محسوس کرتے ہیں، اس طرح مسلمانوں میں حقیقی محبت اور توحید و ایمان نایاب ہو رہے ہیں اور توحید و محبت کا سرمایہ صرف محبت یا توحید پر دل چسپ تقریروں کی حد تک محدود ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں افراط و تفریط سے ہٹا کر راہِ حق اور توحیدِ

اسلام پر ڈال دے اور چلائے رکھے اور اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی محبت سے آشنا اور حقیقی عملی توحید نصیب فرمائے۔ آمین

باب...... کلمہ کا دوسرا جز نبوت و رسالت

کلمہ کا دوسرا جزر سالت ہے۔ رسالت کا لفظی معنی پیغام پہنچانا ہے اور نبوت کا لفظی معنی خبر دینا ہے۔ اصطلاحِ شریعت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ہدایت و حقائق بندوں تک پہنچانے کا نام رسالت ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معلوم شدہ احکامات اور حقیقتوں سے بندوں کو خبر دار اور آگاہ کرنے کا نام نبوت ہے ایسے شخص کو رسول، نبی اور پیغمبر کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کام پر مامور کیا جاتا ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ربوبیتِ کاملہ پر ایک نگاہ

یہ حقیقت ہر جگہ صاف نظر آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عطاو بخشش سے جس طرح ہر چیز کو اس کا مناسب وجود اور جسم بخشا اور پیدا فرمایا ہے، اسی طرح اس کو مناسب خواص اور قوتیں دے کر اس کی حیثیت کے مطابق ہدایت اور فطری رہنمائی بھی عنایت فرمائی ہے اور اس کو پورے ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک کیا ہے اور اس کو اس کے وجود کی بقا اور اس کی مصلحت کے مطابق حکم اور قانون دے دیا ہے۔ یہ تکوینی ہدایات اور فطری رہنمائی صرف حیوانات کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ کائنات کی ہر ایک چیز کے لیے عام ہے، مخلوقات کی تمام اقسام اس میں شریک ہیں، چنانچہ زمین، مٹی، پتھر مختلف قسم کی دھات، معدنیات، ہوا، روشنی، آگ، پانی، تارے اور سیارے وغیرہ جیسی چیزیں جن میں اس قدر کم احساس پایا جاتا ہے کہ جس کو کالعدم قرار دے کر لوگ اس کو بے جان اور بے حس چیزیں سمجھتے ہیں، اگر ان پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے ہر ایک چیز اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے قانون اور ہدایت کے مطابق ٹھیک ٹھیک وہی خدمات سر انجام دے رہی ہے جس کے لیے اس کو پیدا کیا گیا ہے، ان میں سے کوئی بھی چیز اور کسی بھی قسم کی مخلوق اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے قانون اور اس کی ہدایت کے خلاف ذرہ برابر بھی نہ کرتی ہے اور نہ کر سکتی ہے۔ [1]

اگر آپ کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ سالمے (Molecules) کس قدر حکیمانہ قانون اور ہدایتِ الٰہی کے مطابق اپنا کام انجام دے رہے ہیں یا یہ آپ کے لیے معلوم کرنا دشوار ہے کہ کائنات کے ایک ایک ذرہ کے لیے کس قدر پر حکمت قانون ہے اور کس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق اپنے حصے کا کام کر رہا ہے تو آسمان پر ایک نظر دوڑائیں۔ آپ کو لاتعداد ستارے ایک نظام میں منسلک نظر آئیں گے، عظیم الشان کُرے

---

(1) البتہ اگر اللہ تعالیٰ از خود کسی خاص قانون کے تحت کسی چیز کو دوسرا حکم اور ہدایت فرمائے مثلاً آگ کو حکم دیں کہ گلزار بن جا تو یہ دوسری بات ہے جس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آنے والا ہے۔

فضا میں بجلی کی طرح گھوم رہے ہیں، نہ کوئی سگنل دینے والا نظر آتا ہے، نہ کوئی ٹریفک والا اور نہ کوئی ڈرائیور دکھائی دیتا ہے، لیکن پھر بھی آسمان کا نظام آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ نظام بہترین صحت و اعتدال کے ساتھ چل رہا ہے۔ ہر ایک کُرہ ایک متعین مدار پر مقررہ مقدار پر گردش کرتا ہے اور ہر ایک اپنی جدا جدا خاصیتوں اور قوتوں کے مطابق ٹھیک ٹھیک اپنی خدمات بجالا رہا ہے اور ان کی یہ خدمات خود ان کے لیے نہیں، بلکہ ان سے زیادہ احساس و ادراک رکھنے والی مخلوق جیسے نباتات و حیوانات اور انسان وغیرہ کے لیے ان کی نشو و نما اور زندگی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جمادات اور معدنیات کے بعد نباتات کو دیکھ لیجیے جن میں جمادات کی بنسبت زیادہ احساس پایا جاتا ہے وہ بھی فطری ہدایت اور خاص قانون کے تحت اپنے اپنے فرائض ادا کر رہے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی اسی ہدایت کی اتباع کرتے ہوئے اپنے جسم و ساخت اور وزن کے مطابق زمین کے اندر اپنی جڑیں مضبوط نکالتے ہیں اور پھیلاتے ہیں اور اپنی غذا حاصل کر کے شاخیں، پتیاں، پھول اور پھل لاتے ہیں، اس طرح وہ بھی اپنے مقررہ فرائض اور کام پورا کر کے اپنے لیے نہیں، بلکہ اپنے سے برتر احساس و ادراک رکھنے والی مخلوق حیوانات، جنات اور انسان کے لیے ان کی معیشتِ زندگی اور دل لبھانے کا سبب بن جاتے ہیں۔

پھر نباتات سے بڑھ کر احساس و شعور رکھنے والی مخلوق حیوانات اور انسان و ذی روح چیزوں کی زندگی آپ کے سامنے ہے، جن کو اللہ تعالیٰ نے حواس بھی عنایت فرمائے ہیں جن کی وجہ سے وہ دیکھتے، سنتے، سونگھتے، چکھتے اور ٹٹولتے ہیں جن کی وجہ سے وہ رہنے سہنے، کھانے پینے، توالُد و تناسُل اور حفاظت و نگرانی کے تمام وظائف حسن و خوبی کے ساتھ پورے کرتے ہیں، لیکن وہ ان حواس اور اپنے گرد و پیش خارجی سامان سے جو قدرت نے ان کے لیے فراہم کیا ہے فائدہ کیسے اٹھاتے ہیں۔ ان کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کی یہی ہدایت اور فطری رہنمائی ہے جو حیوانات کی تمام اقسام پر ان کی زندگی، معیشت اور بقا کی راہ کھولتی ہے، ان کی زندگی کو مفید بناتی ہے اور ضروریاتِ زندگی کے حصول میں ان کی رہنمائی کرتی ہے، چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ پرندے کا بچہ انڈے کے چھلکے سے باہر نکلتے ہی منہ کھول کر غذا کو تلاش کرنے لگتا ہے اور ماں اس کے موافق غذا چن چن کر اس کے منہ میں اتارتی ہے، بلی اور بکری کے بچوں کو دیکھیں کہ ابھی ابھی پیدا ہوتے ہیں لیکن وہ خود بخود معلوم کر لیتے ہیں کہ ان کی غذا ماں کے سینے میں ہے اور وہ ماں کے سینے پر منہ مارتے ہوں گے۔ انسان کا بچہ ہو یا حیوان کا ابتدائے پیدائش کے وقت جب کہ اس وقت اس کو کوئی بات سکھانا کسی کے بس میں نہیں اس کو یہ تعلیم کس نے دی کہ اس کی غذا ماں کے سینے میں موجود ہے، اس لیے اسے پستان منہ میں لے لینا چاہیے اور اس ابتدائی وقت میں کون ہے جو اس کو یہ ہنر بتا

دیتا ہے کہ ماں کے تھنوں کو چوسو اور اس کی چھاتی کو دباؤ۔ گرمی سردی، بھوک و پیاس اور درد وغیرہ کی وجہ سے بچے کا رو پڑنا اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہے، مگر یہ رونا بچے کو کس نے سکھایا؟ یقیناً یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ہدایت اور فطری رہنمائی ہے جو ہر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہنچتی رہتی ہے، مچھلی کا بچہ دنیا میں قدم رکھتے ہی تیرنے لگتا ہے، پرندوں کے بچے اڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ماں ان کو اڑاتی پھرتی ہے۔ مرغی کے بچے اور بطخ کے بچے کے سامنے پانی سے بھرا ہوا تھال رکھ دیں تو بطخ کا بچہ اس میں کود جائے گا اور مرغی کا بچہ اس میں گھس جانے سے پرہیز کرے گا۔ پھر چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں میں عظیم الشان اور حیرت انگیز جماعت بندی اور ذخیرہ اندوزی کو دیکھ کر انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے، اسی طرح ہر حیوان اپنے نفع و ضرر کو سمجھتا ہے، مہلکات سے بھاگتا ہے اور جو چیزیں اس کے لیے مفید ہیں ان کی طرف لپکتا ہے۔ اسی طرح تمام حیوانات اللہ تعالیٰ کی فطری ہدایت اور قانون کی پیروی میں اپنی زندگی کو مفید بناتے ہیں اور جس پر جو کچھ ذمہ عائد ہوتا ہے اس کو پورا کر کے اپنے سے اعلیٰ قسم کی مخلوق اور انسان کے لیے کار آمد ثابت ہوتے ہیں اور اس کے لیے زندگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی عام ہدایات

غرض یہی وہ فطری رہنمائی اور وحی والہام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کائنات کی ہر ہر چیز کو ملتی رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی ہدایت ہے جس سے کوئی بھی مخلوق محروم نہیں اور یہی وہ ہدایت اور الہام باطنی ہے جس کو قرآن مجید نے یوں بیان فرمایا ہے: قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى "(حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دے کر فرعون کو) کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے (مناسب) خلقت عطا فرمائی پھر اس کے مناسب ہدایت دی"۔ (طٰہٰ:۵۰)

اور سورتِ اعلیٰ میں ہر چیز کے وجود کے آنے اور درجہ تکمیل تک پہنچنے تک کے لیے جو مختلف مراتب بیان کیے گئے ہیں ان میں سے آخری مرتبہ اسی ہدایت کا ہے چنانچہ ارشادِ ربانی ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝١ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۝٢ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝٣

"(اے نبی) آپ اپنے پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا اور (اس کی خلقت میں صحیح توازن و تناسب قائم کر کے اسے) درست کیا اور جس نے (ہر چیز کے لیے) ایک اندازہ مقرر کروا دیا، پھر (اس کو) راہ (عمل) دکھائی"۔ (الاعلیٰ:۱-۳)

قرآن مجید کی ان آیتوں میں ہر وجود کے بننے سے لے کر درجہ تکمیل تک پہنچنے کے لیے چار درجے بیان کیے گئے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وجود کو پردۂ عدم سے وجود میں لاتے ہیں اور جس وجود کو جس طرح ہونا چاہیے ٹھیک ٹھیک صحیح توازُن و تناسُب قائم کرکے اس کو اس کے مطابق جسامت، شکل و صورت، اس کے مناسب اعضاء و قوتیں اور خواص وغیرہ عنایت فرماتے ہیں اور کمالِ حکمت سے اس کو اسی طرح بناتے اور درست کرتے ہیں کہ اس جیسی چیز کے لیے اس سے بہتر صورت کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

نیز ہر وجود کی تخلیق کا مقصد اور اس کی افادیت کا دائرہ اور اس کی ظاہری باطنی قوتوں کے لیے اور اس کے اعمال کے لیے ایک خاص اندازہ بھی مقرر فرمادیا ہے (جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ مفصل آرہا ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آنے والے وجود کو یوں ہی نہیں چھوڑا، بلکہ جس طرح ہر چیز کے وجود و بقا کے لیے تمام ضروری قوتیں اور سامان و اسباب مہیا کیے ہیں، اسی طرح ہر چیز کو اپنی ساخت، قوتوں اور ان اسباب و سامان سے کام لینے کی راہ بھی سمجھاتا ہے۔

کائنات کی ہر ایک چیز اپنا فرض پورا کررہی ہے

اللہ تعالیٰ کی اسی ہدایت اور الہامِ عام کا نتیجہ ہے کہ مخلوقات کی تمام اقسام اور عالَمِ کائنات کی ہر ایک چیز مقررہ فرض نہایت خوبی سے انجام دے رہی ہے۔ اگر یہ ہدایت نہ ہوتی تو کائنات کا وجود ہی بے کار ہوجاتا اور اگر ایک لمحہ کے لیے بھی کائنات سے اس ہدایت کو ہٹادیا جائے تو ہواؤں اور پانیوں میں زہر کا سیلاب آئے گا اور اگر آسمان و زمین کی چیزیں اور یہ عظیم الشان کرے جو گھوم رہے ہیں آپس میں ٹکراگئے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔

یہاں تک تو اس ہدایتِ عام کا بیان کیا گیا جو مخلوقات کی بے شمار اقسام اور اصناف کے لحاظ سے اس کی بے شمار اقسام کو شامل ہے جو عام مخلوقات میں سے ہر ایک مخلوق کے لیے جدا جدا ہے، کیونکہ مخلوق کو اس کے وجود و بقا، اس کو مفید بنانے اور اس کو دی ہوئی قوتوں اور خواص کے مطابق فرائض سرانجام دینے کے لیے ایک خاص قسم کی فطری ہدایت اور وحی والہام ہوتا رہتا ہے۔ آیئے! اب اپنے وجود اور انسان کی طرف۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو انسانی زندگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے ظاہری حواس اور ان سے بھی اعلیٰ جوہر عقل بھی عطا فرمائی ہے، یہی معنوی قوت اور جوہرِ عقل ہے جس نے انسان کو بقیہ تمام حیوانات سے امتیاز بخشا اور اس کے سامنے غور، فکر و نظر اور ترقیوں کی راہیں کھولتی ہے، اور اسی کی بنا پر وہ اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق سمجھا جاتا ہے اور یہی معنوی

قوتیں ہیں کہ جب کوئی بھی انسان (خواہ وہ مؤمن ہو یا کافر) ان کو کسی دنیاوی چیز کی طرف متوجہ کرتا ہے اور استقامت سے اس پر محنت و مشقت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں اور اس کی استعداد و قوت اور محنت کے مطابق اس کی رہنمائی کر کے اس پر دنیاوی سامان اور ایجاد کا دروازہ کھول دیتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾

”ہم اپنی بخشش عام سے ہر ایک فریق کی (اس کی کوشش اور محنت کے مطابق) امداد کرتے ہیں ان کی بھی (جو طالبِ دنیا اور کافر ہیں) اور ان کی بھی (جو طالبِ آخرت اور مؤمن ہیں) اور آپ کے رب کی بخشش (عام) کسی پر بند نہیں“۔ (الاسراء:۲۰)

اللہ تعالیٰ کی یہی وہ رہنمائی اور بخشش ہے جو تمام انسانوں کے لیے عام ہے، اسی سے انسان اس کی وحدانیت کو پہچان سکتا ہے اور اس عقل کے ذریعے یہ بھی جان جاتا ہے کہ جب کائنات میں تمام چیزیں اس انسان کے مفاد میں اپنے اپنے فرائض پورا کرتی ہیں اور کائنات کی ساری چیزیں بلاواسطہ یا بالواسطہ انسان کی خدمت میں مصروف ہیں اور انسانوں کو ہی کائنات کی چیزوں کی ضرورت ہے اور انسان ہی اپنے وجود کے لیے کائنات کی ایک ایک چیز کا حاجت مند ہے اور کائنات کی کوئی ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں، دنیا سے روزانہ کتنے اچھے اور برے انسان چلے جاتے ہیں، انبیاء علیہم السلام بھی تشریف لے گئے ہیں، اولیاء اللہ بھی وفات پاتے ہیں بادشاہ و گدا ہر قسم کے انسان مرتے ہیں، لیکن کسی انسان کے جانے کی وجہ سے کائنات کی کوئی چیز نہیں بگڑی، اگر بالفرض پوری انسانی نسل دنیا سے مٹ جائے تو زمین و آسمان، سورج ستاروں، نباتات اور حیوانات کا کیا بگڑے گا یا انسان کی زندگی سے ان کو کیا فائدہ؟ کیا ایک طویل مدت کائنات پر ایسی نہیں گزری جس میں انسان کا نام و نشان تک نہ تھا پھر بھی سورج چمکتا رہا اور پانی بہتا رہا، درخت پھلتے اور پھولتے رہے۔ لیکن اگر زمین اور اس کی پیداوار، چاند سورج، ہوا پانی، حرارت وغیرہ میں سے کوئی چیز کائنات سے غائب ہو جائے تو کیا انسان کا وجود چند لمحے گزار سکے گا؟ تو کائنات یعنی آسمان و زمین کی چیزوں کے وجود سے انسان ہی کو فائدہ ہے انسان کے وجود سے حیوان کو کیا فائدہ؟

بہر حال انسان صرف فطرتِ وجدان سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی جوہرِ عقل سے بھی یہ معلوم کر لیتا ہے کہ ہمارا خالق قدرت اور حکمت والی یکتا ذات ہے جس نے پوری دنیا میرے لیے سجائی اور کائنات کی چیزیں میرے لیے مسخر کی ہیں اور اسی جوہرِ عقل اور معنوی قوتوں سے یہ بھی اچھی طرح معلوم کر سکتا ہے کہ جب کوئی

بھی چیز دنیا میں پیدا ہوتی ہے وہ ضرور بالضرور کسی نہ کسی مقصد کے لیے پیدا ہوا کرتی ہے اور وہ نہایت سلیقہ سے اپنے فرائض پورے کر کے اپنے حصے کا کام کر دیتی ہے۔ تو کیا سب سے اعلیٰ صلاحیتوں والی مخلوق (اور ایسی مخلوق جس کے لیے پوری کائنات مسخر کی گئی ہے اس) کو بے مقصد اور بے کار بنایا گیا ہے؟ عقل کہتی ہے کہ ہر گز نہیں، بلکہ اس کے وجود و پیدائش کا بھی کوئی خاص اور اہم مقصد ہے، نیز یہ بھی جوہر عقل اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں سے معلوم کر سکتا ہے کہ جمادات و معدنیات وغیرہ اپنے اپنے فرائض پورے کر کے اپنے سے زیادہ احساس رکھنے والی اور برتر مخلوق حیوانات اور انسان کے کام آتے ہیں اور ان کا وجود انسان کے لیے ہے، اسی حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف انداز سے بیان فرمایا ہے مثلاً کہیں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ﴿۳۲﴾ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآىِٕبَیْنِ ۚ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ﴿۳۳﴾ وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ ؕ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ﴿۳۴﴾

”اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور (زمین پر) آسمان (یعنی اوپر) سے پانی برسایا، پھر اس پانی کے ذریعے تمہارے کھانے کے لیے طرح طرح کے پھل پیدا کیے اور اسی نے تمہارے لیے کشتی (بحری جہاز) مسخر کر دیے تاکہ سمندر میں وہ اس کے حکم سے چلیں اور دریا بھی تمہارے لیے مسخر (یعنی تابع فرمان) کر دیں اور تمہارے لیے سورج و چاند بھی مسخر کر دیے ہیں جو (اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق) برابر چلے جا رہے ہیں اور رات دن کو بھی تمہارے لیے مسخر کر دیا۔ اور (غرض اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جس نے) تمہیں وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے مانگا (یعنی تمہاری فطرت کی ہر مانگ پوری کی اور جو کچھ تمہاری کامرانیوں کے لیے تھا وہ سب کچھ تمہیں عطا فرمایا) اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو تم ان (کی انواع) کا شمار (بھی) نہیں کر سکتے، حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت ہی ناانصاف اور بڑا ہی ناشکرا ہے“۔ (ابراہیم:۳۲---۳۴)

اور زمینی چیزوں کے متعلق فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

”(اے انسان!) اس نے تمہارے لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے“۔ (البقرہ:۲۹)

اور کہیں ہمارے ذہن کو جگانے کے لیے ہمیں غور و فکر کی دعوت دے کر یوں فرمایا ہے:

اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ

"(اے انسان!) کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مسخر کیا ہے (اور ان تمام چیزوں کو تمہارے کام میں لگا رکھا ہے)"۔ (الحج:۶۵)

اور کسی جگہ اپنے قریب گھریلو حیوانات اور مویشیوں کے وجود میں ہمیں غور و فکر کے لیے یوں فرماتے ہیں:

اَوَ لَمۡ یَرَوۡا اَنَّا خَلَقۡنَا لَہُمۡ مِّمَّا عَمِلَتۡ اَیۡدِیۡنَاۤ اَنۡعَامًا فَہُمۡ لَہَا مٰلِکُوۡنَ ﴿۷۱﴾ وَ ذَلَّلۡنٰہَا لَہُمۡ فَمِنۡہَا رَکُوۡبُہُمۡ وَ مِنۡہَا یَاۡکُلُوۡنَ ﴿۷۲﴾ وَ لَہُمۡ فِیۡہَا مَنَافِعُ وَ مَشَارِبُ ؕ اَفَلَا یَشۡکُرُوۡنَ ﴿۷۳﴾

"کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لیے مویشی پیدا فرمائے پھر (اب) یہ لوگ ان کے مالک ہیں اور ہم نے انہیں (اس طرح) تابعدار بنا دیا ہے کہ ان میں سے بعض پر سوار ہوتے ہیں اور بعض کا گوشت کھاتے ہیں اور ان مویشیوں میں ان کے لیے اور بھی بہت سے فوائد ہیں اور پینے کی چیزیں بھی ہیں کیا پھر (بھی) یہ شکر ادا نہیں کرتے"۔ (یٰسین:۷۱---۷۳)

اور کبھی سمندروں کے متعلق بیان فرماتا ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾

"اللہ وہ ذات ہے جس نے سمندروں کو تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں (اور جہاز) چلیں اور تاکہ تم (سمندر میں تجارت اور ماہی گیری شکار وغیرہ کے ذریعے) اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ"۔ (الجاثیہ:۱۲)

اسی طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی مختلف قسم کی مخلوقات کے بارے میں اسی حقیقت کی نشان دہی فرمائی ہے کہ یہ زمین اور اس کی پیداوار، حیوانات، ہوائیں، سورج چاند، سمندر وغیرہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ ہی نے آپ کے کام میں لگا رکھی ہیں اور یہ آپ ہی کے لیے مسخر کی گئی ہیں اور کبھی اس حقیقت کو مختصراً یوں بھی بیان فرمایا ہے:

وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

"اور اس نے اپنے حکم سے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزیں تمہارے لیے مسخر کر دی ہیں بلاشبہ اس میں (معرفت حق کی) بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں"۔ (الجاثیہ:۱۳)

غرض اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اسی حقیقت کو جگہ جگہ بیان فرمایا ہے کہ کائنات میں کوئی بھی چیز بے کار

اور بے مقصد نہیں، زمین و آسمان کی تمام چیزیں انسان کے مفاد میں اپنے اپنے فرائض انجام دے رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان تمام مخلوقات کو انسان کے کام میں لگا رکھا ہے اور اس کے لیے مسخر کر رکھا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں جگہ جگہ مختلف انداز میں مخاطب کر کے انسانی عقل پر سوال کر کے اس کے ذہن کو بیدار کرتا ہے کہ:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ﴿١١٥﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ﴿١١٦﴾

"کیا تم نے گمان کر رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں (بے مقصد اور) بے کار ہی پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے پس اللہ جو (تمام کائنات اور تمام عالموں کا) حقیقی بادشاہ ہے بہت بلند بادشاہ ہے بہت بلند اور برتر ہے (اس بات سے کہ بے مقصد اور فضول چیز کو پیدا کرے) نہیں ہے کوئی معبود بجز اس کے وہ مالک ہے عرش کریم کا"۔
(المومنون: ۱۱۵---۱۱۶)

اس طرح کائنات کی ساری مخلوق انسان کے لیے ہو گئی تو کیا انسان کا وجود اور اس کی یہ عظیم معنوی قوتیں فضول و بے کار پیدا کی گئی ہیں ؟ تو عقل کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہر گز نہیں !، بلکہ انسان اپنے خالق و مالک اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کی طرف لوٹنے والا ہے۔ یہاں تک تو عقل نے رہنمائی کی لیکن اس کے آگے جوہرِ عقل اور انسان کی یہ معنوی قوتیں گھٹنے ٹیک دیتی ہیں۔ عقلِ انسانی اس سے عاجز ہے کہ وہ یہ معلوم کر لے کہ میری زندگی کا وہ خاص مقصد کیا ہے اور میرے وہ خاص فرائض کیا ہیں جو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ہو کر میں اس کی مرضی کی اطاعت اور بندگی کیسے کروں گا؟

باب...... وحی کی ضرورت

عقل کی طرح انسان کے باطنی حواس بھی مرضیاتِ الٰہی کو معلوم نہیں کر سکتے

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کے پاس ایسا باطنی اور اندرونی حاسہ ہے جو اگر وہ ریاضتوں اور مجاہدوں سے بیدار کرلے اور ترقی دے تو مادیات کے علاوہ وہ بہت سے عجائبات اور موجودات کا ادراک کر سکتا ہے اور اس پر اس نئے حاسہ کے کھلنے کی وجہ سے وہ چیزیں منکشف ہو سکتی ہیں جن کا ادراک کسی ظاہری حاسہ، آنکھ، کان وغیرہ سے ممکن نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ انسان کے اندر ایسے اور دوسرے حواس بھی ہوں لیکن بہر حال یہ بھی حواس ہی ہیں جو اس طرح کمزور، محدود، خطا پذیر اور متاثر ہونے والے ہیں ورنہ ان کے نتائج میں تناقُض اور اختلاف نہ ہوتا اور ان میں شک و احتمال پیدا نہ ہوتا اور بڑے مسائل میں خطا اور غلط روی ممکن نہ ہوتی، حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس حاسہ کے محسوسات میں اختلاف واقع ہوتا ہے، پھر اس اندرونی حاسہ سے جو چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ انسان کو مادیات کے ماوراء ایک دوسرے اقلیم کے عجائبات و موجودات نظر آئیں گی، اس کی وجہ سے انسان کو وسیع فضاؤں میں روحانی پرواز کر کے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن وہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مرضیات و نامرضیات اور اپنی سعادت و شقاوت کا قانون معلوم نہیں کر سکتا، وہ اس کی وجہ سے یا تو لہو لعب میں مبتلا ہو سکتا ہے کہ وہ اس کو ایک کھیل سمجھے اور ان چیزوں میں سیر کر کے ان میں مستغرق رہے یا اگر اپنی عقل کو کام میں لے آئے تو اس باب میں صرف اسی نتیجہ پر پہنچ جائے گا جس نتیجے پر وہ عقل کے ذریعہ پہنچ جاتا ہے، البتہ یہ حاسہ و قوت اس کی معلومات کو وسیع کر سکتا ہے جیسا کہ اگر کوئی خوردبین سے ایک پیالہ میں کروڑوں چھوٹے چھوٹے جراثیم دیکھ لے تو اس خوردبین کی وجہ سے تو اس نے ایک ایسی نئی مخلوق کو دیکھ لیا جو پہلے اس نے نہیں دیکھی تھی اور اس کی وجہ سے اس کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو گیا اللہ تعالیٰ کی قدرت بھی نظر آگئی، لیکن اس سے وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور بندگی کا طریقہ نہیں سیکھ سکتا۔ تو جس طرح اس علم تک رسائی عقل نہیں کر سکی اسی طرح اس کے دوسرے حواس بھی اپنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ انسان کو یہ علم اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہی حاصل ہوگا جس کا ذریعہ سلسلۂ نبوت و رسالت ہے۔

وحی کی ضرورت پر ایک دوسری دلیل

ہر انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی معنوی قوتوں اور جوہرِ عقل سے وحی و رسالت کی ضرورت پر یوں بھی استدلال کر سکتا ہے کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو جسم کی خدمت پر مامور کیا

ہے اور ساری کائنات بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے فطری تقاضوں کو پورا کرنے اور اس بدن کی نشو ونما اور اس کی تیاری میں مصروفِ عمل ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عقل اور ہنر کے ذریعے دنیا کی چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے اور جب مخالف آب و ہوا یا ناموافق غذا یا کسی غیر موزوں فعل و حرکت کے ارتکاب یا کسی اور حادثہ کی وجہ سے اس کا جسم اعتدال سے ہٹ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کائنات میں جڑی بوٹیوں وغیرہ کا انتظام فرما رکھا ہے تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنے بدن کو اعتدال میں لاکر شفایاب ہوسکے۔ اب یہ بات تو بالکل چڑھتے سورج سے بھی زیادہ واضح ہے کہ روح بنسبت جسم کے بہت ارفع و اشرف ہے، روح پر اس بدن کا دار و مدار ہے، روح نکلنے کے بعد جسم بے کار ہو جاتا ہے، غرض روح کی برتری اور فوقیت اس قدر واضح ہے جو کسی دلیل کی محتاج نہیں تو جس طرح اللہ تعالیٰ نے جسم کی نشو ونما اور اس کی غذا و دوا کا انتظام کر رکھا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور رحمتِ واسعہ سے انسان کی اس برتر اور اصلی جز کی نشو ونما اور اس کی غذا و دوا کا وسیع کامل اور مکمل انتظام فرمایا ہے۔ لیکن وہ انتظام کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ یہاں آکر عقل اور انسان کی معنوی قوتیں بے بس ہو جاتی ہیں کیونکہ روح کی قوت و صحت اور اس کے ضعف و بیماری کا دار و مدار انسان کے اندرونی جذبات اور اس کے افکار و کردار کے اعتدال اور بے اعتدالی یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نامرضیات پر ہے اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو دائرۂ عقل [1] اور اس کی قوتوں سے باہر اور وراء الوراء ہیں اور یہاں آکر انسانی عقل بے بس ہو جاتی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جس طرح بدن کے لیے مادی ہونے کی وجہ سے مادی غذا اور مادی دوا کا انتظام کر دیا ہے، اسی طرح روح کی عالَمِ بالا سے متعلق ہونے کی بنا پر اس کی غذا اور دوا کا انتظام بھی عالَمِ بالا سے کر دیا ہے، وہ انتظام وحی الٰہی اور سلسلۂ رسالت و نبوت ہے جس کے ذریعے انسان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت اور بندگی بتلائی جاتی ہے تاکہ اس کی رہنمائی میں انسان اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے مطالبوں پر عمل کر کے دنیا کی چیزوں کے جائز اور ناجائز استعمال اور اپنے افکار و کردار غرض پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عدل و قسط کے راستے پر ڈال دے۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

”ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیاں اور ہدایات دے کر مبعوث فرمایا اور ان کے ساتھ کتاب اور

---

[1] وحی کی ضرورت پر عقلی اور فطری دلائل اور عقل و سائنس کے دائرہ و حدود معلوم کرنے کے لیے بندہ کی کتاب ”دہریت سے اسلام تک“ ملاحظہ فرمائیں۔ مختار

(عدل و اعتدال کی) میزان کو نازل فرمایا تاکہ لوگ (اپنی تمام تر زندگی میں) عدل و انصاف پر قائم رہیں"۔ ①

(الحدید:۲۵)

اللہ تعالیٰ کے رسولوں پر ایمان، توحید کا ایک جز اور فرع ہے

لہٰذا ایمان بالرسالت، ایمان باللہ اور توحید کا ایک جز اور اس کی ایک فرع ہے اور اس پر ایمان لانا در حقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور رحمتِ واسعہ پر ایمان لانا ہے، اس کے بغیر ایمان باللہ، توحید اور اس کے تقاضوں کی تکمیل ناممکن ہے۔ جو شخص رسالت اور نبوت کے راستے کو چھوڑ کر اپنی عقل وغیرہ سے حق تعالیٰ کی بندگی کرنا چاہتا ہے، بلاشبہ ایسا شخص حقیقت میں اللہ تعالیٰ کو اپنا "الٰہ" بنانے کے بجائے اپنی خواہشِ نفس کی بندگی اور اپنی من چاہی زندگی کو اختیار کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا شخص مؤمن اور مؤحّد نہیں ہو سکتا، بلکہ کافر اور مشرک ہے اور ایسے لوگوں کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے:

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَىٰهُ ط

"کیا آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا الٰہ بنا رکھا ہے"۔

(الفرقان:۴۳)

---

① عدل و انصاف کے لیے باب "عدل و انصاف" کو پڑھ لیجیے۔

باب.....انبیاعلیھم السلام کی نبوت سے پہلے کی زندگی

انبیا علیہم السلام کا طبقہ

اللہ تعالیٰ نے جس طرح زمین و آسمان کے اندر چیزوں میں انسان کے وجود و بقا کے لیے حکیمانہ نظام بنا کر انسان کی خدمت میں لگا دیا ہے، اسی طرح انسان کی بقا و ترقی اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے خود انسانوں کے اندر باہمی تعاون کے لیے ایک عجیب نظام بنا رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی صلاحیتوں اور استعداد میں اور ان کے طبقوں کے میلانات کے اندر کچھ ایسا اختلاف و تفاوت پیدا فرمایا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے لیے مختلف خدمات سر انجام دے رہے ہیں کوئی طبیب او ڈاکٹر ہے، کوئی ماہرِ زراعت ہے، کوئی کاشتکار ہے، کوئی ڈرائیور اور کوئی تاجر ہے، کوئی انجنیئر اور کوئی معمار یا کاریگر ہے۔ علی ہذا القیاس مختلف قسم کے لوگ دنیا میں اپنی اپنی صلاحیت اور میلان کے مطابق کام کر رہے ہیں اور ہر طبقہ دوسرے کا کام آرہا ہے مثلاً ڈاکٹر و طبیب مریض کے کام آرہے ہیں اور مریض سمیت دوسرے طبقات کاشتکاری وغیرہ ڈاکٹر کے کام آرہے ہیں، حاکم رعایا کے کام اور رعایا حاکم کے، گاہک دکانداروں اور دکاندار گاہکوں کے کام آرہے ہیں جس کی وجہ سے انسانیت کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں اور فن و ہنر وغیرہ کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف طبقات مل کر انسانیت کی تکمیل کرتے رہتے ہیں یہ تو ایک مشاہدہ کی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ و دستور اور اس کی ایک ایک حکمت و فائدہ تو کم از کم ہر کسی کو نظر آرہا ہے اور ہر کسی کی سمجھ میں آرہا ہے کہ اگر ساری انسانیت کی استعداد ایک قسم کی ہوتی اور ایک قسم کا میلان ہوا کرتا تو جسمانی ضرورتوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اس قاعدہ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ سمجھنا بھی ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کسی کو نبی بنا کر مبعوث نہیں فرماتے، بلکہ اس کام کو بجالانے کے لیے اس نے ایک خاص طبقے کا انتظام فرمایا ہے۔ اس مقدّس گروہ کے افراد میں اول سے ہی اللہ تعالیٰ نے وہ پیغمبرانہ صلاحیتیں اور خصوصیات رکھ دی ہیں جو ان کے علاوہ دوسرے لوگوں میں نہیں ہوتیں۔ ان حضرات پر ہی وہ غیبی حقیقتیں کھول دیتے ہیں اور ان پر وہ وحی اور علم الیقین کو نازل فرماتے ہیں جو دوسروں پر نازل نہیں فرماتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بار بار مختلف انداز میں اسی حقیقت کو واضح فرمایا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ

”اللہ تعالیٰ کا یہ قاعدہ نہیں کہ تم (میں سے ہر فرد) کو غیب پر مطلع کر دے وہ اپنے رسولوں میں جس کو چاہتا

ہے (اس بات کے لیے) چن لیتا ہے"۔(آل عمران:۱۷۹)

یہ وہ مقدّس گروہ ہے جو انسانوں کی اخلاقی اور روحانی محبت و ترقی اور انسانیت کو عدل و قسط پر قائم رکھنے کے کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوتے ہیں اور مخلوق کی خدمت اللہ تبارک و تعالیٰ کی منشا اور اس کی ہدایت کے مطابق بجالاتے ہیں اور وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق کے ساتھ نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیے مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں اور انسانوں کی دنیا کے امن و اطمینان اور آخرت کی نجات اور کامیابی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

منصبِ نبوت کے لیے پیغمبرانہ قابلیت اور استعداد ضروری ہے

اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو اس عظیم منصب پر فائز کرنا چاہتا ہے تو اول سے اس میں وہ خصوصیات اور قابلیتیں رکھ دیتے ہیں جو نبوت کے لیے ضروری ہیں۔ جب یہ بات اور قاعدہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان پر اپنی مرضیات و نامرضیات اور حقائق کا علم اور وحی نازل نہیں فرماتا، بلکہ اس کام کے لیے انسانوں میں سے خود کسی کو چن کر منتخب فرمالیتا ہے تو یہاں اس بات اور اللہ کے دستور کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جس طرح ہر درخت پر وہی پھل لگتا ہے جس پھل کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بنایا ہے مثلاً کھجوریں، کھجور کے درخت سے اور آڑو، آڑو کے درخت سے ہی حاصل ہوتی ہیں اور ان درختوں کے آثار و خواص اور پھل، مزہ، رنگ اور بو غرض جملہ خصوصیات ان درختوں کے تخم میں اس وقت بھی موجود ہوتی ہیں جبکہ وہ تخم کی صورت میں ہوتے ہیں تو اسی طرح اللہ تعالیٰ جس کو نبوت کے عظیم منصب پر فائز کرنا چاہتے ہیں تو اس میں اول ہی سے وہ خصوصیات و امتیازات رکھ دیتے ہیں جو اس منصب کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔

نبیوں کی بے داغ سیرت

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو انبیا علیہم السلام کی زندگیوں میں دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے سنا، اس پر ان کی پاک زندگیاں شاہد ہیں۔ چنانچہ ہر نبی کی زندگی پر نظر ڈالیں تو اس کا نسب پاک اور بے داغ ہو گا، وہ صورت و جسم کے لحاظ سے درست اور مکمل انسان ہو گا، ان کے اخلاق نہایت کریمانہ اور ان کی سیرت نہایت صاف ستھری و پاکیزہ ہو گی، ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم اور حکمت تمام انسانوں سے بالاتر ہو گی، وہ فطرتاً صحیح سوچتا ہو گا اور صحیح بولتا ہو گا اور وہ کسی خارجی تعلیم و تربیت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور سلامتِ فطرت کی بنا پر حق و باطل اور صحیح و غلط کا امتیاز کرے گا اور اپنے میلان طبعی کی رو سے وہ فسق و فجور کی راہ سے اپنا دامن بچا بچا کر حق و

تقویٰ کی راہ پر چلنے کو اختیار کرے گا، ان کی فطرت اس قدر سلیم ہو گی کہ وہ ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتے ہیں اور وہ ہر قسم کی بناوٹ تکلّف اور نمائش سے پاک ہوتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام نبوت سے پہلے بھی گناہوں سے پاک ہوتے ہیں

ان کی نبوت سے قبل بچپن سے لے کر نبوت تک کی زندگی ان کے دعوائے نبوت پر شاہد ہوتی ہے، چنانچہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں بے داغ، صداقت کے پیکر ہوتے ہیں اور ان کی پوری زندگی غیر مشتبہ ہوتی ہے۔ وہ شرک وکفر اور مجرمانہ ماحول میں پرورش پانے اور رہنے کے باوجود ان چیزوں کی گندگیوں سے بچائے جاتے ہیں۔ وہ ہر قسم کی اخلاقی کمزوریوں، جھوٹ، غلط بیانی اور دھوکہ وغیرہ غرض ہر قسم کے گناہوں، آلودگیوں اور ذلیل و بے مروت باتوں سے مبرا اور پاک ہوتے ہیں۔ وہ بچپن ہی سے اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں اور ان کی دیانت، امانت اور سچائی اس قدر قوم وقبیلہ پر واضح ہوتی ہے کہ وہ رسالت ونبوت سے پہلے کی اپنی پوری زندگی کو گواہ بنا کر یہ اعلان کر سکتا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾

”میں تو اس (دعوائے نبوت) سے پہلے بھی عمر کا ایک بڑا حصہ (چالیس سال) تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے؟ پھر اس سے زیادہ بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو جھوٹ بنا کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف منسوب کرے یا وہ جو اللہ تعالیٰ کی سچی آیتوں کو جھٹلائے یقیناً مجرم لوگ فلاح نہیں پا سکتے“۔ (یونس:۱۶---۱۷)

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت اور اپنے پیغمبر کی بے داغ سیرت بھی پیش کی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مذکورہ الفاظ کہلوائے ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ میں کوئی باہر سے آیا ہوا اجنبی اور نیا انسان تو نہیں ہوں جس کے حالات وعادات سے تم بے خبر ہو، بلکہ نزول قرآن اور دعوائے نبوت سے قبل میں نے تمہارے سامنے پوری چالیس سال کی طویل مدت گزاری ہے جس میں تم کو میری زندگی کے ہر شعبہ وہر معاملہ میں خوب تجربہ ہو چکا ہے۔ کیا اول سے لے کر اب تک میری کوئی ایک بات اور کوئی ایک معاملہ بھی ایسا دیکھا ہے جو سچائی، دیانت داری اور امانت داری کے خلاف ہو؟ اگر میری پوری زندگی میں کہیں بھی کوئی داغ نہیں پا سکتے، بلکہ اس کے برعکس پوری قوم میں سچائی وامانت داری معروف اور مسلّم ہے تو آپ غور کریں کہ جس شخص نے پوری زندگی میں نازک سے نازک موقعوں پر بھی ذرہ برابر جھوٹ اور غلط بیانی نہیں کی ہو تو آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ

وہی شخص اچانک جھوٹ موٹ بنا کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرے؟ اور لوگوں کو فریب دے؟ اور اتنی سچائی و پاکیزگی کے باوجود ایسے بڑے جرم جھوٹ، بہتان اور فریب پر آمادہ ہو جائے جس سے بڑا جرم اور بہتان کوئی نہیں ہو سکتا۔

انبیا علیہم السلام معصوم ہوتے ہیں

حضرات انبیا علیہم السلام اپنی پوری زندگی میں معصوم ہوتے ہیں، ان سے قصداً و ارادۃً گناہ کا صدور نا ممکن ہوتا ہے اور اپنی پوری زندگی میں جان بوجھ کر گناہ تو کیا گناہ کا ارادہ بھی نہیں کرتے۔

محفوظ اور معصوم میں فرق

معصوم کا مطلب یہ ہے کہ ان سے قصداً و ارادۃً گناہ نا ممکن ہو اور محفوظ کا مطلب یہ ہے کہ وہ بعض اوقات گناہ کو جان کر اس کا ارادہ کرے لیکن اللہ تعالیٰ گناہ سے اس کی حفاظت فرماتا ہے جیسا کہ کسی شخص کو ڈاکٹر نے کسی چیز سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہو اور وہ پرہیز بھی کرتا ہے لیکن بعض اوقات جذبات سے مغلوب ہو کر اس ممنوع چیز کی طرف کھانے کے ارادے سے اپنا ہاتھ بڑھا دیتا ہے لیکن اس کا کوئی خیر خواہ اس کے ہاتھ کو روک دیتا ہے اور اس کو بدپرہیزی سے بچا لیتا ہے۔ حضرات انبیا علیہم السلام انسانوں کا وہ طبقہ ہیں جو معصوم ہوتے ہیں، ان کے علاوہ جتنے بھی انسان ہیں ان کو اصطلاح میں معصوم نہیں کہا جاتا اگرچہ کسی سے اپنی پوری عمر میں کوئی گناہ صادر نہ ہوا ہو، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے دوستوں کو گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں یا تو ان کے گناہ کے ارادہ کو ناکام کر دیتے ہیں اور وہ پشیمان ہو کر برے ارادے سے توبہ کر لیتے ہیں یا اگر کوئی گناہ ہو چکا ہے تو ان کو جلد ہی احساس ہو جاتا ہے اور وہ فوراً توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی پوری زندگی میں پاک صاف ہو جاتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق وھم بھا کا مطلب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضرات انبیا علیہم السلام کے لیے کسی گناہ کا قصد کرنا نا ممکن ہے تو پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق جو آیا ہے کہ وَهَمَّ بِهَا تو اس کا مطلب کیا ہے؟

اس سوال کے جواب سے پہلے اس پوری آیت کو پیش کرتا ہوں جس میں یہ جملہ مذکور ہے:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ

"اور یوسف جس عورت کے گھر میں تھے وہ اس کو بہکانے اور پھسلانے لگی اور (ایک دن) اس (عورت) نے

(تمام) دروازے بند کر لیے اور (یوسف علیہ السلام سے) بولی کہ بس اب آجاؤ اس نے (فوراً) کہا معاذ اللہ (اللہ تعالیٰ کی پناہ) وہ میرا آقا ہے، اس نے مجھے اچھی طرح رکھا ہے (یہ تو بڑی بے وفائی اور ظلم ہے کہ میں یہ گناہ کروں) بے شک ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے اور عورت نے تو اس کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور وہ (یوسف علیہ السلام) بھی ارادہ کر لیتا اگر اپنے رب کی برہان کو نہ دیکھ لیتا"۔ (یوسف:۲۳---۲۴)

ان آیتوں کا مختصر پس منظر یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں نے مصر میں عزیز مصر کے ہاتھ بیچ دیا تو اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھتے ہی تاڑ لیا کہ یہ کسی نہایت اعلیٰ خاندان کا چشم و چراغ ہے جو کسی طرح بیچنے والوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اس لیے انہوں نے اپنی بیوی زلیخا کو یہ ہدایت کی کہ اس کو غلام کی طرح نہیں، بلکہ پوری خاطر اور مدارت سے رکھنا، بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔

زلیخا نے جب آپ کو دیکھا تو وہ آپ کی محبت و عشق میں گرفتار ہوئی، وہ آپ پر اس قدر فریفتہ ہوئی کہ اس کو اپنی آبرو و عزت کا کوئی خیال نہ رہا اور وہ برابر حضرت یوسف علیہ السلام پر ڈورے ڈالنے لگی اور ان کو بہلاتی پھسلاتی رہی یہاں تک کہ ایک روز اس نے موقع پاکر کمرے اور گھر کے تمام دروازے بند کر دیے اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بڑے عشق و محبت کے انداز میں بولی کہ بس اب آجاؤ۔ انہوں نے بلا تاخیر انکار کر دیا اور زلیخا کو بھی اس کے برے ارادے پر ٹوکا جیسا کہ مذکورہ بالا آیت سے یہ بات واضح ہے۔

البتہ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کا مطلب کیا ہے؟ اس کے بارے میں بعض علما فرماتے ہیں کہ زلیخا کے هَمَّتْ سے تو مراد عزم و قصد ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کے وَهَمَّ بِهَا سے مراد محض میلان طبعی ہے۔ اس ترجمہ میں عقیدت کا دخل تو ضرور ہے لیکن حقیقت سے دور معلوم ہوتا ہے، بلکہ اس کا سیدھا سا ترجمہ و مطلب وہی ہے جو ترجمے میں گذر چکا جس پر کوئی اشکال نہیں ہو سکتا وہ یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے برائی کا ارادہ ہی نہیں کیا تھا، اس کی تفصیل یہ ہے:

وَهَمَّ کے معنی

وھم کے معنی پختہ ارادہ، قصد اور عزم کے ہیں۔

برھان کے معنی

برھان سے مراد وہ نور اور طاقت و ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی فطرت میں رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے انسان حق و باطل، خیر و شر کا امتیاز بھی کر سکتا ہے اور وہ انسان کو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور شر سے بچاتا بھی ہے۔

یہ نور اور طاقت تو ہر ایک انسان کی فطرت میں رکھ دی جاتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت اور دستور یہ ہے کہ جو اس نور اور طاقت کی قدر کرتا ہے اور اس نور و ضمیر کی رہنمائی کو قبول کرتا ہے تو اس کے اندر یہ قوت اور نور برابر ترقی کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اس قدر قوی تر اور مضبوط تر ہو جاتا ہے کہ وہ سخت آزمائش کے موقع پر بھی انسان کو نفس اور شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے، بلکہ برابر اپنے اس نور و ضمیر کی رہنمائی اور تنبیہات کو ٹھکراتے ہیں تو ان کے اندر یہ نور آہستہ آہستہ کمزور ہوتے ہوتے ایک دن بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں برھان سے مراد یہی نورِ فطرت ہے۔ سلیم الفطرت ہونے کی وجہ سے ان کے اندر صرف محفوظ ہی نہ تھا، بلکہ برابر ترقی پر ترقی کرتا رہا یہاں تک اس قدر سخت آزمائش میں یہی نور کام آیا اور یہ نور و برہان تھا جس کی وجہ سے وہ برائی کا ارادہ بھی نہ کر سکے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا کے بعد لَوْ لَآ کا جملہ

باقی رہی یہ بات کہ لَوْ لَآ کی جزا کو کیوں مقدم کیا یعنی وَهَمَّ بِهَا کے بعد لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ کو کیوں لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں لَوْ لَآ کا جملہ شرطیہ مناسب تھا اور یہ جملہ ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ماں کے بارے میں مذکور ہے کہ جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں بند کر کے دریا میں ڈال دیا تو اس وقت ان کی دلی کیفیت کو بیان کر کے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَصْبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوْسٰى فٰرِغًا ؕ اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ لَوْ لَآ اَنْ رَّبَطْنَا عَلٰى قَلْبِهَا

"اور موسیٰ (علیہ السلام) کی والدہ کا دل (اس قدر) بے قرار ہو گیا (کہ) قریب تھا کہ وہ اس راز کو ظاہر کر دیتیں اگر ہم اس کے دل کو نہ سنبھالتے"۔ (القصص:۱۰)

یہاں بھی دیکھ لیجیے کہ لَوْ لَآ کی جزا مقدم ہے یعنی اِنْ كَادَتْ لَتُبْدِيْ بِهٖ کے بعد لَوْ لَآ کا جملہ شرطیہ آیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ سیاق و سباق کی رو سے

پھر حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے۔ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

رَوْدٌ کے معنی کسی چیز کو چاہنا، طلب کرنا اور کسی چیز کی طلب میں کوشش کرنا، اس کے بعد جب عن کا لفظ آجائے تو چونکہ عن اعراض کے لیے آتا ہے اس لیے اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کسی سے اس کی مرضی کے

خلاف کوئی چیز طلب کرنا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس عورت کے گھر میں یوسف علیہ السلام تھے، وہ عورت یوسف علیہ السلام کی مرضی کے خلاف چیز کو طلب کر رہی تھی اور ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرتی تھی اور ان کو فریب کے ذریعے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی تھی، خود حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی یہ بات دہرائی کہ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي "اس نے مجھ سے میری مرضی اور چاہت کے خلاف چیز طلب کی"۔ یعنی اس نے مجھے ہر طرح سے پھسلانا چاہا۔ اور ایک جگہ خود عزیز مصر کی بیوی نے یہ اعتراف کیا کہ: وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهُ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ "اور میں نے تو اس کو (بہت ہی) بہلانا پھسلانا چاہا لیکن وہ بچ ہی رہا"۔ (یوسف:۳۲)

اور بالآخر زلیخا نے کچہری میں اعتراف کیا کہ:

اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾

"میں نے ہی اس کو بہلانا پھسلانا چاہا اپنے مطلب بر آری کے لیے (لیکن وہ بچا رہا) بلاشبہ وہ تو سچا ہے"۔ (یوسف:۵۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا اپنی مطلب بر آری کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو پھسلانے کی کوشش کرتی رہی، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی وہ ان کو اپنی طرف مائل نہ کر سکی۔

پھر دیکھیے! کہ جب زلیخا نے دروازے بند کر دیے اور حضرت یوسف علیہ السلام پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو اس وقت جو الفاظ آپ کی زبان سے نکلے وہ یہ ہیں:

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

"(جب اس عورت نے اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تو فوراً حضرت یوسف علیہ السلام نے) کہا اللہ کی پناہ وہ تو میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا بے شک ظالم لوگ کبھی فلاح نہیں پاتے"۔ (یوسف:۲۳)

"ولقد همت به و هم بها لولا ان را برهان ربه" کا پورا مطلب

اب آخر میں پھر ان آیتوں کا ترجمہ کھول کر لکھ دیتا ہوں جس سے بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرات انبیا علیہم السلام کے نفوس کس قدر پاکیزہ ہوتے ہیں۔

"اور جس عورت کے گھر میں یوسف تھا وہ عورت اپنے مطلب بر آری کے لیے اسے بہلانے پھسلانے (اور اس پر طرح طرح کے ڈورے ڈالنے لگی) ایک روز اس (عورت) نے (گھر کے تمام) دروازے بند کر دیے اور

(یوسف سے) بولی کہ بس آ بھی آجاؤ (یوسف علیہ السلام یہ دیکھ کر اور سن کر فوراً) بولے اللہ تعالیٰ کی پناہ (یعنی میں اللہ تعالیٰ سے ایسے برے ارادے اور کام کی پناہ اور حفاظت چاہتا ہوں) وہ تو میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح (عزت کے ساتھ) رکھا (تو میں اس کی حق تلفی کیسے کر سکتا ہوں یہ تو بڑا ظلم ہے) بلاشبہ ظالم لوگ فلاح نہیں پاسکتے۔ (یوسف علیہ السلام گناہ سے اس قدر متنفر اور بے زار کیوں تھے؟ یہ اس لیے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ودیعت کردہ نورِ فطرت اور برہان جگمگا رہا تھا ورنہ) یقیناً اس عورت نے تو ان کا قصد (اور ان پر ہاتھ ڈالنے کا پختہ ارادہ) کر ہی لیا تھا وہ بھی اس کا ارادہ کر لیتے اگر وہ اپنے رب کا برہان نہ دیکھتے''۔

انبیا علیہم السلام سے گناہ کرنے کی طاقت سلب نہیں کر لی جاتی ورنہ.................

یہاں یہ بات یاد رہے کہ معصوم ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرات انبیا علیہم السلام سے گناہ کرنے کی قوت و طاقت سلب کر لی جاتی ہے، ورنہ اگر ان سے فرشتوں کی طرح گناہ کرنے کی قوت و طاقت ہی سلب کر لی جائے اور ان کے اندر خواہشات و جذبات ہی نہ رہیں تو ان کا کمال کیا ہوا؟ جبر میں تو کوئی کمال ہی نہیں ہوتا کمال تو یہ ہے کہ ان سب کچھ قوتوں اور طاقتوں کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کا ارادہ نہ کریں اور یہی ان کا کمال ہوتا ہے کہ وہ برابر اپنے نورِ فطرت کی نگرانی کرتے ہیں اور ان کا یہ نور اس قدر قوی اور ترقی یافتہ ہوتا ہے کہ وہ سخت آزمائش میں بھی راہِ حق سے ہٹنے کا ارادہ نہیں کر سکتے۔

یہاں یہ دیکھیے! کہ اٹھارہ بیس سال کا نوجوان ہے، غیر شادی شدہ ہے خاندانی عورت ایک نہیں، بلکہ مصر کی تمام حسین و جمیل اور نوجوان لڑکیاں اپنے آپ کو بنا سنوار کر اور طرح طرح کے عشق و محبت کی پینگیں بڑھا کر اور اپنے مکر و فریب کے تمام دعووں اور اداؤں کے باوجود کسی طرح بھی ان کو اپنی مائل نہ کر سکیں اور ان کے دلوں پر ان کی عظمت اور پاکیزگی کا سکہ اس قدر چل گیا کہ انہوں نے ان کو بزرگ اور فرشتہ صفت ہی قرار دیا۔

اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ کے اندر قوت و طاقت نہیں تھی، انبیا علیہم السلام کے بیوی بچے بھی ہوتے ہیں، ان کے اندر طاقت، قوت اور خواہش موجود ہوتی ہے، لیکن ان کی فطرت اس قدر پاکیزہ ہوتی ہے کہ ان سے قصداً و ارادۃً گناہ کا صدور ناممکن ہوتا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا بچپن بھی گمراہی سے پاک ہوتا ہے پھر ان کے متعلق ضال کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟

باقی رہا یہ سوال کہ خود قرآن مجید میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلی زندگی کے متعلق یوں فرمایا گیا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝

"اور آپ کو ضال پایا تو ہدایت دی"۔(الضحیٰ:۷)

اس کے جواب سے پہلے ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہیے وہ یہ کہ:

علم و ہدایت کے بے انتہا مدارج ہیں

علم کی کوئی ایک حد متعین اور مقرر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا علم بے نہایت ہے اور کوئی بھی مخلوق علمی لحاظ سے جتنی بھی ترقی کر لے پھر بھی اس کے سامنے حصولِ علم کی دوڑ کے لیے بے نہایت میدان رہے گا، یہی حال ہدایت کا ہے۔ آپ نے پہلے اوراق میں یہ بات ملاحظہ کی ہوگی کہ ہدایت ورہنمائی کے درجات، جمادات اور معدنیات سے شروع ہو کر کس طرح بتدریج نباتات وحیوانات اور پھر انسان میں بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں، علم و ہدایت کے ہر درجہ پر نظر کی جائے تو اس سے نچلا درجہ، درجۂ جہل اور ضلالت نظر آئے گا مثلاً سخت تاریکی میں موم بتی کی روشنی یقیناً بہت تیز سمجھی جاتی ہے، لیکن اگر اچانک اعلیٰ روشنی والی لالٹین لائی جائے تو موم بتی کی روشنی ماند پڑ جائے گی، اگر اس کے بعد سو وولٹ کا بلب جلایا جائے تو پھر اس لالٹین کی روشنی ہیچ ہو جائے گی، اس طرح جس قدر روشنی بڑھتی جاتی ہے اس سے پہلے موجودہ کم روشنی تاریکی نظر آنے لگتی ہے، تیز روشنی والا بلب یا موم بتی تاریکی میں جلائی جائے تو دور سے نظر آئے گی اور چمکتے ہوئے سورج میں تیز سے تیز تر روشنی والا بلب جلائیں وہ روشنی تو کیا دے گا، کچھ فاصلہ کے بعد اس بلب کا وجود بھی نظر نہیں آئے گا، یہی وجہ ہے کہ صرف عام انسان کے لیے نہیں، بلکہ افضل ترین واکمل ترین انسان کو بھی یہی حکم ہے کہ:

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا

"(اے نبی) دعا مانگو کہ اے میرے رب! میرے علم کو اور زیادہ کر دے"۔(طٰہٰ:۱۱۴)

اور جس طرح سے ایک عام مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اپنی پنجگانہ نماز میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (الفاتحہ) پڑھے، اسی طرح مقربین اولیاء اللہ، بلکہ خود نبی کریم ﷺ پر بھی واجب ہے کہ وہ بھی نمازوں میں یہی کچھ پڑھتے رہیں اور مانگتے رہیں تو جس طرح علم و ہدایت کے بے نہایت درجات ہیں اسی طرح اس کے ضد جہل و ضلالت کے بھی بے نہایت درجات بن جاتے ہیں۔

عربی میں لفظ ضلالت کو متعدد معنوں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے

اس کے بعد یہ سمجھیں کہ قرآن کریم میں لفظ ضلالت کو متعدد معنوں میں استعمال کیا گیا ہے مثلاً عورتوں کی

گواہی مقرر کرنے کے موقع پر اس کی علت ذکر فرماتے ہیں:

اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ

"تاکہ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک عورت (بھی ٹھیک ٹھیک شہادت اور گواہی دینا) بھول جائے تو دونوں میں سے ایک، دوسری کو یاد دلا دے"۔ (البقرہ:۲۸۲)

اس آیتِ کریمہ میں لفظِ ضلالت بھولنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

ایک اور آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے علم کی تعبیر یوں کی ہے:

لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى

"میرا رب نہ (ذرہ برابر) غلطی کرتا ہے اور نہ کسی چیز کو بھولتا ہے"۔ (طٰہٰ:۵۲)

دیکھیے یہاں غلطی اور چوکنے کے لیے ضلالت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو لفظ ضلالت استعمال کیا گیا ہے اس کے معنی

اور یہی لفظ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے حق میں بھی استعمال فرمایا ہے، اس سے متعلقہ واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک دن باہر تشریف لے آئے تو دیکھا کہ ایک قبطی و فرعونی ایک اسرائیلی پر ظلم کر رہا ہے، اسرائیلی موسیٰ علیہ السلام کو فریاد کر کے پکار رہا تھا کہ مجھے اس ظالم کے ظلم و ستم سے نجات دلائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم کی امداد کے لیے اس فرعونی کو ایک مکا مارا تا کہ وہ اسرائیلی مظلوم کو چھوڑ دے لیکن وہ اتفاقاً ان کے مکے سے مر گیا۔ اس کے بعد وہ ملک چھوڑ کر دوسری جگہ چلے گئے، وہاں چند سال گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو منصبِ نبوت سے سرفراز فرمایا اور اللہ نے آپ کو حکم فرمایا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور دینِ حق کی طرف بلاؤ۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور دین حق فرعون کے سامنے رکھ دیا تو فرعون نے انہیں یہ طعنہ دیا کہ آپ میرے مجرم ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: قَالَ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ "موسیٰ (علیہ السلام) نے جواب دیا کہ میں نے وہ کام اس وقت کیا تھا جبکہ میں ناواقف تھا"۔ (الشعراء:۲۰)

ذرا غور کیجیے! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نہ بت کو پوجا کیا تھا اور نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک و کفر کی بات کی تھی اور نہ ان پر اس قسم کی کوئی تہمت تھی اگر تھی تو صرف یہ کہ آپ کے ہاتھ سے ایک ظالم قتل ہوا تھا، وہ واقعہ بھی سامنے ہے اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کون سی غلطی تھی؟ مظلوم کی مدد کرنا کوئی گناہ نہیں، بلکہ واجب ہے اور موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ اپنا ایک فرض سمجھ کر کیا تھا کہ مظلوم کو ظالم کے پنجے سے چھڑائیں، اسے چھڑانے میں

ایک مکے کی ضرورت پڑی اور یہی ایک مکہ اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا حالانکہ ایک مکے سے کوئی مرتا نہیں اور نہ قتل کے ارادے سے مکا مارا جاتا ہے اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد اس کو قتل کرنا تھا، بلکہ ظالم کے ظلم سے ایک اسرائیلی کو آزاد کرنا تھا جو ایک صحیح قدم تھا، لیکن یہی صحیح قدم غلطی پر پہنچ گیا، وہ فرعونی قضائے الٰہی سے مر گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نادم ہوئے کہ نقصان ہوا، اللہ تعالیٰ سے استغفار کی اور معافی مانگی، اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف فرمایا۔ اس تفصیل کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مختصر پیرائے میں بیان فرمایا کہ وہ کام مجھ سے اس وقت صادر ہوا تھا جب کہ میں ناواقف اور بے خبر تھا۔ جس کے متعلق یہاں دو مطلب بیان کرتے ہیں ایک یہ کہ یہ کام مجھ سے نادانستگی میں ہوا تھا مجھے اس بات کا کیا علم اور خبر تھی کہ یہ شخص اس ایک گھونسے سے چل بسے گا، لہٰذا میرا اس کام کا ارتکاب کرنا منصبِ نبوت کے منافی نہیں ہے، یہ ایسا کام نہیں جو منصبِ نبوت کو مجروح کر سکتا ہے یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت میں نے یہ کام کیا تھا اس وقت میں ہدایت، وحی اور نبوت کے اس منصب پر فائز نہیں تھا اور اس وقت میرے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں آتی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ بتلاتے کہ اس قبطی اور فرعونی کی موت آچکی ہے، لہٰذا اس کو ہاتھ نہ لگاؤ، یہ وحی کا سلسلہ تو اس کے بعد شروع ہو چکا ہے جس کے ذریعے مجھے قدم قدم پر بتلایا جاتا ہے۔ بہر حال یہاں ضلالت کا لفظ یا تو نادانستہ ارتکاب کے لیے یا نبوت سے پہلے کی زندگی کے لیے استعمال ہوا اور نبوت سے قبل کی زندگی اور نبوت کے بعد کی زندگی اور روشنی میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ ایسی کھلی بات ہے جس کے بیان کی ضرورت نہیں۔

حضرت یعقوب علیہ السلام کے متعلق بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے

پھر ذرا حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعہ پر غور کریں! جب حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر سے اپنے والد کی خدمت میں اپنا کرتہ بھیجا تو کرتہ بھیجتے ہی حضرت یعقوب علیہ السلام کو خوشبو محسوس ہونے لگی:

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

"جب (یہ) قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے باپ نے فرمایا کہ اگر تم مجھ کو بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو (تو ایک بات کہوں کہ) میں تو یوسف کی خوشبو کو محسوس کر رہا ہوں"۔ (یوسف:٩٤)

تو جواب میں مجلس والوں نے کہہ دیا:

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾

"انہوں نے کہا اللہ کی قسم آپ اب تک (اسی) پرانی غلطی میں پڑے ہو (کہ یوسف زندہ ہے اور دوبارہ آپ

اس سے ملیں گے)"۔(یوسف:۹۵)

ذرا غور کیجیے! اگر غیروں کو معلوم نہ ہو تو گھر والوں اور مجلس والوں کو تو یہ خوب معلوم تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا عقیدہ اور عمل ہر قسم کی برائی اور آمیزش سے پاک ہے اور ان کی سچائی، دیانت داری اور امانت داری ان کے سامنے تھی، البتہ ان کا خیال یہ تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام پر یوسف علیہ السلام کی وہی پرانی محبت مسلط ہے اور وہ ان کے زندہ ہونے اور دوبارہ ملنے کے اسی پرانے شوق و عشق میں مبتلا ہیں اور وہی وہ پرانے خیالات ہیں جو خوشبو بن کر ان کے دماغ میں آتے ہیں حالانکہ یوسف علیہ السلام کا تو کہیں نام ونشان بھی نہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ والہانہ محبت، ان کی پرانی تلاش، دوبارہ ملنے کی آرزو اور بے چینی کے لیے یا غلطی کے لیے ضلالت کا لفظ استعمال کیا گیا۔ مذکورہ بالا تفصیل اور قرآنی سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ ضلالت کا لفظ صرف گمراہی اور بے دینی کے لیے استعمال نہیں ہوتا، بلکہ عربی میں بھول چوک اور کسی کی تلاش میں بے چینی وغیرہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى کا مطلب

اس پوری تفصیل کو سامنے رکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ہے کہ:

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى

"اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ضال پایا تو ہدایت دی۔"(الضحیٰ:۷)

اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ نعوذ باللہ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عقیدہ و عمل میں کوئی خرابی تھی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کفر و شرک میں مبتلا تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کیونکہ یہ تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پوری زندگی میں کبھی بت کو سجدہ نہیں کیا، شرک کے ماحول میں رہتے ہوئے کبھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی ہستی اور اس کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے، جاہلیت کے ماحول میں رہ کر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبوبِ حقیقی اللہ تعالیٰ جل شانہ کو ہی پکارتے رہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے وحی ہدایت بھیجی اور وصول الی اللہ اور اصلاحِ خلق کی تفصیلی راہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول کر دینِ اسلام کو نازل فرمایا تو اس آیتِ کریمہ: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى کے معنیٰ یہ ہوگئے کہ: اللہ تعالیٰ نے تجھے اپنی محبت، راہِ حق اور وصول الی اللہ کی راہوں میں حیران پایا تو آپ کو راہِ حق اور وصول الی اللہ کی تفصیلی راہوں کی ہدایت دی۔"

یعنی "منصبِ نبوت سے نوازا" یا اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے حق کی طلب و اشتیاق اور وصول الی

اللہ کے راستوں کے لیے بے چین پایا تو آپ کو وصال محبوب کی راہوں کی طرف رہنمائی کی۔" (یعنی آپ پر دین حق نازل فرمایا اور منصبِ نبوت پر فائز کیا) جیسا کہ قرآن مجید نے نبوت سے پہلے زندگی کو ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ؕ مَا كُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَ اِنَّكَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۙ﴿۵۲﴾ صِرَاطِ اللّٰهِ الَّذِیْ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ اَلَاۤ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿۵۳﴾

"اور اس طرح ہم نے اپنے حکم سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی (حالانکہ اس سے پہلے) نہ آپ کو یہ خبر تھی کہ کتاب اللہ کیا (ہوتی) ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ ایمان (کی حقیقت، اس کے تفصیلی احکام اور اس کا مکمل ترین درجہ) کیا (ہوتا) ہے، لیکن ہم نے اس کو (ایسا سراپا) نور بنا دیا جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں (اس کی صلاحیت واستعداد کے مطابق) ہدایت دیتے ہیں، بلا شبہ تم راہِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرنے والے ہو (یعنی) اس اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف جو آسمانوں اور زمینوں کی ہر چیز کا مالک ہے یاد رکھو! کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔" (شوریٰ:۵۲-۵۳)

بہر حال کتاب وایمان کے نورِ ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت تھی جس کو کہیں ضلالت اور کہیں بے خبری کہا گیا ہے جس سے مقصد حقیقی گناہ نہیں، بلکہ حق کی تلاش اور طلبِ معرفت، وصالِ محبوب کے لیے بے چینی اور حیرانی تھی۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے دامن کو جاہلیت کی لغویات اور یہودی بری رسم ورواج سے محفوظ رکھا۔ سچائی وامانت داری اور دیانت داری، پاکیزہ کردار آپ ﷺ کا ایسا مشہور اور ایک مسلّم حقیقت بن گئی کہ دوست تو دوست دشمن بھی اس کے خلاف گمان نہیں کر سکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک موقع پر نبوت سے پہلے کی زندگی ہی کو آپ ﷺ کی شہادت میں پیش کیا ہے:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

"میں تو اس (دعوائے نبوت) سے پہلے بھی عمر کا ایک بڑا حصہ (چالیس سال) تمہارے درمیان گزار چکا ہوں کیا تم (اتنی بات بھی) نہیں سمجھتے؟" (یونس:۱۶)

آپ ﷺ کی نبوت سے پہلے زندگی میں یہی کچھ ملے گا کہ آپ ﷺ شرک وکفر، جاہلیت کی لغویات اور

رسم ورواج سے سخت بے زار تھے اور آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی فطرت میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا ساری مخلوق سے اعلیٰ درجہ، راہِ حق کی تلاش اور ہدایتِ خلق کا جو اکمل ترین اور افضل ترین استعداد و صلاحیتیں ودیعت کی گئی تھیں وہ اندر ہی اندر جوش مارتی تھیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مقصد کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت اور راہ حق کی بے چینی بڑھتی گئی۔ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی طرف کوئی صاف ستھری راہ بظاہر دکھائی نہ دیتی تھی اللہ تعالیٰ کے عشق و محبت اور وصول الی اللہ اور راہِ حق کی بے چینی کی وجہ سے بالآخر پہاڑوں میں جاکر اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے۔ اس قدر تفصیل سے مقصود یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو بھی اس مقدّس ذمہ داری کے لیے مبعوث فرمایا تو وہ کوئی اتفاقی اور اندھی قسم کی تقسیم کے طور پر نہیں ہوتا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو یہ منصب سپرد فرماتے ہیں تو اس میں اول ہی سے ذہنی وروحانی قوتیں، قابلیتیں اور وہ خصوصیات وامتیاز اور وہ اعلیٰ درجہ جوہر بھی ودیعت فرماتے تھے جو اس عظیم ومقدّس فریضہ اور منصب کے لیے لازمی ہوتا ہے اور اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ ان کی پرورش وتربیت کرتے تھے اور حفاظت فرماتے تھے اور ان کو خاص حفاظت ونگرانی میں رکھتے تھے۔ اس کے متعلق قرآن مجید کی چند اور آیتیں بھی پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے متعلق ارشاد ہے:

وَلَقَدْ اٰتَیْنَآ اِبْرٰھِیْمَ رُشْدَہٗ مِنْ قَبْلُ وَ کُنَّا بِہٖ عٰلِمِیْنَ ﴿۵۱﴾

”اور یقیناً ہم نے ابراہیم (عَلَیْہِ السَّلَام) کو پہلے ہی سے اس کی سلامت روی عطا فرمائی تھی اور ہم ان (کی اعلیٰ صلاحیتوں) کو پہلے ہی سے خوب جانتے تھے۔“ (انبیاء:۵۱)

اور حضرت یحییٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے متعلق ارشاد ہے:

وَ اٰتَیْنٰہُ الْحُکْمَ صَبِیًّا ﴿۱۲﴾ وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَکٰوۃً ؕ وَ کَانَ تَقِیًّا ﴿۱۳﴾ وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَیْہِ وَ لَمْ یَکُنْ جَبَّارًا عَصِیًّا ﴿۱۴﴾

”اور ہم نے اس کو بچپن ہی سے قوتِ فیصلہ (اور علم وفضیلت) سے نوازا اور اپنی طرف سے نرم دلی (یعنی شفقت اور مخلوق پر رحم کرنے کی دولت) اور نفس کی پاکیزگی سے نوازا اور وہ بڑے پرہیز گار اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے والے تھے اور وہ جبار ونافرمان نہ تھے۔“ (مریم:۱۲-۱۴)

اور حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اصْطَنَعْتُکَ لِنَفْسِیْ ﴿۴۱﴾

”اور میں نے تم کو خاص اپنے (وحی ورسالت کے) لیے بنایا (اور تیار کیا)۔“ (طٰہٰ:۴۱)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یوں بھی فرمایا گیا ہے:

وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

”اور میں نے تم پر (اے موسیٰ) اپنی طرف سے محبت ڈال دی (تاکہ لوگ تمہارے ساتھ محبت رکھیں اور تم پر مہربانی کریں) اور اس لیے کہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔“ (طٰہٰ:۳۹)

اس طرح حضرت اسمٰعیل، حضرت یوسفاور حضرت عیسیٰ وغیرہ انبیا علیہم السلام کی زندگیوں اور سیرتوں کو اگر دیکھا جائے (جن میں سے بعض کا ذکر قرآن مجید میں بھی آیا ہے) تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو یہ عظیم اور مقدّس منصب حوالے کر دیتے ہیں تو اس میں پہلے ہی سے اس کی قابلیت واہلیت رکھ دیتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس کی تربیت وپرورش کا خاص انتظام فرماتے ہیں، یہی ربانی اور فطری خصوصیات اور صلاحیتیں جب آگے بڑھتی ہیں اور پیغمبرانہ ریاضات فکر ومراتب وغیرہ کے ذریعے اپنی قوت کمال پر پہنچ کر پوری طرح رونما ہو جاتی ہیں تو ان نفوسِ قدسیّہ میں اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی اور اللہ تعالیٰ کی وحی قبول کرنے کی استعداد وقوت پیدا ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنی وحی اور اپنے خاص علم کا دروازہ کھول دیتے ہیں، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا

”اور جب یوسف اپنی پوری جوانی کو پہنچ گئے تو ہم نے اسے حکمت اور علم (وحی اور نبوت) عطا فرمایا۔“ (یوسف:۲۲)

اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسْتَوٰٓى اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ

”اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی پوری جوانی کو پہنچ گئے اور (ان کی جسمانی وعقلی صلاحیتوں کی نشو نما مکمل ہو کر نبوت کے لیے درست ہوئے) تو ہم نے اسے حکمت اور علم سے نوازا۔“ (قصص:۱۴)

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر راہِ ہدایت پر ثابت قدم رہتے ہیں اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان پر درجہ بدرجہ ہدایت کے مزید راستے کھولیں گے اور جوں جوں وہ اس نیک نیتی اور اعمالِ صالحہ میں ترقی کرے گا اس کو موجودہ مقام قُرب ومعرفت سے ارفع مقام پر فائز کر دیا جائے گا اور روز بروز، بلکہ ہر آن ہدایت میں ترقی کر کے بڑھتا جائے گا اور اس کے اطمینان وسکون،

معرفت اور انکشافات اور جنت کے درجات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہر انسان پر خواہ وہ نبی ہو یا اس کا ادنیٰ امتی ہو اس پر یہ واجب کر دیا کہ وہ ہر نماز میں سورت فاتحہ کا تکرار کریں اور سورتِ فاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے اسی راہِ ہدایت پر استقامت سے چلنے اور مزید بڑھنے کی توفیق مانگتا رہے۔ غرض اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کو قبول کرنا اور اس پر استقامت کے ساتھ چلنا جس طرح انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابیوں کا ذریعہ ہے، اسی طرح اس ہدایت کو جو شخص ٹھکراتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عظیم معنوی قوتوں اور صلاحیتوں کو غلط استعمال کر کے ضائع کر دیتا ہے تو ایسا شخص مقامِ انسانیت اور شرافت سے گر کر اسفل السافلین کے گڑھوں میں گر جاتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنی دنیا و آخرت اور ابدی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تباہی و بربادی سے بچائے اور اپنی من مانی زندگی گزارنے کے بجائے ہماری زندگی کو اپنی ہدایت اور اپنے نبی اور رسول سیدنا و مولانا محمد الرسول اللہ ﷺ کے راستے پر ڈال دے اور دنیا و آخرت کی کامیابیاں نصیب فرمائے۔ اللہ تعالیٰ کی یہی وہ ہدایت اور وحی ہے جو انسان و جنات کے لیے خاص ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہر ایک شخص کو پہنچتی ہے اور یہی دو گروہ جن و انس اسی ہدایت اور وحی کے قبول کرنے کے مکلّف ہیں، لہٰذا جو کوئی اس کو قبول کر کے اپنے افکار و اعمال اور اپنی زندگی کو اس کے مطابق بناتا ہے تو وہ امن و اطمینان اور روحانی ترقیوں کی راہیں اپنے اوپر کھول دیتا ہے اور دنیا و آخرت کی کامیابی کو پالیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہی وہ ہدایت ہے جس کے مدارج بے شمار اور بے نہایت ہیں، کوئی بھی انسان ایمان و اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے جس قدر بھی اس راہِ ہدایت پر بڑھتا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں جتنی بھی ترقی کرتا رہے گا اس کے لیے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے اور ترقی کے راستے اور میدان کھلے رہیں گے، جن کی کوئی حد و انتہا نہیں، اسی حقیقت کو قرآن مجید میں یوں بیان فرمایا کہ:

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ

”اور جو لوگ (راہ) ہدایت پر چلتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی (نورِ) ہدایت میں اور ترقی عطا فرماتے ہیں۔“

(مریم:۷۶)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى

”اور وہ لوگ جنہوں نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔“ (محمد:۱۷)

اور کسی جگہ اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے کہ:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط

"اور وہ لوگ جنہوں نے ہمارے راستے میں کوشش کی تو ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستہ کی ہدایت دیں گے۔" (عنکبوت:۶۹)

منصبِ نبوت وہبی ہے کسبی نہیں

جو چیز اور کمال محنت و تلاش اور جدوجہد سے ملتی ہے اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کسبی ہے اور ہر وہ چیز جو بغیر کسی محنت تلاش اور جدوجہد کے ملتی ہے اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہبی ہے۔

دنیا میں جو چیز اور جو کمال بھی ملتا ہے اللہ تعالیٰ کی عطا اور حکم سے ملتا ہے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں اور کمالات ملتے ہیں ان میں سے کچھ چیزیں اور کمالات ایسے ہیں جو انسان کی محنت، کسب واکتساب اور عملی شوق کے ذریعے حاصل ہو جاتے ہیں مثلاً کوئی خاص علم و فن اور ہنر سیکھنا، امتحان دے کر کوئی ڈگری حاصل کرنا، کھیتی کے ذریعہ غلہ حاصل کرنا وغیرہ تو ایسی چیزیں اور فنون وغیرہ جن کے حاصل کرنے میں انسان کی محنت و تلاش اور اس کی جدوجہد کا دخل ہوتا ہے ان کو "کسبی" کہا جاتا ہے۔

جب کہ بعض چیزیں اور کمالات ایسے ہیں جن کے حصول میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا وہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا سے براہِ راست ملتے ہیں مثلاً انسان کا انسان ہونا اور انسان کی پیدائشی خوبصورتی، فطری ذہانت وغیرہ تو اس قسم کی چیزیں جو انسان کو بغیر کسی محنت و تلاش وغیرہ کے ملتی ہیں ان کو "وہبی" کہا جاتا ہے۔ نبوت اس دوسری قسم کی چیز ہے، اس کا حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں، کوئی خواہ کتنی ہی محنت و کوشش کرے اور ریاضات ومجاہدات کرے، خواہ وہ کتنی ہی روحانی ترقی کر لے اور کتنے ہی کمالات حاصل کر لے، پھر بھی وہ اپنی کوشش و تلاش سے اس عظیم مقام پر فائز نہیں ہو سکتا اور نہ کسی مخلوق اور انسان کو اس مقام کا انتخاب سپرد کیا جاتا ہے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ایک عظیم منصب و ذمہ داری ہے جو محض اللہ تعالیٰ کے انتخاب سے ملتی ہے جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ ۚ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٧٣﴾ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾

"اے نبی! ان سے کہو کہ فضل (و بخشش) تو اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے وہ بڑی ہی

وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت (اور وحی و نبوت) کے لیے چن لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہی بہت بڑا فضل والا ہے۔" (آل عمران:۳-۷۳-۷۴)

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد جگہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ نبوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ایک منصب اور فضلِ عظیم ہے اور یہ صرف اسی کو ملتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی منتخب فرمالے، مذکورہ آیت میں وَاسِعٌ عَلِيمٌ سے یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عظیم اور مقدّس منصب ہر کس وناکس کو نہیں ملتا، بلکہ وہ اپنے وسیع اور بے نہایت علم سے ہر انسان کے ظاہر و باطن، ماضی و حال اور مستقبل سے اچھی طرح واقف ہے اور وہی جانتا ہے کہ وہ کون ہو سکتا ہے جو اس عظیم بارِ امانت کے اٹھانے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس حقیقت کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اَللّٰهُ اَعۡلَمُ حَيۡثُ يَجۡعَلُ رِسٰلَتَهٗ

"اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت اور پیغمبری کہاں رکھے (اور اپنی رسالت کس کے حوالے کرے)۔"

(انعام:۱۲۴)

جس کا مطلب یہ ہے کہ خالقِ کائنات اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ اس نے نبوت و رسالت کی خصوصیات اور امتیازات کس میں رکھی ہیں اور وہی حکیم و علیم ذات ہے جو اس بات کو خوب جانتا ہے کہ اس عظیم منصب اور ذمہ داری اٹھانے کا اہل کون ہے۔

انبیا علیہم السلام کی نبوت سے پہلے ریاضت کی وجہ

یاد رہے کہ نبوت سے قبل انبیا علیہم السلام جو ریاضات اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرصہ تک مادی دنیا کی آسائشوں سے یکسر الگ رہ کر غارِ حرا میں عزلت اور خلوت اختیار کی اور ایک زمانہ عبادات اور مراقبہ وغیرہ میں بسر کیا۔

یہ اس لیے نہیں کہ وہ نبوت اور رسول بننے کے امیدوار تھے یا اس کی تلاش میں تھے کہ ان کو نبوت ملے، بلکہ انبیا علیہم السلام کی نبوت سے قبل عبادت و ریاضت مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا روزہ کی حالت میں کوہِ طور پر رہنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روزہ رکھ کر سنسان جنگل میں عرصہ تک رہنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تنہائی کی رغبت ہونا اور غارِ حرا میں تنہا قیام کرنا، فکر، مراقبہ اور عبادت و ریاضت۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخمِ نبوت کی خاص تربیت اور پرورش کے لیے تھا۔ یہ نُفوسِ قدسیہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی فطری صلاحیتوں اور پاک وصاف

فطرت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی محبت اور طلبِ حق میں بے چین ہو جاتے تھے اور فطرۃً ان کاموں اور ان ریاضات وعبادات کو اختیار کر لیتے تھے جو قبولِ وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں متعدد جگہ بیان فرمایا۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَا كُنتَ تَرْجُوٓا أَن يُلْقَىٰٓ إِلَيْكَ ٱلْكِتَٰبُ إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ

”اور آپ کو اس بات کی کوئی امید نہ تھی کہ آپ پر یہ کتاب (قرآن مجید) نازل کی جائے گی (اور نہ آپ کو اس منصب کا انتظار تھا اور نہ کوئی خواہش تھی) مگر (یہ تو) محض تمہارے رب کی مہربانی (سے تم پر نازل کی گئی ہے)۔“
(قصص:۸٦)

باب..... انبیا علیہم السلام کی معصومیت یعنی گناہ سے پاک ہونا

انبیا علیہم السلام ہر قسم کے گناہ سے معصوم اور محفوظ ہوتے ہیں

چونکہ نبی اور رسول کو اپنی امت کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضیات کا نمونہ اور لوگوں کا مقتدا و پیشوا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اس لیے ان میں جو بشری قوتیں رکھی جاتی ہیں وہ فطرۃً اس قدر شائستہ اور مہذّب رکھی جاتی ہیں اور ان کا جوہر فطرت اول سے ایسا پاکیزہ اور منوّر بنایا جاتا ہے کہ ان میں کسی گناہ و نافرمانی کی طرف ادنیٰ سا میلان بھی نہیں رہتا جیسا کہ کسی سلیم الطبع انسان کو نجاست اور گندگی سے طبعی نفرت ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کو ہر قسم کی معصیت و گناہ سے طبعی نفرت ہوتی ہے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں وہ طبعی راحت محسوس ہوتی ہے جو مچھلی کو پانی میں، اس لیے وہ اپنے قصد و ارادوں سے کسی ادنیٰ سی معصیت و گناہ کا تصور بھی نہیں لا سکتے، پھر پیدائش کے وقت سے اللہ تعالیٰ کی خاص نگرانی میں ان کی پرورش و تربیت کی جاتی ہے اور ان کی عزت و آبرو کو مجروح کرنے والی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز سے بھی ان کی حفاظت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ نبوت سے پہلے بھی اخلاقی عیوب، گمراہیوں اور ہر قسم کے چھوٹے بڑے گناہ سے محفوظ و معصوم رہتے ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام کا ذکر فرما کر ان کے متعلق فرماتے ہیں:

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ

”ان میں سے ہر ایک صالحین میں سے تھا۔“

جیسا کہ اس کا بیان پہلے بھی گزر چکا ہے۔

انبیا علیہم السلام غلطی دیکھ کر اس پر سکوت کرنے کی قدرت نہیں رکھتے

ان کی معصومانہ فطرت تو اس قدر بلند اور پاکیزہ ہوتی ہے کہ منصبِ نبوت ملنے کے بعد اگر دوسرے شخص کا ایک قدم بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف اٹھتا ہوا دیکھتے ہیں تو اس پر خاموش رہنے کی قدرت نہیں رکھتے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ دانستہ طور پر کسی گناہ اور نافرمانی کا تصور بھی کر سکیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا معاملہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ اس واقعہ میں غور کرنے والوں کے لیے بہت کچھ موجود ہے تاہم اس معاملے میں لوگوں کو ایک تعلیم یہ بھی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا تصور کیسے کرے گا وہ تو کسی دوسرے کو بھی اگر اللہ تعالیٰ کی شریعت سے ذرہ برابر ہٹتا ہوا دیکھتا ہے تو اس پر بھی وہ سکوت کی قدرت نہیں

رکھتا۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کے کچھ حالات بتلائے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک فرمانبردار بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے خود یہ بھی ان کو بتلایا تھا کہ میں نے اس بندے کو اپنی طرف سے ایک خاص (یعنی تکوینی اسرار ورموز کا کچھ) علم دے دیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس علم کے حصول کے لیے سفر کر کے ان کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے کہا کہ:

قَالَ لَهُ مُوسَىٰ هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

"موسیٰ نے ان سے کہا کہ میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ جو مفید علم آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ مجھے سکھا دیں۔" (کہف:٦٦)

تو انہوں نے جواب میں کہہ دیا کہ:

قَالَ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿٦٧﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

"انہوں نے کہا (اے موسیٰ!) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور جو بات تمہارے دائرۂ واقفیت سے باہر ہے اس پر آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں۔" (کہف:٦٧۔٦٨)

حضرت خضر علیہ السلام کے جواب سے صاف طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مقامِ نبوت کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ کوئی نبی بھی اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ شریعت کے خلاف کوئی کام دیکھ لے پھر بھی وہ اس پر خاموشی اختیار کر سکے۔ حضرت خضر علیہ السلام کو یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تکوینی اسرار ورموز مجھ پر کھول دیے گئے ہیں اور جس چیز پر مجھے مامور کیا گیا ہے اس کے بعض جزئیات بظاہر شریعت کے خلاف معلوم ہوں گے، تو اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر کیسے صبر کر سکیں گے، اس بات کی طرف انہوں نے اشارہ بھی کر دیا کہ میرے ساتھ چلنے میں ضرور ایسے مواقع پیش ہوں گے جن پر آپ اعتراض کیے بغیر نہیں رہ سکیں گے اور اس کی وجہ بھی بتلائی کہ:

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ﴿٦٨﴾

"آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو خبر نہ ہو۔" (کہف:٦٨)

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ کا یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے علم و رُشد پر چلنے والا ہے اور اس کو یہ اطمینان تھا کہ ان کا کوئی بھی کام شریعت کے خلاف نہیں اگرچہ ظاہر میں سمجھ میں نہ آئے اس لیے انہوں

نے کہا:

قَالَ سَتَجِدُنِيٓ إِن شَآءَ ٱللَّهُ صَابِرٗا وَلَآ أَعۡصِي لَكَ أَمۡرٗا ﴿٦٩﴾

"(موسیٰ علیہ السلام نے) کہا ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے اور میں آپ کے حکم کے خلاف نہیں کروں گا۔" (کہف:۶۹)

لیکن اس کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے تکوینی رازوں کے مظاہرے کو برداشت نہ کر سکے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ پورا کر کے ہر بار حضرت خضر علیہ السلام کے فعل پر نقطہ چینی کی اور آخر کار جدائی کی نوبت آ گئی۔ جب دوسروں کی غلطی پر سکوت کرنا ان کے لیے ناممکن ہے تو ایسی ہستیوں سے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دانستہ طور پر اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی کریں۔ یہ ایک واقعہ دنیا کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول کسی ایسے شخص (جس کے متعلق یہ یقین ہو کہ یہ بندہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چلتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا) سے ایسا کام دیکھ لیں جو بظاہر شریعت اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف معلوم ہو رہا ہو تو بھی وہ صرف اس ظاہری خلاف ورزی پر سکوت کی قدرت نہیں رکھتے تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کی غلطی کو دیکھ کر خاموش رہ سکیں۔

انبیا علیہم السلام سے بھول چوک ہو سکتی ہے لیکن وحی الٰہی اس کی اصلاح کرتی ہے

البتہ انسانیت سے متصف ہونے کی بنا پر کبھی کبھار سہو و نسیان، بھول چوک اور خلاف اولیٰ کام یا اجتہادی لغزش ان سے بھی سرزد ہو سکتی ہے مگر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی وحی کے ذریعے فوراً اس کی اصلاح فرماتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نبی فوراً اس سے کنارہ کش ہو کر اس کا وہ بھی اعلان فرماتا ہے تاکہ کوئی ان کی اس لغزش کو بھی وحی الٰہی نہ سمجھے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے نبی و رسول کا ہر ایک ارادہ ہر ایک عمل اور ہر ایک قول و فعل اور ہر ایک حرکت و سکوت امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی مرضیات کا بہترین نمونہ بن جاتی ہے۔

بعض انبیا علیہم السلام پر عتاب کیوں ہوا؟

لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں بعض ایسے واقعات اور الفاظ موجود ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی گناہ صادر ہو چکے ہیں، بلکہ بعض دفعہ ان پر عتاب بھی ہوا ہے مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا تھا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے قبل زندگی کی یاد دہانی کرا کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى

"اور آپ کو ضال پایا تو ہدایت دی"۔(الضحیٰ:۷)

اگر انبیا علیہم السلام چھوٹے بڑے گناہ سے زندگی کے تمام ادوار میں محفوظ اور پاک تھے تو پھر اس قسم کے واقعات اور قرآن مجید کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان برگزیدہ ہستیوں سے کبھی کبھار کسی خطا، بھول چوک یا غلط فہمی کی وجہ سے کوئی ایسا کام تو صادر ہو سکتا ہے جس کو ایک لغزش یا اجتہادی خطا کہا جا سکے لیکن اس کو اصطلاح میں گناہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اصطلاح میں گناہ و جرم اس کو کہتے ہیں جس میں انسان کی نیت اور سرکشی کا دخل بھی ہو حالانکہ کسی پیغمبر کے بارے میں یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے خلاف عمل کیا ہو، بلکہ وہ تو اپنے ارادہ میں اللہ تعالیٰ کی حکم عدولی کا تصور بھی نہیں لا سکتے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گزر چکا ہے، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کی خطا و لغزش کو لے لیتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں جس قدر اہمیت ان کی لغزش کو دی گئی ہے پیغمبروں میں سے کسی کی لغزش کو اس قدر اہمیت نہیں دی گئی ہے، چنانچہ ان کی یہی لغزش جنت سے دوری کا باعث بنی اور ایسی لغزش کی وجہ سے قرآن مجید نے ان کے متعلق عصیان کے لفظ کو ایسی صراحت سے استعمال کیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسرے نبی کے لیے ایسا لفظ استعمال نہیں کیا گیا مگر حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق خود قرآن مجید کی جو تفصیلات ہیں، ان کے مجموعے پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ اقدام صرف ایک لغزش کی حد تک تھا جس کو اصطلاح میں گناہ نہیں کہا جا سکتا۔

ان سے متعلق چند آیاتِ کریمہ پڑھ لیجیے:

۱.... وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۳۵﴾

"اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو خوب کھاؤ (پیو) مگر (دیکھو) وہ درخت اس کے قریب بھی نہ جاؤ ورنہ تم (اپنے اوپر) ظلم کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے پھر (ایسا ہوا کہ) شیطان نے (دھوکہ دے کر) اسی درخت کے باعث ان کو پھسلا دیا (یعنی ان سے لغزش کرا دی) اور ان دونوں کو اس مقام سے نکلوا دیا جہاں وہ (عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کر رہے) تھے۔" (البقرہ:۳۵)

۲.... وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَ

وَقَاسَمَهُمَا إِنِّي لَكُمَا لَمِنَ النَّصِحِينَ ﴿٢١﴾

"شیطان نے ان سے کہدیا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت (کو کھانے) سے صرف اس لیے منع کیا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فرشتے بن جاؤ یا (اس جنت میں) تمہیں دائمی زندگی حاصل ہو جائے پھر ان دونوں سے قسمیں کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں تو (شیطان نے اس طرح کی باتیں سنا کر اور قسمیں کھا کر بالآخر) فریب دے کر ان کو (درخت کھانے کی طرف) مائل کیا۔" (اعراف:٢٠-٢١)

٣....فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَنُ قَالَ يَـٰٓادَمُ هَلْ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَىٰ ﴿١٢٠﴾

"شیطان نے آدم کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا اے آدم! کیا میں تم کو ایسا درخت نہ بتاؤں جو صدا زندہ رہنے اور لازوال بادشاہت کا سبب ہو۔ (یعنی جنت میں ہمیشہ زندہ رہنے اور ہمیشہ کے لیے جنت کا عیش وآرام اور بادشاہت کا سبب بن جائے)۔" (طٰہٰ:١٢٠)

٤.... وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ ءَادَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُۥ عَزْمًا ﴿١١٥﴾

"اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا تھا (یعنی کہ وہ اس درخت کے پاس نہ پھٹکے لیکن) سو وہ بھول گئے اور ہم نے (نافرمانی کا) ان میں عزم نہیں پایا۔" (طٰہٰ:١١٥)

قرآن مجید کی ان آیات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی حوا کو اجازت تھی کہ وہ جنت میں رہیں اور اس کی ہر ایک چیز سے فائدہ اٹھائیں، مگر ایک درخت کو معین کر کے بتایا گیا کہ اس کو نہ کھائیں، بلکہ اس کے قریب بھی نہ جائیں، شیطان نے اپنا اصلی روپ بدل کر مشفق اور خیر خواہ دوست کے لباس میں ان کو فریب دینا شروع کر دیا، ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور ان سے کہدیا کہ اس درخت کا کھانا قُربِ الٰہی، جنت میں دائمی زندگی، دارالرضوان اور جنت کی لازوال بادشاہت کا ضامن ہے اور تم کو جو اس درخت سے تمہارے پروردگار نے منع فرمایا ہے تو صرف اس لیے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی کو حاصل کر سکو۔ یہ سن کر حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم کی نوعیت کو بھول گئے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حکم دیا تھا اور اس کے متعلق کیسی تاکید فرمائی تھی وغیرہ جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا: فَنَسِيَ پس آدم بھول گئے۔ پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس ممنوعہ درخت سے اس لیے نہیں کھالیا تھا کہ کہیں ان کو فرشتہ بننے کا شوق تھا کیونکہ فرشتوں کا مقام تو وہ پہلے ہی سے معلوم کر چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ میں گرا کر فرشتوں پر ان کی افضلیت و شرافت کو ثابت

کر دیا تھا اور ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ فرشتے نہ کھاتے ہیں اور نہ پیتے ہیں اور نہ اپنے موجودہ مقام سے ترقی کر سکتے ہیں اور ایک کامل انسان کو جو مسرت اور ترقیات نصیب ہو سکتی ہیں ان سے فرشتے آشنا نہیں البتہ چونکہ ان کو یہ معلوم تھا کہ فرشتے سدا زندہ رہتے ہیں اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں اللہ تعالیٰ کے قرب اور اللہ تعالیٰ کی جنت و دار الرضوان میں صرف فرشتوں کی طرح دائمی زندگی کا شوق پیدا ہوا جس طرح ہر انسان کسی انتہائی کامیابی کے تصور میں پڑ کر دوسری جانب سے غافل ہو جاتا ہے یہاں بھی وہی صورت پیش آئی اور حضرت آدم علیہ السلام کو قُربِ الٰہی کی تمناؤں، شیطان کے بھیس بدلنے اور دوستی و خیر خواہی ظاہر کر کے اس کی قسموں کے سامنے یہ خیال بھی نہ رہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے کس نوعیت کا حکم دیا تھا بس اس فریب میں آ کر پوری فراموشی کے عالم میں انہوں نے وہ درخت چکھ لیا جس سے ان کو منع کیا گیا تھا۔

حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کے لئے غوىٰ کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟

حضرت آدم علیہ السلام کی اس خلاف ورزی (جو آپ کے سامنے آگئی) کے متعلق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى

"اور آدم اپنے رب کے کہنے پر نہ چلے تو وہ (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہو گئے۔" (طٰہٰ:۱۲۱)

غَوٰی عربی زبان میں گمراہ ہونے، ناکام ہونے، محروم ہونے، غافل ہونے اور زندگی تلخ ہو جانے وغیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو یہاں بھی مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں جنت کی زندگی سے محروم ہو گئے یا حضرت آدم علیہ السلام دائمی زندگی کے حصول میں ناکام ہوئے یا ان کی عیش و آرام کی زندگی تلخ ہو گئی سب کا مطلب قریب قریب ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی؟

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی بھول چوک کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق عَصٰٓى اٰدَمُ "آدم نے نافرمانی کی" کے الفاظ کیوں کہے گئے، پھر ان پر اس قدر سخت عتاب کیوں ہوا؟ کہ ان کو دنیا میں جنت سے محروم کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ انسانی بھول چوک غیر اختیاری چیز ہے اس لیے اس کو گناہ میں شمار نہیں کیا جاتا، لیکن اس سے تو انکار کی گنجائش نہیں کہ اگر کسی معاملہ میں پوری احتیاط سے کام لیا جائے تو بھول چوک اور خطا سے انسان بچ سکتا ہے، ہم اپنی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ جس چیز کو

بہت اہم سمجھتے ہیں اس کے متعلق ہمیں بہت کم بھول چوک لاحق ہوتی ہے اور اگر کسی اہم معاملہ میں کسی سے بھول چوک وخطا ہو جائے تو انسانی زندگی میں بھی اس پر اسی نسبت سے ملامت کی جاتی ہے، پھر انبیا علیہم السلام کا مقام تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت بلند ہے ان سے تو یہی کہا جائے گا کہ تم نے پوری احتیاط سے کیوں کام نہ لیا جس کے ذریعے بھول چوک اور خطا سے بچ سکتے تھے اور اس پر گرفت بھی فرماتے ہیں کیونکہ بڑوں سے معمولی غلطی بھی ہو جائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نبی ورسول اگر بہترین کام کو چھوڑ کر بہتر پر عمل کرتے ہیں تو بھی وحی سے اس پر تنبیہ کی جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے نبی اگر کسی معاملے کی دو بہتر صورتوں میں سے بہترین صورت کو چھوڑ کر بہتر صورت کو اختیار کر لیتے ہیں تو بھی اللہ تعالیٰ وحی سے ان کو تنبیہ کرتے ہیں، مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معاملہ کو لے لیتے ہیں جو حضرت عبد اللہ ابن امّ مکتوم رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں قریش کے چند بڑے بڑے سردار ابو جہل، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ وغیرہ بیٹھے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام قبول کر لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک نابینا صحابی حضرت عبد اللہ ابن امّ مکتوم رضی اللہ عنہ آئے۔ وہ نابینا ہونے کی وجہ سے مجلس کی نوعیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکے اور آواز دینا شروع کی اور اسلام کے متعلق کچھ دریافت کرنے لگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بے وقت مداخلت ناگوار گزری، چہرہ انور پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے اور ان کو جواب نہ دے کر اپنے کلام کو جاری رکھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیتیں نازل ہوئیں:

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ﴿١﴾ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ﴿٢﴾ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ﴿٣﴾ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ﴿٤﴾ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ﴿٥﴾ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ﴿٦﴾ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ﴿٧﴾ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿١٠﴾ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ﴿١١﴾ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ﴿١٢﴾

”چیں بجبیں ہوئے اور بے رخی برتی اس بات پر کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ (نابینا پوری طرح) سنور جائے یا وہ نصیحت کو قبول کرلے تو نصیحت کرنا اس کے لیے نافع ہو، رہا وہ جو (دین کی) پروا نہیں کرتا آپ اس کی فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ اگر وہ نہ سدھرے تو آپ پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) اس کا کوئی الزام نہیں (کہ آپ نے اس کو کیوں مسلمان نہیں بنایا) اور جو شخص خود آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑا آتا ہے اور وہ

ڈرتا (بھی) ہے تو آپ اس سے بے رخی برتتے ہیں (ایسا) ہرگز نہیں (ہونا چاہیے) یہ (قرآن مجید) تو ایک نصیحت ہے پس جس کا جی چاہے قبول کرلے (اور جو قبول نہ کرے وہ جانے اس کا وبال اسی پر ہوگا آپ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں)۔" (عبس:۱-۱۲)

اب اس معاملہ میں ذرا غور کیجیے! کہ آپ ﷺ کا حضرت ابن امّ مکتوم رضی اللہ عنہ کی بے جا مداخلت اور دریافت پر ناگواری اور ان سے بے رخی کرنا کونسی بے رخی سمجھی جاتی ہے، بلکہ اگر بظاہر دیکھا جائے تو جو رویہ آپ ﷺ نے اختیار فرمایا تھا وہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ آپ ﷺ کے پاس اس وقت جو لوگ حاضر تھے وہ قریش کے بڑے بڑے سردار اور بااثر لوگ تھے۔ ان کے متعلق یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ اگر ان کی دل جوئی کی جائے اور وہ بغیر کسی مداخلت کے پوری یکسوئی اور غور کے ساتھ بات سن لیں تو شاید اسلام قبول کرلیں اور اگر ان لوگوں کو ہدایت مل گئی تو ان کی وجہ سے اور لوگ ہدایت پر آسکیں گے جس کے بعد مکہ مکرمہ میں کام کرنا آسان ہو جائے گا اور اسلام کی اشاعت میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے گی اور ایسی حالت میں جب کہ آپ ﷺ ان کے سمجھانے میں مشغول ہیں حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا آداب مجلس کی رعایت کیے بغیر ایک نئی بات شروع کر دینا اور آپ ﷺ کے سلسلۂ کلام کو کاٹ دینا پھر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا جبکہ وہ آپ ﷺ کے برادر نسبتی بھی تھے کیونکہ وہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پھوپھی زاد بھائی تھے پھر وہ ایسے قریبی رہنے والے شخص تھے کہ ہر وقت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوسکتے تھے اور ان کو سمجھانے اور تعلیم حاصل کرنے کے بہت مواقع حاصل تھے وہ دوسرے اوقات میں بھی تو سوال کرکے اپنے مسائل حل کرواسکتے تھے۔

بخلاف ان سرداروں کے کہ وہ نہ تو ہر وقت آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تھے اور نہ ان کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا کلام پہنچایا جاسکتا تھا، پھر صورت حال کچھ یوں نظر آرہی تھی کہ وہ تکبر اور اپنی خود پسندی میں مبتلا ہونے کے باوجود کچھ بات سن رہے تھے جس سے ان کے ایمان لانے کی توقع کی جاسکتی تھی اور ان میں اسلام سے متاثر ہونے کے کچھ امکانات نظر آرہے تھے اور آپ ﷺ انسانوں پر بہت رحم وشفقت کرنے والے تھے، آپ ﷺ کی نگاہ اس پر تھی کہ کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی ہدایت سے محروم ہوکر نہ چلا جائے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ اگر ایسے مغرور اور خود پسند لوگوں کی طرف التفات نہ کیا جائے تو وہ سدھرنے کے بجائے مزید بگڑ جاتے ہیں اور ان کا بگڑنا صرف ان کی حد تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ ان تمام لوگوں پر اثر انداز ہوسکتا ہے جو ان سرداروں کے ماتحت ہوں۔ ان پورے مجموعی حالات کو سامنے رکھ کر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ سے بے رخی برتنا اور اپنا سلسلۂ کلام

برابر جاری رکھ کر حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے سوال کا جواب نہ دینا صرف معاملہ کی نوعیت کی وجہ سے ہی بظاہر ایک بہتر اور اچھا کام نہیں، بلکہ اس لیے بھی مناسب تھا کہ ان کو کچھ تنبیہ ہو جائے تاکہ آئندہ آدابِ مجلس کی رعایت کریں، لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ علیم و حکیم ذات ہیں، اس کی وحی نے اس پر تنبیہ فرمائی اور بہترین صورت کی طرف رہنمائی کی، چنانچہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے حق میں اعمیٰ (نابینا) کے لفظ سے پہلے تو ان کی طرف سے بے جا مداخلت کی معذرت بیان کی گئی کہ وہ نابینا ہیں اس لیے مجلس کی پوری صورتِ حال کو نہ جان سکے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں مذکورہ بالا آیتوں میں اس کے بجائے ایک بہترین طریقہ بتلایا جس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام کی طرف دعوت تو سب کو دینی چاہیے لیکن آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جو طالبِ حق ہوں یا جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہے خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، درست ہوں یا معذور سب کے سب برابر ہیں اور جو لوگ دینِ حق سے بے پروا ہیں اور اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہیں کہ دینِ اسلام کو ان کی ضرورت ہے اور ان کو اسلام کی کوئی ضرورت نہیں تو اسلام کو ایسے لوگوں کی کوئی ضرورت نہیں، قرآن و اسلام کی تعلیمات تو حق اور سراسر خیر ہیں، اس کی دعوتِ عام ہے جس کا جی چاہے قبول کر لے اور اپنی دنیا و آخرت کے فوز و فلاح کا سامان بنائے اور جو چاہے دینِ حق اور سراسر خیر کو ٹھکرائے اور اپنی دنیا و آخرت کو برباد کر دے، آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ یہ مغرور اور خود پسند لوگ آپ کی تعلیم و ہدایت سے کیوں راہِ راست پر نہ آئے، لہٰذا جو لوگ غرور و تکبر کی وجہ سے حق کی پروا نہیں کرتے ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں اور نہ ایسے لاپروا خود پسندوں کو راہِ راست پر لانے کی فکر میں اس قدر مشغول ہوں کہ سچے طالبِ حق اور مخلص ایمان دار لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ و تعلیم سے محروم رہ جائیں۔

اس تفصیل سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ مذکورہ بالا آیتوں میں سخت ملامت ان سردارانِ قریش پر بھی کی گئی ہے جن کا گمان یہ تھا کہ ان کو اسلام کی چنداں ضرورت نہیں، بلکہ اسلام کو ان کی بڑی ضرورت ہے، ان کے مسلمان ہونے سے اسلام کا بول بالا ہو جائے گا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و تکریم میں اضافہ ہو جائے گا، اس لیے جس مجلس میں وہ موجود ہوں تو کسی دوسرے شخص کی طرف توجہ نہیں دینی چاہیے۔ وحی الٰہی نے ان سرداروں کی اس غلط فہمی کو بھی دور کر دیا اور بتلایا کہ قرآن و اسلام ایک نصیحت اور سراسر خیر ہے جو انسان کی ایک بہت بڑی ضرورت ہے، اس سے وہی شخص نوازا جائے گا جس کے دل میں حق کی طلب موجود ہو اور جس شخص کو اپنی جاہ و منصب پر گھمنڈ ہو اور جس کے دل میں حق کی طلب نہ ہو اس کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں،

اسلام ایسے لوگوں سے بے نیاز ہے۔ واللہ اعلم

نبی کی بہت ہی معمولی بات پر گرفت ان کے مقام کا تقاضا ہے

اگر مذکورہ بالا معاملوں پر غور کیا جائے تو قرآن مجید ہی کھل کر یہ حقیقت بتلا دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی اگر کسی معاملہ میں دو بہتر صورتوں میں سے بہترین صورت کو چھوڑ کر بہتر صورت کو اختیار کرلیتا ہے تب بھی اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس پر تنبیہ کر کے ان کو بہترین صورت بتلا دیتے ہیں تا کہ نبی کا ہر قول اور ہر فعل امت کے لیے نمونہ بن کر قابلِ اتباع ہو سکے۔ بہر حال عرض یہ کرنی تھی کہ انبیا علیہم السلام سے اگر عمر بھر میں کوئی معمولی سے معمولی خطا بھی صادر ہو جاتی ہے، بلکہ اگر ان سے کوئی ایسا کام بھی سرزد ہو جاتا ہے جو عام انسانوں کے حق میں ذرہ برابر بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا مگر وہ نبی کے شایانِ شان نہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرماتے ہیں اور کبھی کبھی اس پر گرفت اور عتاب بھی فرماتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ کوئی ایسی غلطی اور گناہ ہوا کرتا ہے جس کو اصطلاح میں جرم یا گناہ کہا جاتا ہے، بلکہ انبیا علیہم السلام کے حق میں ایسی معمولی باتوں پر گرفت کرنا مقامِ نبوت اور عصمت کا تقاضا ہے۔

بسا اوقات ایک ہی چیز کسی ایک کے لیے قابلِ انعام اور کسی دوسرے کے حق میں قابلِ ملامت ہوتی ہے

آپ دیکھتے نہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی کام ایک کے لیے قابلِ گرفت سمجھا جاتا ہے اور دوسرے کے لیے قابلِ انعام اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کام کسی کے حق میں قابلِ تعجُّب سمجھا جاتا ہے اور کسی کے حق میں وہ کچھ بھی قابلِ تعجب نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی تکلیف میں کوئی عام آدمی آپ کے ساتھ کچھ امداد کرتا ہے اگر وہی امداد ایک خاص ساتھی یا بیٹا کر دے تو یہی ایک کام ہے جو خاص دوست اور جگر گوشے کے لیے قابل گرفت اور ایک عام شخص کے لیے قابلِ انعام ہے اسی طرح انبیا علیہم السلام کا نازک مقام اور ان کی پاکیزہ ہستیوں سے عمر بھر میں کوئی ایک لغزش بھی ہو جاتی ہے، بلکہ اگر کسی بہترین طریقے کو چھوڑ کر بہتر طریقے پر بھی کبھی عمل کر لیتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے، بلکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی کام ہمارے لیے قابلِ انعام سمجھا جاتا ہے لیکن وہی کام اگر اللہ تعالیٰ کے مقرّب بندے کرتے ہیں تو وہ ان کے حق میں کمال کے بجائے نقصان سمجھا جائے گا مثلاً جس طرح اور جس اخلاص کے ساتھ ایک عام شخص نماز پڑھتا ہے یا صدقہ و خیرات کرتا ہے تو وہ اس کے لیے قابلِ انعام اور اس کے حق میں کمال سمجھا جاتا ہے لیکن اگر اسی طرح کے اخلاص کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کا مُقرّب بندہ یا اللہ تعالیٰ کا نبی نماز پڑھے یا صدقہ وخیرات دے تو وہ اس کے حق میں کمال کے بجائے نقصان سمجھا جائے گا۔ اسی حقیقت کو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے: حَسَنَاتُ الاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ عام نیک لوگوں کی خوبیاں بسا اوقات مقرّبینِ بارگاہِ الٰہی کے حق میں برائیاں ہوتی ہیں۔ بہر حال خطا ونسیان اگرچہ عام انسانوں کے حق میں قابلِ گرفت نہیں ہوتا اور اس کی وجہ سے انسان عذاب کا مستحق قرار نہیں پاتا لیکن انبیا علیہم السلام کا معاملہ اور ہے ان پر تو خلافِ اولیٰ کام پر بھی عتاب کیا جاتا ہے ان کے غیر ارادی عمل کو بھی دوسروں کے ارادی عمل کے برابر سمجھا جاتا ہے، لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام کا یہ اقدام بھول چوک کی بنا پر اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے کوئی معصیت اور گناہ نہیں تھا، مگر صورت نافرمانی کی تھی اس لیے اس کو معصیت وگناہ سے بھی تعبیر کر لیا گیا اور اس پر عتاب بھی کیا گیا حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بود آدم دیدۂ نور قدیم — موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

یعنی آدم علیہ السلام نور قدیم کی آنکھ تھے اور آنکھ میں اگر بال بھی پڑ جائے تو عظیم پہاڑ کی طرح ناقابل برداشت ہے۔

ہر بندہ کی بندگی میں تقصیر اس کے درجہ کے مطابق ہوتی ہے

مذکورہ بحث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر بندہ کی بندگی میں تقصیر اس کے درجہ کے مطابق ہوتی ہے، کسی شخص کا دامن گناہ اور بھول چوک کے گرد وغبار سے کتنا بھی پاک ہو، تاہم اللہ رب العزت کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف اور اپنی کوتاہیوں پر نادم ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی پر غور کیجیے ان کی صداقت، نیکو کاری اور پاکیزگی کی شہادت سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے، کہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّہٗ کَانَ صِدِّیْقًا نَّبِیًّا (مریم:۵۶) اور کہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلًا (نساء:۱۲۵) لیکن اس کے باوجود خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کی عظمت وجلال اور اس کی رحمت وشفقت کے ذکر میں یوں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ

"اور وہ اللہ جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی (پوری) امید رکھتا ہوں۔" (شعراء:۸۲)

بہر حال بندہ کا عجز وانکساری کرنا اور اپنے آپ کو قصوروار سمجھ کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنا بہت بڑی عبادت اور بندگی ہے۔ لہٰذا ہر انسان پر لازم ہے کہ وہ اپنے قصور کا اعتراف کرتا رہے اور یہ سمجھے کہ جیسا کچھ مجھے کرنا چاہیے تھا

مجھ سے نہ ہو سکا، مُنعِمِ حقیقی نے جو بے شمار احسانات مجھ پر فرمائے ہیں میں ان کا حق شکر ادا نہ کر سکا۔

انبیا علیہم السلام استغفار کیوں کرتے ہیں؟

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ انبیا علیہم السلام کا استغفار اس بنا پر نہیں تھا کہ وہ در حقیقت گناہ وجرائم کے مرتکب ہوا کرتے تھے، بلکہ ان کے اکثر استغفار کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وبے نیازی کا دائمی استحضار ان نفوسِ قُدسیہ کو اپنے نفوس کی براءت اور پاکیزگی کا تصور بھی نہیں کرنے دیتا۔ نیز ان کے درجات میں ہر آن ترقی ہوتی رہتی ہے اور ہر اوپر والے درجے پر پہنچ کر اس سے پہلے اور نچلے درجے کی اطاعت وبندگی ایک قسم کا قصور محسوس ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس کوئی مہمان آئے اور آپ اس کو نہ جانتے ہوئے اس کی خدمت کریں، لیکن دوسرے دن معلوم ہو جائے کہ جس حیثیت کا یہ شخص تھا اس کے مطابق اس کی خدمت نہ ہوئی تو یقیناً آپ کو پہلے دن کی خدمت ایک قسم کی ناقدری معلوم ہو گی اور اب ان کی خدمت کی نوعیت اور اس میں خلوص کی شان اور ہو گی، لیکن اگر پھر تیسرے دن اس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تو پورے عالمِ اسلام کا ایک دین دار اور عادل بادشاہ ہے تو دوسرے دن آپ نے جس نوعیت اور جس خلوص کے ساتھ خدمت کی ہے اس پر آپ کو ایک قسم کی ندامت ہو گی اور آپ اپنی خدمت کو بہت ناقص تصور کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال تو بے نہایت ہے، انسان اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی معرفت میں جتنی بھی ترقی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال کے پیشِ نظر اپنی بندگی کرنے کو قصوروار پاتا ہے چاہے وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا کس قدر ہی فرمانبردار اور پاکیزہ کیوں نہ ہو۔ انسان جب ایک طرف اللہ تعالیٰ کی عظمت وبے نیازی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف اپنی مجسّم بے چارگی اس کے سامنے موجود رہتی ہے تو لاکھ عصمت اور بے گناہی کے باوجود بھی اپنا معاملہ قصور در قصور نظر آتا ہے اور جو شخص طاعات اور اللہ تعالیٰ کی بندگی میں اپنے آپ کو قصوروار نہیں پاتا تو یہ بذاتِ خود بہت بڑا قصور ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس شخص کی اللہ تعالیٰ کی عظمت وبے نیازی پر نظر نہیں ہے، بلکہ اس کی نگاہ اپنی کثرتِ طاعات پر ہے۔ لہٰذا انبیا علیہم السلام کا اپنے قصور کا اعتراف واقرار اور ندامت ان کے نقص وگناہ گار ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ ان کی عبدیت وبندگی کا کمال ہے۔

استغفار ترقی پر ترقی کا ذریعہ ہے

شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ سے مغفرت وبخشش طلب کرنے کی ہدایت فرماتے ہیں مثلاً سورتِ نصر کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

"تو آپ اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی پاکی بیان کیجیے اور اس سے مغفرت طلب کیجیے بلاشبہ وہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔" (نصر:۳)

یہاں اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو انبیا کے استغفار کی حیثیت سامنے آسکتی ہے، کیونکہ یہ تو مسلّمہ واقعہ ہے کہ قرآن مجید کا یہ مذکورہ ارشاد سورۂ فتح کے بعد نازل ہوا ہے اور سورتِ فتح کی ابتداء ہی میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو چند خاص اعزازات سے نوازنے کا اعلان فرمایا ہے، ان میں سے آپ ﷺ کی مغفرتِ عامہ کی شہادت دے کر آپ ﷺ کے دل مبارک کو مطمئن کرنا بھی تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ علیم وخبیر کی طرف سے پھر دوبارہ یہ حکم ملنا کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو، اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ تو اس کے متعلق یہ عرض ہے کہ انبیا علیہم السلام کا اکثر استغفار بھی اس لیے ہوتا ہے تاکہ ان کا یہ استغفار ان کے ترقی یافتہ قدم اور درجہ اور ان کی موجودہ معرفت وبندگی پر قناعت کرنے سے ان کو باز رکھے تو اس میں گویا یہ ایک قسم کی تنبیہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ومعرفت کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ ومقام پر قانع نہ ہوں، بلکہ اپنے کو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی کماحقہ بندگی ومعرفت کے حصول میں قصوروار سمجھ کر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی معرفت کے حصول میں مزید ترقی کے لیے بے چین ہوا کریں اور یہی چیز ان کے لیے ہر آن ترقی پر ترقی کرنے کا بہت بڑا سبب بن جاتی ہے، اس لیے ایک بار پھر سمجھ لیں کہ انبیا علیہم السلام کا اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی کوتاہی اور قصورواری کا اعتراف وندامت ان کی گناہ گاری کا ثبوت نہیں، بلکہ ان کی کامل بندگی کا اظہار ہے، اس طرح اللہ تعالیٰ کا کسی نبی ورسول کے متعلق یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا اور ان کو یہ حکم دینا کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت وبخشش مانگیں ان کی گناہ گاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی محبوبیت وپسندیدگی اور اپنی رضا وقبول تام اور اپنی معرفت کے مزید درجات عطا کرنے کی بشارت ہے۔

انبیا علیہم السلام سے کبھی تکوینی طور پر لغزش کیوں ہوتی ہے؟

باقی رہا یہ سوال کہ انبیا علیہم السلام سے کبھی کبھار تکوینی طور پر کوئی لغزش کیوں ہو جاتی ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی جو بہت مصلحتیں ہوتی ہیں وہ ہمارے غور وفکر کی حدود سے ماوراء ہیں، البتہ جہاں تک اس کے متعلق معلوم ہے اس کو لکھ دیا جاتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کی بھول چوک کی نوعیت آپ کے سامنے ہے، اس کو لے لیتے ہیں کہ:

۱.... یہی بھول چوک ان کی بندگی میں اضافہ کا سبب بن گئی اگرچہ یہ خطا سہواً اور بلاقصد سرزد ہوئی تھی، لیکن آدم

علیہ السلام سراپا ندامت بن کر توبہ کا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے اور ان کی توبہ قبول بھی ہوئی اور ان کو منصبِ خلافت و نبوت سے بھی نوازا گیا مگر پاکیزہ نفس کا حال یہ ہے کہ محشر تک ایسی بھول چوک کی ندامت واثر ان کے دل سے ختم نہ ہو گا، قیامت کے دن ان کی تمام اولاد شفاعت کرانے کے لیے ان کے پاس جمع ہو جائے گی تو وہ اسی بھول چوک کو سامنے رکھ کر عذر کریں گے کہ مجھ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوئی ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کی یہی ایک لغزش ان کے عمر بھر استغفار کرنے کے لیے ایک بہت بڑا سبب بن گئی۔

۲: سوزِ عشق، دردِ فراق، نیاز مندی، آہ وزاری کے بلند ترین اور پاکیزہ جذبات سے حضرت آدم علیہ السلام کے دل کو آشنائی اس بھول چوک کی وجہ سے ہوئی۔

۳.... پھر یہ دیکھ لیجیے! کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر رہنے کے لیے پیدا فرمایا تھا، لیکن کچھ وقت کے لیے جنت میں بسایا، جنت سے نکلنے کا سبب شیطان کا مکر و فریب ٹھہرایا گیا تاکہ حضرت آدم علیہ السلام کے دل میں اور اس کے نتیجے میں رہتی دنیا تک ان کی اولاد کے دلوں میں شیطان کے ساتھ دشمنی کی جڑیں مزید گہری ہو جائیں، نیز اس طرح شیطان کے مکر و فریب اور دھوکہ دہی کا کچھ نقشہ بھی سامنے آگیا کہ شیطان کس طرح کا روپ دھار کر اور کیسے کیسے خوشنما جال پھیلا کر انسان کو معصیت اور گناہ میں مبتلا کر سکتا ہے۔ انسان ایک طرف جب اس کی کھلی اور عظیم دشمنی کو دیکھتا ہے تو بیدار ہو کر پوری احتیاط کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب وہ دوسری طرف اس کے عظیم مکر و فریب اور چال بازی کو دیکھتا ہے تو گڑگڑا کر اپنے پروردگار سے دعا کرتا ہے کہ یا اللہ! تو ہی نفس و شیطان کے مکر و فریب اور اس کی عظیم چال بازی سے ہماری حفاظت فرما۔ اس طرح انسان کے لیے شیطان کی عظیم چال بازی سے خبر گیری اور اس کے ساتھ دشمنی میں اضافے اور آئندہ کے لیے پوری احتیاط اور بیداری کے ساتھ زندگی گزارنے اور پھر اس کی چال بازی اور مکر و فریب سے پناہ مانگنے کا ایک بڑا سبب یہی بھول چوک بن گیا۔

۴.... رضا کا وہ مقام جو محض عجز و انکساری، گریہ، آہ وزاری اور دل کی بے چینی کے بدلے بخشا جاتا ہے وہاں تک رسائی کا سبب یہی لغزش بن گئی۔

۵.... ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے دل کے سوز و گداز نے حضرت آدم علیہ السلام کو زندگی کی حرارت اور تپش بخشی یہاں تک کہ ان کی وہ ساری صلاحیتیں بیدار ہو گئیں جن کا خلافتِ الٰہی اور منصبِ نبوت کے لیے پہلے بیدار ہونا ضروری تھا، شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے وَ عَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی "اور آدم

اپنے رب کے کہنے پر نہ چلا اور (جنت کی زندگی سے) بے راہ ہو گیا۔" (طٰہٰ:۱۲۱) کے متصل یوں فرمایا کہ:

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

"پھر ان کے رب نے انہیں (اپنے قُرب و خلافت کے لیے) چن لیا تو اس پر (اپنی رحمتوں سے) لوٹ آیا اور اسے (اپنی مرضیات اور خوشنودی کی راہوں کی مزید) ہدایت دی"۔ (طٰہٰ:۱۲۲)

انبیا علیہم السلام کی لغزشوں کو قرآن مجید میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ ان لغزشوں کو قرآن مجید میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ تو اس کے متعلق بھی حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کو لیجیے۔

۱.... اس واقعہ کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی کہ شیطان تمہارا سخت اور کھلا دشمن ہے، اس کی چالوں اور مکر و فریب سے بچنے کے لیے ہر وقت بیدار رہیں، اگر کبھی کوئی شخص شیطان کے جال میں آ گیا یا جذبات سے مجبور ہو کر کسی گناہ کا ارتکاب کر لیا تو شیطان کی طرح اپنے گناہ و نافرمانی کے حق میں دلائل تلاش کر کے بغاوت و سرکشی کی راہ اختیار نہ کرنا، بلکہ اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹو اور رو رو کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کر کے معافی مانگو۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا مہربان ہے، وہ بہت بڑی بخشش و کرم والا ہے، وہ آپ کے گناہوں کو معاف کر کے آپ پر رحمتوں کا نزول فرمائے گا، ورنہ اگر شیطان کی طرح گناہ و جرم پر جم گئے تو تمہارا حشر بھی شیطان جیسا اور شیطان کے ساتھ ہو گا۔

۲.... کسی نبی کی معمولی سی لغزش، خلافِ اولیٰ کام اور اس کی نوعیت کو قرآن مجید میں ذکر کرنے کی یہ وجہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر انبیا علیہم السلام کی پاکیزگی اور ان کی بے گناہی کو واضح کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ نبی کی زندگی ان کی امت کے لیے نمونہ اور فلاح و نجات کا ذریعہ ہے اس لیے پورے اطمینان کے ساتھ ان کے نقش قدم پر چلنے کو اختیار کریں، کیونکہ یہ بات تو معلوم ہے کہ مخلوقات میں نبی و رسول کا انتہائی بلند اور نازک مقام ہے اور رسول اس لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ ان کی اتباع کی جائے اس لیے ان کی معمولی سی بات بھی بہت بڑی معلوم ہونے کی وجہ صرف یہ نہیں کہ ان کی پاکیزگی اور عظمت و شان کا تقاضا ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی ان کی ذرہ برابر لغزش کو بہت بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ نبی کا ہر قول و فعل بلکہ کسی بات کو دیکھ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پر خاموش رہنا بھی قانونی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کی پوری زندگی کی ایک نگرانی کی جاتی ہے اگر ان سے زندگی بھر میں کہیں کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور اس کی اصلاح کی جاتی ہے۔ پھر

اللہ تعالیٰ اس لغزش کو صیغہ راز میں نہیں رکھتے، بلکہ اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہو کہ کہیں کوئی اس لغزش کو وحی الٰہی اور اللہ تعالیٰ کا حکم نہ سمجھے اور دوسرا فائدہ یہ ہو جائے کہ دنیا والے اس بات کو اچھی طرح جان سکیں کہ نبی کی زندگی کی ہر حرکت وسکون، قول و فعل اور کسی بات کو دیکھ کر سکوت کرنا گمراہی، کج راہی، مداہنت اور فکر ورائے کی ہر خطا سے بالکل پاک ہے اور ان کا ہر ہر قول و فعل، بلکہ کسی بات پر خاموشی اختیار کرنا بھی ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہے اور ان کی بتلائی ہوئی تعلیم وہدایت ہر قسم کی غلطی وخطا سے پاک ہے، اس میں کسی قسم کے نقص کا شائبہ تک نہیں لہٰذا نبی کے قول و فعل پر پورا اعتماد و بھروسہ رکھیں اور پورے یقین کے ساتھ ان کی اتباع و پیروی میں اپنے آپ کو فنا کر دیں۔

پھر اللہ تعالیٰ کی وحی اس پر اکتفا نہیں کرتی کہ صرف نبی کی لغزش اور اس پر تنبیہ و عتاب کو ذکر کر کے لوگوں کے سامنے لاتی ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس غلطی اور لغزش کی نوعیت اور اس معاملہ کی اصل حقیقت کو بیان کر کے خود ان کی طرف سے معذرت کر دیتے ہیں تا کہ کسی ظالم اور زندیق کو یہ جرأت نہ ہو سکے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی پر گناہ کا بے جا الزام لگائے۔

انبیا علیہم السلام بشر وانسان ہوتے ہیں

اگرچہ یہ مسئلہ سمجھنے کے لحاظ سے بہت مشکل نہ تھا تاہم اس مسئلہ میں بھی بہت سے لوگ اور قومیں راہِ اعتدال سے ہٹ کر افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئی تھیں اور ہیں اس لیے اس واضح اور بالکل آسان مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ لکھ دیا جاتا ہے۔

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ بشر اور انسان بھی کبھی اللہ تعالیٰ کا نبی ہو سکتا ہے؟ اسے انسانیت سے ماوراء کوئی فرشتہ ہونا چاہیے اس لیے جب اللہ تعالیٰ کا کوئی نبی یا رسول ان کے پاس آیا اور ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ وہ کھاتا پیتا ہے، گوشت پوست کا بنا ہوا انسانوں میں سے ایک انسان ہے اور وہ بھی ہماری طرح حوائجِ انسانی کا عادی ہے تو انہوں نے یہ خیال کیا کہ پھر اس کو ہم پر کیا فوقیت حاصل ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کا رسول سمجھیں اور ان کی اتباع اپنے اوپر لازم کریں، اس بنا پر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں ہو سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ کے نبی کی ہزاروں فضیلتوں اور دوسرے عظیم دلائل اور معجزات کو دیکھنے کے باوجود انہوں نے اپنے پیغمبروں کی بات ماننے سے انکار کیا۔

انبیا علیہم السلام کو الوہیت کے درجہ پر پہنچا دیا گیا

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کے متعلق یہ بے اعتدالی اور گمراہی بھی بہت زیادہ تھی اور کثرت سے یہی ہوا کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ کا نبی دنیا سے تشریف لے گئے تو کچھ مدت گزر جانے کے بعد ان کے پیرو کاروں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے نبیوں کو انسانیت کی سطح سے بلند کر کے الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ کہنا شروع کیا کہ وہ بشر وانسان نہ تھے، بلکہ خدا یا خدا کے بیٹے ہیں جس نے انسانوں کی نجات کے لیے انسانی شکل اختیار کر لی تھی یا جیسا کہ ہندو وغیرہ اپنے رہنماؤں کو دیوتا اور ایسا مجسم خدا سمجھتے ہیں جن کو ہر قسم کی طاقتیں حاصل ہوں۔

اس کے برعکس بعض لوگ جیسے یہود وغیرہ کی ذہنیت یہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر کو ایک عام انسان سمجھتے تھے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہر قسم کے گناہ کا ارتکاب بھی کرتے تھے اور سخت بداخلاقیاں، بلکہ کفر کے بھی مرتکب ہوا کرتے تھے، ان کے نزدیک ایک نبی اور عام انسان میں کوئی فرق نہیں، وہ سمجھتے تھے کہ نبی کا کام صرف پیشنگوئیاں کرنا ہے۔ انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ انبیا علیہم السلام کے بھیجنے کا مقصد تو لوگوں کو عدل وقسط اور ہدایت کی راہ وعمل بتلانا ہے اور امتیں ان کی اتباع کرتی ہیں، اگر انبیا علیہم السلام بھی گمراہی اور بداخلاقی کے راستوں کو اپناتے ہیں تو کیا (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام کو اس لیے بھیجتے ہیں تا کہ لوگ انبیا علیہم السلام کی پیروی کر کے راہِ حق سے بھٹک جائیں۔[1]

بعض لوگوں کے نزدیک نبی ورسول کی حیثیت صرف ایک چٹھی رساں کی ہے اور بس۔ جیسا کہ آج کل بھی ایسے زندیق ان لوگوں میں سے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان باور کرا کر یہی گیت گاتے ہیں وہ بھی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عام انسان سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک چٹھی رساں سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ نیز مسلمانوں ہی میں بعض ناسمجھ ایسے بھی ہیں کہ جب وہ انبیا علیہم السلام کی بشریت اور انسان ہونے کے قائل ہو گئے تو ان بے وقوفوں نے ان مقدّس ہستیوں کو بالکل عام انسانوں کی صف میں اسی طرح تسلیم کیا کہ وہ اب ان کے حق میں سوائے وحی کے کسی بھی امتیاز کے قائل ہونے کو ان کی بشریت سے انکار کے مترادف سمجھتے ہیں اور اس کو وہ توحید کے منافی اور شرک تصور کرتے ہیں۔ اس طرح کی تمام غلط فہمیوں کا سدِّباب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں نے دنیا کے سامنے ایک طرف تو اپنے لیے خداداد کمالات کا اظہار فرمایا،

---

[1] اس کی پوری تفصیل کے لیے "باب انبیا علیہم السلام کی بے گناہی" پڑھ لیجیے۔

دوسری طرف انہوں نے صاف طور پر یہ بھی اپنی امتوں کو سمجھا دیا کہ وہ ان امتیازی خصوصیات و کمالات کے باوجود نہ خدا ہیں اور نہ اس کے بیٹے یا جز، بلکہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی مخلوق، اس کے بندے اور انسان ہیں۔

انبیا علیہم السلام نے اپنے متعلق کیا فرمایا؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ انبیا علیہم السلام کی اس تعلیم کو بھی بیان فرمایا ہے جو انہوں نے اپنی اپنی قوموں کو دی تھی مثلاً جب ان سے یہ کہا گیا کہ:

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَاۗؤُنَا فَاْتُوْنَا بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝

"انہوں نے (پیغمبروں سے) کہہ دیا کہ تم تو ہماری ہی طرح انسان ہو، تم یہ چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں کے پوجنے سے روک دو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے آئے ہیں۔ (اچھا اگر ایسا ہی ہے جس طرح تم کہتے ہو) تو کوئی واضح اور روشن دلیل (یعنی صاف معجزہ) ہمارے سامنے پیش کر دو۔" (ابراہیم:۱۰)

تو انبیا علیہم السلام نے اپنی قوموں کے سامنے ایک طرف اپنی بشریت کا اقرار کیا دوسری طرف اپنی فضیلت کے اظہار کے لیے یوں جواب دیا:

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَعَلَي اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝

"ان رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر وانسان ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے (اپنا خاص) احسان فرماتا ہے اور یہ بات ہمارے اختیار میں نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر تمہارے سامنے کوئی (کھلا) معجزہ دکھلائیں اور اللہ تعالیٰ ہی ہے جس پر مؤمنوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔" (ابراہیم:۱۱)

انبیا علیہم السلام نے اپنی حیثیت بتلا کر اس مسئلہ کی پوری وضاحت کی

اس طرح انبیا علیہم السلام نے اپنی حیثیت واضح کر کے دنیا والوں کے سامنے مختلف انداز میں اس مسئلہ کی وضاحت کی اور بتلایا کہ ہم نے کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہم انسانیت سے ماوراء کوئی دوسری مخلوق فرشتے وغیرہ ہیں، ہم آپ ہی کی طرح انسان ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ہمیں وہ استعدادیں، فضائل اور وہ امتیازی خصوصیات عنایت فرمائی ہیں جو تم لوگوں کو حاصل نہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا احسان اور فضل و کرم ہے، وہ بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اسے بلند ترین خصوصیات عطا فرما کر منصبِ نبوت پر فائز کر دیتا ہے۔

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے اس مسئلہ کی وضاحت

اس مسئلہ کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یوں کرائی:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ

"آپ کہہ دو میں تو تم ہی جیسا انسان ہوں۔(مگر میرا امتیاز یہ ہے کہ) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔"
(کہف:۱۱۰)

اور ایک دوسری جگہ رسول اللہ ﷺ کی اتباع اور وحی الٰہی کو بیان فرما کر آخر میں یوں سمجھایا گیا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ

"کہہ دو کیا اندھا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم (اتنا بھی) غور نہیں کرتے۔" (انعام:۵۰)

مذکورہ بالا آیتوں میں ایک طرف تو سیدنا محمد ﷺ کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ وہ ایک انسان ہیں اور دوسری طرف اندھے کے مقابلے میں بینا ہونے کے امتیاز کو ذکر کر کے وحی اور بینائی کے ضمن میں بہت سی امتیازی خصوصیات اور بلند ترین صفات کو بھی ثابت کر دیا۔

مشرکینِ مکہ بھی پرانی جہالت اور غلط فہمی میں مبتلا تھے

مشرکین و کفارِ مکہ نے بھی جب یہ اعتراض کیا کہ آپ ﷺ کیسے رسول ہیں جو کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں بھی دکھائی دیتے ہیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب یوں دیا:

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِى الْاَسْوَاقِ

"اور ہم نے آپ سے پہلے ایسے ہی پیغمبر بھیجے تھے جو کھانا کھاتے تھے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے۔"
(فرقان:۲۰)

یعنی بشر و انسان ہونا پیغمبری کے منافی نہیں، بلکہ انسانوں کے لیے انسان ہی پیغمبر بھیجے جاتے ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید نے جگہ جگہ اس بات کی وضاحت کی کہ یہ کوئی نئی گمراہی نہیں، بلکہ اس سے قبل بھی جاہل لوگ اس جہالت اور گمراہی میں مبتلا رہے ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر کوئی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو وہ انسانیت سے ماوراء کسی عجیب و غریب مخلوق مثلاً فرشتوں کے ذریعے سے ہونا چاہیے، چنانچہ وہ پیغمبروں کے ماننے سے انکار کر کے یوں کہتے تھے:

قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

"انہوں نے کہا اگر ہمارے رب کو منظور ہوتا (کہ ہمیں کچھ سمجھا دیں) تو ضرور فرشتے نازل فرماتے لہٰذا ہم

اس چیز سے انکار کرتے ہیں جس کے لیے تم بھیجے گئے ہو۔" (حم السجدہ:۱۴)

اور ایک موقع پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی زبان سے ایسے لوگوں کو یہ جواب دلوا کر اس مسئلہ کی یوں وضاحت کی:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٣﴾ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾

"اے پیغمبر آپ کہہ دیجیے پاکی ہے میرے پروردگار کے لیے میں تو ایک بشر اور اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور ان لوگوں کو جب (رسولوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی) ہدایت آپہنچی تو ان کو ایمان لانے سے کسی بات نے نہیں روکا۔ مگر اس خیال نے کہ وہ کہتے تھے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے کسی بشر وانسان کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اے پیغمبر کہہ دیں کہ اگر زمین پر انسانوں کی جگہ فرشتے آباد ہوتے اور وہ اس پر چلتے پھرتے تو ہم ضرور ان کے لیے آسمان سے فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے۔" (الاسراء:۹۳-۹۵)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول جن لوگوں کے لیے بھیجا جاتا ہے وہ انہیں کی جنس میں سے ہونا ضروری ہے کیونکہ نبی ورسول کی حیثیت صرف ایک چٹھی رساں کی نہیں، بلکہ ان کے بھیجنے کا مقصد لوگوں کی تعلیم وہدایت اور تزکیہ ہے اور یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ ان کے ساتھ مناسبت بھی ہو اور ان کے جذبات واحساسات وغیرہ سے واقفیت بھی، لہٰذا اگر زمین پر مستقل بسنے والی مخلوق فرشتے ہوتے پھر تو ان میں سے کسی فرشتے کو یہ ذمہ داری سونپ دی جاتی مگر چونکہ زمین پر بسنے والے لوگ انسان ہیں اس لیے ان کا رسول بھی بشر وانسان ہونا چاہیے۔

انسان کو تعلیم انسان ہی دے سکتا ہے

فرشتے اگرچہ اللہ تعالیٰ کی بڑی مقدّس اور سراپا نورانی مخلوق ہیں، لیکن وہ انسانی جذبات واحساسات، انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں، بلکہ وہ اس کو سمجھ بھی نہیں سکتے مثلاً بھوک، پیاس، گرمی، سردی، راحت وتھکاوٹ، سکون وبے اطمینانی، غصہ وحسد، نفسانی خواہشات وغیرہ جیسی چیزوں کی حقیقت فرشتہ سمجھ ہی نہیں سکتا کیونکہ ان میں ان چیزوں کے احساس کا مادہ ہی نہیں رکھا گیا ہے تو جس نے کوئی چیز چکھی نہ ہو وہ اس کا مزہ کیسے جان سکتا ہے اور دوسروں کو اس چیز کا حسن یا قباحت کیسے سمجھا سکتا ہے؟ لہٰذا انسان کی رہنمائی

اور اس کی تعلیم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسا شخص ہو جو انسان کے حالات اور اس کے رجحانات و احساسات سے پوری طرح واقف اور ان کا مزاج شناس ہو تاکہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ تعلیمات سمجھا دے اور امت کے لیے عمدہ نمونہ قائم کر دے اور یہ بات چونکہ مخلوق میں سے انسان ہی کو حاصل ہے اس لیے خالق کائنات نے نبی ورسول ہمیشہ انسانوں میں سے بھیجے۔

انسان کی برتری دوسری مخلوق پر

آخر انسان میں وہ کونسی کمی ہے جس کی بنا پر رُشد وہدایت کے معاملہ میں اس پر دوسری مخلوق کو ترجیح دی جائے۔ آسمان وزمین کے اندر انسان ہی تو ایک ایسی مخلوق ہے جو انسانوں کی تو کیا دوسری مخلوقات مثلاً حیوانات وغیرہ کی نفسیات اور احساسات کو معلوم کر کے ان کی تربیت بھی کرتا ہے۔ آسمان وزمین کے درمیان دوسری وہ کون سی مخلوق ہے جو انسان جیسی صلاحیتوں سے نوازی گئی ہو؟ فرشتے بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی بڑی مقدّس و مکرّم مخلوق ہیں، وہ ایسے فرمانبردار ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی ذرہ برابر نافرمانی نہیں کرتے، لیکن قرآن مجید اس پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم کے حصول اور تعلیم وغیرہ کی جو صلاحیتیں اور استعدادیں دے رکھی ہیں زمین وآسمان کے درمیان نہ فرشتے کو ملیں نہ کسی دوسری مخلوق کو۔

اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی یہی صلاحیتیں اور معنوی قوتیں تو تھیں جن کی بنا پر انسان ہی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نیابت کے لیے چن لیا اور یہی کچھ تو تھا جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو انسانِ اول حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے گرا دیا اور تمام مخلوق پر کامل انسان کی فضیلت کو ثابت کر دیا۔ جب یہ بات معلوم ہے کہ انسان مسجودِ ملائکہ ہے، خلافتِ الٰہی کا تاج اس کے سر پر ہے اور وہی تمام مخلوق میں افضل و اشرف ہے، اور پھر بھی کوئی رسولوں کو اس اشرف وافضل نوع سے خارج کر دیتا ہے تو پھر وہ کونسی مخلوق ہے جس میں ان کو داخل کیا جائے اس لیے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کی بشریت سے انکار کرتے ہیں وہ صرف قرآن وحدیث کے منکر نہیں، بلکہ وہ اس مقدّس گروہ کی سب سے بڑی فضیلت کا بھی انکار کرتے ہیں۔

کیا انبیا علیہم السلام معمولی اور عام انسان ہوتے ہیں؟

جب یہ بات اچھی طرح واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا رسول و نبی کامل انسان اور بشر ہی ہوتا ہے اور یہی اس کی ایک بہت بڑی فضیلت بھی ہے تو اب اس بات کو سمجھیے کہ مذکورہ بالا آیتوں اور اس طرح قرآن مجید کی دوسری آیتوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور عقل و تجربہ سے بھی یہ بات اچھی طرح ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نبی

اگرچہ انسان ہی ہوتا ہے، لیکن اس کا وہ مطلب نہیں جو بعض کج فہم بد دماغ لوگوں نے لیا ہے، ان کے نزدیک انبیا علیہم السلام اور دوسرے عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں، وہ ان کو وحی الٰہی اور القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف و کمالات اور عیوب و نقائص میں عام انسانوں کے برابر سمجھتے ہیں اور وہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ "میں تو تم ہی جیسا انسان ہوں۔" جیسی آیتوں کی بنا پر خصوصیات و کمالات نبوت سے انکار کر کے پورے قرآن مجید اور احادیث کے ذخیرے کو نظر انداز کرتے ہیں۔

حالانکہ اس قسم کی آیتوں پر جو شخص صرف ایک بھی نظر ڈالے گا تو وہ ان آیتوں سے یہی سمجھے گا کہ ان کے انسان و بشر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نوع انسانی کے علاوہ کسی دوسری نوع سے تعلق نہیں رکھتے، وہ انسانوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں اور انسانی زندگی کے تمام ادوار بچپن، جوانی اور بڑھاپا سب کو عبور کرتے ہوئے بالآخر دنیا سے تشریف لے جاتے ہیں، اسی طرح فطری ضرورتوں میں یہ مقدّس گروہ دوسرے انسانوں کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔

نبی اور غیر نبی میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے

لیکن عام انسانوں اور انبیا علیہم السلام میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے نبوت کے لیے ضروری امتیازی خصوصیات و کمالات جو ان کو عطا کیے جاتے ہیں عام انسان ان کو لاکھوں مجاہدات کے ذریعہ بھی نہیں حاصل کر سکتے۔

ایک نوع کے افراد میں تفاوُت و امتیاز

کسی چیز کا کسی نوع میں شریک ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ اس کے تمام افراد ہر لحاظ سے بالکل مساوی ہوں گے، دنیا میں لعل و جواہرات کی قیمتوں پر غور کریں، حیوانات میں ایک ہی صنف کی قیمتوں میں تفاوت کا اندازہ لگائیں تو ان کے درمیان ادنیٰ سے اعلیٰ تک اتنے درجات نظر آئیں گے کہ صرف نوعی اشتراک کے علاوہ گویا ان میں کوئی اشتراک ہی نہیں پھر انسان تو اشرف المخلوقات ہے اس کے افراد میں جو تفاوُت ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگانا ہمارے لیے مشکل ہے۔

عام انسانوں میں تفاوُت پر غور کریں

اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کی تو شان ہی اور ہے، عام انسانوں کے جسمانی اور ذہنی کمالات کو دیکھیں، ان کمالات و اوصاف کے لحاظ سے انسانوں میں کس قدر تفاوُت ہوتا ہے، ایک انسان اتنی صلاحیتوں والا ہوتا ہے کہ دنیا پر حکومت کرنے کی صلاحیت و اہلیت رکھتا ہے اور کوئی اس لحاظ سے اس قدر کمزور ہوتا ہے کہ اپنے گھر کو بھی سنبھال

نہیں سکتا، کسی میں فن وہنر کی وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کی بنا پر وہ طرح طرح کی ایجادات کرتا ہے اور کوئی اس طرح کے فن وہنر اور صلاحیتوں سے بے بہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح حسن وصورت، قوت، فن وہنر وغیرہ کے لحاظ سے لوگوں میں جو تفاوت ہے وہ تو سب کو معلوم ہے تو ان تمام تربدنی اور جسمانی کمالات میں سے جس شخص میں جو بھی کمال ہو تو اسی کمال وصفت کے امتیازی خواص ولوازم بھی اس کے لیے ماننے پڑیں گے اور جو جس انداز کا پہلوان ہے اس کے جوڑوں، پٹھوں وغیرہ کی مضبوطی اور اس کی چستی وچالاکی اور لچک وغیرہ کو اسی انداز میں ماننا پڑے گا، پھر اخلاق، صبر واستقامت، حیا وبے حیائی، ظلم وانصاف وغیرہ کے اوصاف کے لحاظ سے انسانوں کے مراتب پر غور کریں تو کوئی انسان ایسا بھی ہوگا جو انسانی صورت میں ملبوس ہو کر درندوں سے بدتر ہوگا، وہ انسانوں کا خون چوس کر اپنا تن بدن بنائے گا اور کوئی انسان ایسا ملے گا جس کی جان انسانیت کی خیر خواہی میں گھلتی جارہی ہوگی، وہ اپنے مال ودولت اور اپنی جان کو انسانوں کی خیر خواہی میں ختم کرنے کے درپے ہوگا۔ غرض یہ کہ جس انسان میں جتنے اور جس قدر انسانی کمالات اور اوصاف ہوں وہ جسمانی اوصاف اور خواص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنی خصوصیتوں میں دوسرے انسانوں سے یقیناً اسی قدر بلند اور ممتاز ہوتا ہے۔

تو جب تجربہ اور مشاہدہ سے یہ بات چڑھتے سورج سے زیادہ واضح ہے کہ عام انسانوں کے درمیان علم وفن، کسب واکتساب اور اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے بے شمار مراتب اور درجات ہوسکتے ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے لیے اپنے اپنے فن وہنر اور کمال کے مطابق صلاحیتوں کا اقرار کرنا پڑتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کے متعلق یہ تو تسلیم کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے صرف انہی کو چن کر اللہ تعالیٰ ان کو ازخود منصبِ نبوت پر فائز کردیتے ہیں۔

جس میں جس کام کی اہلیت ہو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کام اسی کے سپرد کیا جائے

لیکن اس عظیم الشان اور مقدّس منصب کے لیے جو استعدادیں، جو صلاحیتیں اور جو امتیازی خصوصیات لازم ہیں ان سے انکار کردیا جائے، حالانکہ جب ہم خود کوئی معمولی کام اور کوئی معمولی عہدہ کسی کے سپرد کردیتے ہیں تو ہم اپنے علم اور تجربے کے مطابق وہ کام اور وہ عہدہ اسی شخص کے حوالے کردیتے ہیں جو اس کا اہل ہو پھر جب بعد میں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو اس کام اور منصب کا اہل نہیں تو پھر بعد میں بھی اس کو اس عہدہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی ذات جس نے ساری کائنات کو عدل وقسط پر بنایا اور ہمیں عدل وقسط پر قائم رہنے کا حکم دیا ہے اس علیم وخبیر ذات نے جس کو بھی نبوت کے مقدّس مقام پر کھڑا کیا پھر کبھی اس کو اس منصب سے

ہٹایا نہیں۔ اس کے بارے میں کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس عظیم و مقدّس منصب پر اس کو کھڑا کرے جو ایک عام انسان ہو اور ان میں کوئی امتیازی خصوصیات نہ ہوں گی۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا ظلم اور اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ سے انکار ہے۔

نبی اور غیر نبی میں نبوت ورسالت کے فرق کا مطلب

حقیقت یہ ہے کہ نبی اور غیر نبی میں وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کا معنیٰ ہی یہی ہے کہ ان دونوں (نبی وغیر نبی) میں وحی ورسالت کے تمام لوازم و خصوصیات اور ضروری اوصاف میں بھی امتیاز ہوتا ہے اور انہی امتیازی خصوصیات و کمالات سے وہ تمام دنیا والوں پر بالا و برتر ہوتے ہیں جیسا کہ انبیا علیہم السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَ كُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ

"اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے دنیا والوں پر فضیلت دی۔" (انعام:۸۶)

غرض یہ کہ انسان ہونے کے باوجود ان میں پہلے سے وہ فطری استعداد و خصوصیات اور امتیازی صلاحیتیں رکھ دی جاتی ہیں جو اس مقدّس منصب کے لیے ضروری ہوتی ہیں، بلکہ انبیا علیہم السلام کے متعلق یہ بھی ثابت ہے کہ وہ بعض جسمانی صفات اور خصائص میں بھی دوسرے عام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں مثلاً بخاری شریف وغیرہ کی صحیح حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ انبیا علیہم السلام کے دل اور ان کے احساسات نیند کی حالت میں بھی بیدار رہتے ہیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعلق فرمایا ہے کہ "میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا" (صحیح بخاری کتاب التہجد) اور فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ الْاَنْبِيَآءُ تَنَامُ اَعْيُنُهُمْ وَ لَا تَنَامُ قُلُوْبُهُمْ

"اور اسی طرح انبیا علیہم السلام ہیں کہ ان کی آنکھیں سوتی ہیں لیکن ان کے دل نہیں سوتے۔"
(صحیح بخاری: کتاب المناقب)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید فرماتے تو یوں فرماتے:

فَاِنِّيْ اَرَاكُمْ مِّنْ وَّرَاءِ ظَهْرِيْ

"کیونکہ میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے دیکھتا ہوں۔" (صحیح بخاری)

اور ایک دوسری روایت میں:

فَوَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ اِنِّیْ لَاَرَاکُمْ مِنْ خَلْفِیْ کَمَا اَرَاکُمْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ

"اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسا کہ سامنے سے۔" (نسائی)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ کئی دن مسلسل اسی طرح روزے رکھتے کہ درمیان میں ایک لمحہ کے لیے افطار نہ کرتے تھے۔ اس طرح کے روزے رکھنے کو "صوم وصال" کہا جاتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ دیکھ لیا تو انہوں نے اسی طرح روزے رکھنے کی اجازت مانگی تو آپ ﷺ نے شفقت کے انداز میں یوں جواب دیا کہ:

وَاَیُّکُمْ مِثْلِیْ اِنِّیْ اَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ

"اور تم میں سے کون شخص میری مثل ہے میں تو اس طرح رات گزارتا ہوں کہ مجھے میرا پروردگار کھلاتا بھی ہے پلاتا بھی ہے۔" (صحیح بخاری ومسلم)

روحانی اور اخلاقی خصوصیات کے علاوہ بہت سی جسمانی امتیازی صفات و خصوصیات میں سے چند بطورِ نمونہ پیش کیے گئے جن سے یہ بات معلوم کی جاسکتی ہے کہ انبیا علیہم السلام انسان ہونے کے باوجود بہت سے جسمانی اوصاف میں بھی عام انسانوں سے ممتاز ہوتے ہیں۔ متنبی ایک مشہور شاعر ہے اس نے ایک ہی صنف میں اشتراک کے باوجود ان کے افراد میں امتیاز کو ایک مثال کے ساتھ بہترین انداز میں پیش کیا ہے کہ...

إن تفق الأنام و أنت منهم　　　فإن المسك بعض دم الغزال

"اگرچہ تمام لوگ بشریت میں برابر ہیں اور آپ بھی ان میں سے ایک ہیں پس آپ اور دوسرے لوگوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے جیسا کہ مشک ہرن کے خون میں سے ہے (لیکن کون نہیں جانتا کہ ہرن کے عام خون اور مشک میں زمین و آسمان کا فرق ہے)۔

لیکن یاد رہے کہ انبیا علیہم السلام کے اجسام میں بھی خواہ جتنی ہی عجیب و غریب اور حیرت انگیز صفات و کمالات کو مانا جائے مگر پھر بھی وہ جسم ہی کی خصوصیات وصفات ہوں گی جو ان کے لیے عام لوگوں کے جسموں سے اعلیٰ اور بالاتر ہونے کی دلیل تو بن سکتی ہے مگر اس کی وجہ سے کوئی نبی بھی نوع انسانی سے نکل کر انسانیت سے ماوراء کسی دوسری مخلوق میں داخل نہیں ہوتا اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی صفت میں اشتراک پیدا کر سکتا ہے۔ جب وہی قدیر و حکیم ذات ہر چیز اور ہر چیز کی ہر خصوصیت، ہر صفت اور ہر کمال کا خالق و مالک ہے تو کیا کسی چیز کی عارضی صفت و کمال کا

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا بھی کوئی اشتراک پیدا ہو سکتا ہے؟ آخر جنت میں بھی تو ایک جنتی جو چاہے گا وہ اس کو ملے گا اور وہاں ایک ادنیٰ جنتی کے لیے جو عظیم جسمانی خصوصیات اور دوسرے کمالات کا ذکر قرآن و حدیث میں موجود ہے کیا وہ ان بے شمار جسمانی خصوصیات کے باوجود انسانیت و بشریت سے ایک قدم باہر جا سکتا ہے؟ اور کیا وہ ان عظیم صلاحیتوں اور کمالات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی بھی درجہ میں کوئی اشتراک پیدا کر سکتا ہے؟ ہر گز نہیں، بلکہ مخلوق اور مصنوع میں جتنے بھی کمال ہوں وہ خالق اور صانع کی صفاتِ کمال پر ہی دلیل ہوتے ہیں نہ یہ کہ وہ اس کمال کی وجہ سے خود اپنے خالق اور صانع کی صفات میں اشتراک پیدا کر دے۔

اِفراط و تفریط کرنے والے اور بے اعتدال لوگ کون ہیں؟

اس پوری تفصیل میں اِفراط و تفریط اور بے اعتدالیوں کی نشاندہی ہو گئی ہے اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جن لوگوں نے اپنے نبیوں اور داعیوں کو سطح انسانیت سے بلند کر کے الوہیت کے درجہ پر پہنچا دیا وہ بھی عظیم کفر میں مبتلا تھے اور وہ بھی جنھوں نے نبیوں کو عام اور معمولی انسان سمجھ لیا ہے اور ان کو صرف چٹھی رساں کی حیثیت دی ہے، اسی طرح ان لوگوں کی جہالت اور گمراہی بھی سامنے آئی جنھوں نے انبیا علیہم السلام کے امتیازات اور ان کے کمالات کی وجہ سے ان کی بشریت کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ کے نبی کو دائرہ انسانیت سے نکال دیا اور ان لوگوں کی شقاوت اور جہالت بھی پوری طرح واضح ہو گئی جنھوں نے ان کو بشر ماننے کے بعد بالکل عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

خلاصۂ بحث اور راہِ اعتدال

لٰہذا انبیا علیہم السلام کے متعلق اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے معلّم اور ان کے رُشد و ہدایت کے لیے امین بنا کر بھیجے جاتے ہیں اور ان کو اول سے ہی وہ بلند ترین امتیازی خصوصیات اور استعدادیں عنایت کی جاتی ہیں جو اس عظیم اور مقدّس منصب کے لیے ضروری ہوتی ہیں، لیکن تمام خصوصیات و کمالات کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور لوازم بشریت سے متصف انسانوں کے ہم جنس معصوم اور کامل انسان ہوتے ہیں۔

باب...... وحی اور القائے ربانی

وحی کسے کہتے ہیں؟

"وحی کے معنی ہیں خفیہ طور پر اشارہ میں جلدی کے ساتھ کوئی بات سمجھا دینا۔"

وحی لغوی معنی کے اعتبار سے بہت وسیع اور عام مفہوم رکھتی ہے، قرآن مجید میں بھی وحی کا لفظ ذی روح اور غیر ذی روح دونوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، بلکہ شیطان اپنے دوستوں کے دلوں میں جو وسوسے ڈالتا ہے ان کے لیے بھی قرآن مجید میں یہی لفظ وحی استعمال کیا گیا ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـِٕهِمْ لِيُجَادِلُوْكُمْ

"اور شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتے ہیں تا کہ تمہارے ساتھ جھگڑا کریں۔"

(انعام:۱۲۱)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی مخلوق کو جو رہنمائی اور ہدایت ملتی ہے اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں ایک قسم تو وہ ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہر مخلوق جمادات ونباتات وغیرہ کو ملتی ہے جس سے کوئی بھی چیز مستثنیٰ نہیں اس کے لیے بھی قرآن مجید میں "وحی" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے مثلاً زمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا

"کیونکہ تیرے رب نے اس کو (یوں ہی) وحی کی ہوگی۔" (زلزال:۵)

آسمانوں کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا

"اور ہر آسمان میں اس کا مناسب قانون وحی کر دیا۔" (حٰم سجدہ:۱۲)

یا مثلاً شہد کی مکھی کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ

"اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کو اس بات کی وحی کی (یعنی اس کے دل میں یہ بات اور رہنمائی ڈال دی) کہ پہاڑوں، درختوں اور ٹہنیوں میں اپنے چھتے بنایا کریں جو لوگ (اس غرض سے) بناتے ہیں۔" (نحل:۶۸)

مذکورہ بالا آیتوں میں لفظ اَوْحٰى کو اللہ کی اسی ہدایت اور رہنمائی کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو تمام مخلوق کے

لیے عام ہے اور اس کی وجہ سے ہر ایک مخلوق پر اس کی راہ عمل کھل جاتی ہے جس کو تکوینی ہدایت، تکوینی حکم یا فطری و طبعی ہدایت اور فطری وحی وغیرہ جیسے مختلف ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے۔

نیز ایسا انسان جو نبی نہ بھی ہو اس کے دل میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جو بات ڈالی جاتی ہے اس کو بھی قرآن مجید میں اسی لفظ وحی سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ

"اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دودھ پلاؤ۔" (قصص:۷)

وحی کا عام اور لغوی مفہوم اور الہام کا معنی

قرآن مجید کی مذکورہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف قسم کی مخلوق کی رہنمائی کے لیے لفظ وحی کو استعمال کیا گیا ہے جو سب اسی لفظ وحی کے لغوی مفہوم ہیں۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے متعلق "وحی" کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس سے بھی وحی لغوی مراد ہے جس کو اصطلاح میں الہام کہا جاتا ہے جس کے لفظی معنی کسی چیز کا دل میں ڈال دینے یا وارد ہونے کے ہیں اور اس سے وہ علم مراد ہے جو انسان کے دل میں بغیر غور و فکر، اور تحقیق و استدلال کے بے تأمّل اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے آجاتا ہے ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد میں کسی حسی تجربے اور عقلی دلیل سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن یا دل میں کسی کسب و اکتساب اور کسی عقلی دلیل کے نتیجے کے طور پر نہیں آتا، بلکہ خود دل میں آجاتا ہے۔

اس کی معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علما، وصوفیا، مدبّرین اور موجدین وغیرہ جیسے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے تصنیفات اور ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں، دنیا میں جتنے اکتشافات اور مفید بڑی بڑی ایجادات اور معرکۃ الآراء تصانیف وجود میں آئیں ان سب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی قسم کے الہام کی کارفرمائی نظر آتی ہے، بلکہ یہ تو عام انسانوں کی زندگیوں میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کبھی کبھی اچانک ذہن میں کوئی خیال آیا یا کوئی تدبیر دل میں ڈالی جاتی ہے یا دل میں کوئی مفہوم وارد ہو جاتا ہے پھر بعد میں تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ واقعی وہ ایک صحیح رہنمائی تھی جو اس کے دل میں

اس واقعہ سے قبل ڈال دی گئی تھی۔

وحی کی کامل ترین صورت وحی نبوت ورسالت

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتوں میں مختلف قسم کی مخلوق کی رہنمائی کے لیے جو لفظ وحی کو استعمال کیا گیا ہے وہ سب اقسام اسی لفظ وحی کے لغوی مفہوم ہیں۔

وحی الٰہی کی سب سے کامل ترین قسم وہ ہے جس کو وحی نبوت، وحی رسالت یا وحی شرعی وغیرہ جیسے ناموں سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت، رہنمائی اور یقینی علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں انبیا علیہم السلام کو غیبی حقیقتوں سے خبردار کرتا ہے اور ان کو دنیا میں زندگی گذارنے کا قانون اور ہدایت عطا فرماتا ہے تاکہ وہ یہ حقائق اور اللہ تعالیٰ کی تعلیمات وہدایت عام مسلمانوں تک پہنچائے اور وہ ان ہدایات پر یقین کر کے ان کے مطابق اپنی زندگیاں بنائیں اور اپنی دنیوی زندگی کو اطمینان بخش اور آخرت کی ابدی اور بے نہایت زندگی کو پر مسرت بنا کر ہلاکت اور تباہی سے بچائے۔

اللہ کی یہ وحی وہدایت ایسی ہے جو اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، نبی ورسول کے سوا کسی اور کو نہیں کی جاتی جیسا کہ قرآن مجید میں اسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے:

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ﴿۲۷﴾ لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿۲۸﴾

"وہی عالِم الغیب ہے وہ اپنے غیب پر کسی کو آگاہ نہیں فرماتا مگر جس رسول کو پسند فرمالے تو اس کے آگے پیچھے محافظ بھیج دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیے اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام احوال کا احاطہ کیے ہوئے ہیں اور اس نے ایک ایک چیز کو گن رکھا ہے۔" (جن:۲۶-۲۸)

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد مقامات پر یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی اور وحی کا یہ آخری یقینی علم صرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، کسی غیر نبی ورسول کو یہ علم نہیں دیا جاتا۔

کیا لفظ وحی کا استعمال غیر نبی کے لیے درست ہے؟

وحی نبوت ورسالت کا یہ سلسلہ حضرت خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے، البتہ وحی لغوی اور الہام وغیرہ ہمیشہ سے جاری رہے گا لیکن چونکہ لفظ "وحی" اب اس آخری قسم اور اصطلاحی معنی میں اس قدر مشہور ہو چکا ہے کہ "وحی" کا لفظ سنتے ہی فوراً اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا خیال آجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا وہی کلام ہوگا جو

اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں انبیا علیہم السلام پر نازل فرماتا تھا۔ ایسی حالت میں جب کہ "وحی" اپنے اصطلاحی معنی میں اس قدر مشہور ہو چکا ہے یہ درست نہیں کہ "وحی" کا لفظ بھی پیغمبر کے سوا کسی اور کے لیے استعمال کیا جائے۔

انبیا علیہم السلام پر وحی الٰہی نازل ہونے کی صورتیں

رہی یہ بات کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے پیغمبروں پر کس صورت میں اپنا کلام اور اپنی ہدایت نازل فرماتا ہے، اس کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿۵۱﴾

"کسی بشر کے لیے (یہ صورت) ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے (دنیا میں روبرو) بات کرے مگر (اللہ تعالیٰ کا کلام یا تو) وحی (یعنی اشارہ) سے (ہوتا ہے) یا پردے کے پیچھے سے یا کسی پیغام لانے والے (فرشتہ) کو بھیجتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے جو اللہ تعالیٰ چاہے اس کو وہ وحی کرتا ہے۔" (شوریٰ:۵۱)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بتلایا کہ کوئی بھی بشر اپنی موجودہ صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے یہ طاقت نہیں رکھتا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے اس دنیا میں روبرو ہو کر کوئی بات کرے اور وہ اس کا تحمل کر سکے، البتہ کسی بشر اور انسان کے ساتھ اس کی ہم کلامی کی تین صورتیں ہیں:

۱.... اللہ تعالیٰ خود براہِ راست نبی ورسول کے دل میں کوئی بات ڈال دیتے ہیں جس میں نہ تو کوئی آواز سنائی دیتی ہے اور نہ کسی فرشتے کا واسطہ ہوتا ہے۔

۲.... اللہ تعالیٰ براہِ راست نبی اور رسول کو اپنی ہم کلامی کا شرف عطا فرماتا ہے اور اس میں بھی کسی فرشتے کا واسطہ نہیں ہوتا، نبی کو غیب سے آواز سنائی دیتی ہے، مگر اس حالت میں آنکھیں اللہ تعالیٰ کے دیدار سے مشرف نہیں ہوتیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کے موقع پر پیش آیا، یہ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی پردہ اور حجاب حائل ہوتا ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان موجودہ صلاحیتوں اور قوتوں سے ناممکن ہے اور انسان، بلکہ تمام مخلوق کا یہی ضعف ہی ہے جو کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے دیدار اور زیارت میں حائل اور رکاوٹ ہے۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ اس ضعف اور رکاوٹ کو ہٹا دیں گے اور جنتی لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عظیم صلاحیتوں اور قوتوں کی بدولت اللہ تعالیٰ کے دیدار سے سیراب ہوتے جائیں گے۔

۳.... اللہ تعالیٰ اپنی تعلیمات اور اپنا پیغام کسی فرشتے کے ذریعے نبی تک پہنچائیں، کسی فرشتے کے ذریعے جو پیغام پہنچایا جاتا ہے، اس کی بھی تین صورتیں حدیثوں سے معلوم ہوتی ہیں۔

(الف) ایک صورت یہ کہ فرشتہ انسانی شکل اختیار کر کے نبی کے سامنے آتا ہے اور نبی اس کو اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ کہ فرشتہ نبی کے دل پر نازل ہو جائے اور نبی اس کو اپنے قلب ہی کی آنکھ سے دیکھے۔

(ج) اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فرشتہ نبی کو اپنی اصلی صورت میں نظر آجاتا ہے، لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا خواب بھی وحی ہوتا ہے

انبیا علیہم السلام کو جس طرح بیداری میں اللہ تعالیٰ کی وحی ہوتی رہتی ہے، اسی طرح ان کو خواب کی حالت میں جو کچھ ہدایت و تعلیم اور وحی ہو جاتی ہے وہ بھی حالت بیداری کی طرح یقینی اور حُجّت ہوتی ہے، کیونکہ انبیا علیہم السلام کے قلوب عین خواب کی حالت میں اسی طرح بیدار اور خبر دار رہتے ہیں جس طرح کہ وہ بیداری کی حالت میں ہوتے ہیں، نیند کی وجہ سے ان کے ظاہری حواس دیکھنا اور سننا وغیرہ مُعطّل ہو کر آرام فرماسکتے ہیں۔ عالَمِ غیب جس کا تعلق دراصل ان ظاہری حواس کے ساتھ نہیں اس سے وہ کسی حالت میں بھی غافل نہیں ہوتے، اس لیے ان کے خواب کے ادراکات اور اس سے ملنے والی ہدایات و تعلیمات کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو ان کی بیداری کی تعلیمات اور ادراکات کی ہوتی ہے۔

چنانچہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

”جب وہ (یعنی حضرت اسماعیل علیہ السلام) اس قابل ہو گئے کہ باپ کے ساتھ دوڑ دھوپ کر سکیں تو (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا اے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں اب تو بتا تیرا کیا خیال ہے (بیٹے نے) عرض کیا ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس کی تعمیل کیجیے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔“ (الصّٰفّٰت:۱۰۲)

دیکھیے! بیٹے پھر معصوم اور اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا معاملہ کتنا اہم معاملہ ہے جس کی نہ شریعت اجازت

دیتی ہے اور نہ عقل مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خواب کو اللہ تعالیٰ کا حکم یقین کر لیا اور بغیر کسی قسم کے تردُّد کے فوراً اس کی تیاری شروع کر دی، حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی اس خواب کو اللہ تعالیٰ کا حکم یقین کر لیا تھا اور ان کے نزدیک بھی یہ بات مسلَّم تھی کہ پیغمبر کا خواب وحی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اس کے پورا کرنے پر مامور ہوتے ہیں اس لیے اس اولوالعزم اور سلیم الفطرت بیٹے نے یوں نہیں فرمایا:

قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تَرٰى

"یعنی اے میرے والد کر لیجیے وہ کام جو آپ نے خواب میں دیکھا۔"

بلکہ یوں فرمایا کہ:

قَالَ يٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ

"اے میرے ابا جان جو کچھ آپ کو حکم دیا گیا اس کو پورا کیجیے"۔(صافات:۱۰۵)

اور پھر اس کے بعد والی آیتوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ:

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا

"بلاشبہ تو نے خواب کو سچ کر دکھایا"۔(صافات:۱۰۶)

اور یہ فرمانا کہ:

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ﴿۱۰۶﴾

"یقیناً یہ بڑی کھلی آزمائش تھی اور ہم نے اس کے فدیہ میں اس کو عظیم ذبیحہ (اور قربانی) دے دیا۔"

(صافات:۱۰۴-۱۰۷)

یہ جملہ امور اس بات کی واضح دلیل ہیں، کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کرنے کا حکم ہوا تھا اور اس کا پورا کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام پر واجب تھا، ورنہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے خواب کے بارے میں ذرہ برابر بھی تردُّد ہوتا تو وہ یہ اقدام نہ فرماتے اور نہ ان کے لیے یہ جائز تھا کہ وہ محض ایک ظن کی بنا پر معصوم اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا فیصلہ کرتے۔

پھر اگر حضرات انبیا علیہم السلام کے خواب کے متعلق یہ فیصلہ کن حکم نہ ہوتا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم اور وحی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضرور کچھ تنبیہ فرماتے مثلاً یوں فرماتے کہ اگرچہ یہ میرا حکم تھا تاہم آپ کے لیے کسی طرح جائز نہ تھا کہ آپ محض خواب کو اللہ تعالیٰ کا یقینی حکم جان کر فیصلہ کرتے یا مثلاً کم از کم یوں فرماتے کہ

آپ کا یہ خواب دیکھنا تو میرا حکم تھا لیکن آئندہ محض خواب کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کوئی اتنا بڑا فیصلہ نہ کریں، لیکن پورے قرآن مجید اور اس واقعہ کے پورے سیاق وسباق میں کوئی ایک اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا، بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اس فیصلہ کو بالکل ٹھیک اور درست بتلایا کیونکہ یہ بات پہلے سے حضرات انبیا علیہم السلام کے متعلق طے تھی کہ انبیا علیہم السلام کا ہر خواب بالکل سچا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی وحی ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

غیر انبیا کے کشف والہام اور خواب کی حیثیت

وحی الٰہی اور علم نبوّت ورسالت تو صرف انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہیں اور انسان کے لیے یہی ذریعۂ علمِ حقیقت اور جزم ویقین کا واحد راستہ ہے اس کے علاوہ حواس ظاہرہ عقل وغیرہ جتنے ذرائع علم ہیں اس درجہ سے نیچے ہیں، وہ دوسرے انسانوں کو بھی حاصل ہیں۔ ان میں سے بعض ذرائع وہ ہیں جن کو کشف والہام اور خواب کہتے ہیں۔

جس طرح ایک انسان خواہ مسلمان ہو یا کافر محنت کرے تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی استعداد کے مطابق دنیوی چیزوں کا علم کھول دیا جاتا ہے جس کی بنا پر وہ نئی نئی چیزیں بنالیتا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے، اسی طرح اگر کوئی انسان خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو جب ریاضات کی راہ اختیار کرلیتا ہے تو اس پر اس کی قوت استعداد کے مطابق مادیات سے پرے ایک دوسرے اقلیم کے عجائبات کو کھول دیا جاتا ہے اور وہ اپنے باطنی حاسہ اور اندرونی قوت سے حالتِ بیداری میں ایسی چیزوں کو دیکھ پاتا ہے جن کا ظاہری حواس سے دیکھنا عادتاً ناممکن ہے، اسی کو اصطلاح میں کشف (کشف کونی) کہا جاتا ہے اور جو چیزیں اور واقعات عام انسانوں کو نیند کی حالت میں نظر آتے ہیں ان کو "رؤیا" اور "خواب" کہا جاتا ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے، مگر کوئی چیز نظر نہیں آتی اس کو "الہام" کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کا کچھ بیان پہلے بھی گزر چکا ہے۔

انبیا علیہم السلام کے خواب وغیرہ جیسے تمام ذرائع علم قطعی اور سو فیصد یقینی ہوتے ہیں، لیکن انبیا علیہم السلام کے علاوہ عام انسانوں کے لیے علم کے یہ تینوں ذریعے ایسے ہیں جن کی افادیت ظن سے آگے نہیں بڑھتی، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی ہوسکتے ہیں اور شیطانی وساوس، خیالات اور تصورات بھی ہوسکتے ہیں۔

غرض جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ صحیح بھی ہوسکتی ہیں اور غلط بھی اور یہ بھی ہوتا ہے کہ جو چیز نظر آئی ہے تو

حقیقت کے لحاظ سے وہ ٹھیک ہو، لیکن دیکھنے والے پر جو چیز غالب ہو یا جس سے وہ متاثر ہو وہ اس کو اسی صورت میں دیکھ لیتا ہے، پھر عام لوگوں کو ان ذرائع سے جو ادراکات حاصل ہوتے ہیں ان کا اصلاح خُلق، عقائد اور احکام وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان کی افادیت ان کی ذات تک محدود رہتی ہے کبھی کسی واقعہ کو پالیتے ہیں کبھی کچھ صورتیں دیکھ لیتے ہیں وغیرہ۔

لیکن پھر بھی ان تمام ادراکات اور معلومات کو وحی نبوت پر جانچا جائے گا اگر یہ معلومات علومِ نبوت سے متصادم نہیں، یعنی قرآن وسنت نہ ان کی تصدیق کرتے ہیں اور نہ تکذیب تو ایسی صورت میں نہ ماننا لازمی ہے اور نہ ان کا انکار ضروری ہے البتہ اگر معلومات ایسی ہیں جو کھلم کھلا قرآن وسنت سے ٹکراتی ہیں تو ایسی معلومات بالکل غلط اور باطل ہوں گی اور ان کے تقاضوں پر عمل ناجائز اور حرام ہوگا۔

غیر نبی کا کشف والہام اور خواب سب ظنی ہوتے ہیں

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں اہلِ دل علما اور اولیاء اللہ پر بہت سی حقیقتیں کشف والہام اور سچے خوابوں کے ذریعے کھول دیتے ہیں، شریعتِ مطہّرہ پر عمل اور قوّتِ ایمانی کی بنا پر عقائد، اعمال اور علومِ شرعیہ کے مصالح اور فوائد ان کو ایسے نظر آنے لگتے ہیں گویا کہ وہ ان حقائق کو اپنی نظروں سے دیکھتے ہیں اور بہت سے مشکل مقامات کا حل ان کے دلوں میں ڈال دیا جاتا ہے، نیز قوم وامت کی اصلاح کے طریقے اور وقت کے اہم تقاضے ان پر کھول دیے جاتے ہیں۔

غرض وہ تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر کیا کچھ کھول دیتے ہیں، لیکن ان اولیاء اللہ اور ربانی علماء کے خواب اور کشف اور الہام میں بھی غلطی کا احتمال موجود ہے اس کو ٹھیک سمجھنے کے لیے کتاب وسنت پر پیش کرکے جانچنا ہوگا، وہ دینی حُجّت نہیں اور نہ امت پر اس کی اتباع فرض ہے اگر وہ شریعتِ مطہّرہ کے احکامات سے متصادم نہیں تو اس کے ماننے اور اس پر عمل کرنے میں مضائقہ نہیں اور اگر شریعتِ مطہّرہ کے احکامات کے عین مطابق اور ان کا منشا ہے تو پھر اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن پھر بھی اس کو ماننا اور اس پر عمل کرنا اسی وجہ سے فرض نہیں کہ وہ ایک ولی اللہ یا ایک عالم کا الہام وغیرہ ہے، بلکہ اس لیے ماننا ضروری ہے کہ وہ شریعتِ مطہّرہ کا حکم ہے اور اگر ان کے خواب کشف وغیرہ کے ذریعے سے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو قرآن وسنت کے معروف احکام کے مطابق نہیں تو پھر اس کے تقاضے پر عمل کرنا جائز نہیں۔

باب..... انبیا علیہم السلام کا علم

وہ علم جو انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے

اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کی مرضیات ونامرضیات، اس کے احکام اور انسان کی سعادت وشقاوت کے قانون انسان کے اعتقادات، اعمال اور اخلاق وعادات کے خواص واثرات اور ان کے نتیجے میں ملنے والے ثمرات، ان کی جزاوسزا کا علم، قیامت، حشر نشر اور آخرت کے احوال، جزاوسزا، انعام وعذاب، جنت ودوزخ اور مادی دنیا سے ماوراء دوسرے عالم کے احوال وکیفیات وغیرہ جیسے امور کا دارومدار صرف وحی اور انبیا علیہم السلام کو ملنے والے علم پر ہے۔

انبیا علیہم السلام کا علم یقینی اور ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہوتا ہے

اور یہ علوم وہدایات انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طور پر پہنچائی جاتی ہیں کہ وہ شیطان کی دخل اندازی اور خود اپنے ذاتی خیالات، تصورات اور خواہشات کی آلائشوں سے بالکل پاک ومحفوظ ہوتے ہیں:

لَّا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ﴿٤٢﴾

”جس تک باطل کی کوئی رسائی نہیں نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے یہ اس ذات کی طرف سے اتاری جارہی ہے جو حکمت کا مالک ہے تمام تعریفیں اسی کی طرف لوٹتی ہیں“۔(حم سجدہ:۴۲)

نیز وہ حقائق کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں وہ فلسفہ کی طرح قیاس وگمان کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ براہِ راست علم ومشاہدہ کی بنا پر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پردوں کو بیچ میں سے ہٹا کر ان کو وہ حقیقتیں دکھلاتے ہیں جن پر ایمان بالغیب لانے کی دعوت دینے پر ہوتے ہیں۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿١٧﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿١٨﴾

”نہ تو نگاہ (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) نے کج روی (اور خطا) کی اور نہ حد سے تجاوز کیا (بلکہ جو کچھ دیکھا) پوری طرح اصلی اور حقیقی حالت پر دیکھا) یقیناً انہوں نے اپنے رب کی (قدرت کی) بڑی نشانیاں اور عجائبات دیکھیں“۔

(النجم:۱۷---۱۸)

پھر وہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور ان حقائق کو اس طرح ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہیں جس طرح کوئی غیر نبی بھوک پیاس یا غمی وخوشی کو پالیتا ہے اس لیے وہ اپنے علم میں ہر قسم کے شک وشبہ اور غلطی سے محفوظ رہتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام جو کچھ کہتے ہیں وہ من جانب اللہ ہوتا ہے

وہ تعلیم وہدایت کی کوئی بات اپنی طرف سے نہیں، بلکہ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہتے ہیں:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾

”وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا (بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے) وہ محض وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جاتی ہے۔“ (نجم:۳-۴)

انبیا علیہم السلام مستقل غیب کے مدعی نہیں ہوتے

یہی وجہ ہے کہ کوئی نبی ورسول اپنی تعلیم وہدایت میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی اور کسی قسم کا تغیر وتبدّل نہیں کر سکتا اور نہ وہ مستقل غیب کا مدّعی ہوتا ہے کہ وہ ہر بات کا جواب اپنی طرف سے دے، بلکہ وہ کسی سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی وحی اور ہدایت کا منتظر رہتا ہے اور ان کا اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جس وقت چاہیں اور جس طرح چاہیں اللہ تعالیٰ کی وحی اور علم کو حاصل کرلیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۵۰﴾

”(اے پیغمبر! تم لوگوں سے) کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے (غیبی) خزانے ہیں اور نہ میں (براہِ راست ازخود) غیب کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں کوئی فرشتہ ہوں میں صرف اس وحی پر چلتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے (اور اسی کی طرف تمھیں بھی دعوت دیتا ہوں، پھر ان سے) پوچھو کیا بینا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم (اتنا بھی) غور نہیں کرتے۔“ (انعام:۵۰)

نیز کفار نے جب قرآن مجید میں ترمیم وتبدیل کی درخواست کی اور کہا کہ اس طرح ترمیم وتبدیلی کے بعد ہم بھی آپ کے ساتھ ہو جائیں گے تو اس کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ

”کہو مجھے یہ حق نہیں کہ میں اس کو اپنی طرف سے (ذرہ برابر) ترمیم وتبدیل کر دوں میں تو بالکل اس کی اتباع کرتا ہوں جو کچھ مجھے وحی کے ذریعے بھجا جاتا ہے“۔ (یونس:۱۵)

بہر حال انبیا علیہم السلام کا علم وتعلیم ہر قسم کی غلطی اور آمیزش سے پاک اور محفوظ ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہتے ہیں حق کہتے ہیں، ان کے علم وتعلیم میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی، اسی پر انبیا علیہم السلام سب سے پہلے پختہ یقین

وایمان لاتے ہیں، یہی وہ وحی اور علم وہدایت ہے جس پر ہر ایک کے لیے ایمان لانا اور اس کے مطابق زندگی گذارنا لازم ہو جاتا ہے، اسی میں فلاح و نجات ہے اور یہی وہ علم ہے جو صرف انبیا علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے، پھر ان کے ذریعے عام لوگوں کو ملتا ہے جیسا کہ اس کا بیان اور اس کے متعلقہ قرآنی آیاتِ کریمہ پہلے لکھ دی گئی ہیں۔

اب رہتی دنیا تک قرآن وسنت پر نجات کا دارومدار ہے

عقیدۂ نبوت ورسالت کے سلسلہ میں اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ نبوت اور رسالت کی آخری کڑی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اب صرف انہی تعلیمات اور ہدایات پر نجات وفلاح کا دارومدار ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہو چکی ہیں اور ہمیں معتمد ذرائع سے پہنچی ہیں، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جس قدر آسمانی کتابیں دنیا بھر میں موجود تھیں یا ہیں ان سب میں تحریف و تبدیل ہو چکا ہے اور یہ ایک ایسی مسلّمہ حقیقت ہے جس پر خود موجودہ کتابیں گواہی دے رہی ہیں کہ ان کی حیثیت تاریخ سے زیادہ نہیں، تو ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی نہ ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی تعلیمات خلط ملط ہو کر مخلوط بندگی ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کے لیے دو چیزیں شرط ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور قانون میں دوسروں کے قانون اور بندگی کو شامل نہ کیا جائے اور دوسری یہ کہ جو کچھ کیا جائے خالص اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں میں دوسروں کی آراء مل گئی ہیں تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کا کوئی امکان نہ رہا، دوسری بات یہ کہ یہی وہ کتاب اور تعلیمات ہیں جو پوری انسانیت کے لیے اور رہتی دنیا تک انسانوں کی پوری زندگی کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی ہے جس میں نہ کوئی تحریف ہو سکتی ہے اور نہ ممکن ہے اور یہی وہ بدیہی کتاب اور شریعت تھی جس کی ساری دنیا انتظار کر رہی تھی اور جس کا بیان بائبل کے تحریف شدہ اور تبدیل شدہ کتابوں میں آج بھی موجود ہے۔ (دیکھیے: "دہریت سے اسلام تک" باب ۲)

باب..... ختمِ نبوت

ختمِ نبوت کا بیان

ختمِ نبوت کے مسئلہ میں مسلمانوں میں کبھی دو رائے نہ ہو سکیں، نہ یہ مسئلہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں مشکوک اور مشتبہ رہا اور نہ اس پر بحث کی ضرورت سمجھی گئی، لیکن برصغیر پاک وہند میں انگریزی حکومت نے اپنے مفادات اور تاریخی اسلام دشمنی کی تکمیل کے لیے اسلام کے اس مرکزی عقیدہ پر ضرب لگانا ضروری سمجھا اور مرزا غلام قادیانی کی ایک جھوٹی نبوت قائم کر کے امت میں انتشار پیدا کیا۔ وہ بظاہر عیسائیت کا رد کرتا تھا اور پادریوں سے مناظرے بھی کرتا تھا لیکن حقیقت میں وہ انگریز کا پرلے درجے کا فرمانبردار اور وفادار تھا، ملکۂ انگلستان کی شان میں جو تعریفی کلمات اس نے لکھے ہیں ایک غیرت مند مسلمان اس کو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔

اس نے انگریز کے سائے میں ایک نئی نبوت کی بنیاد ڈالی، نئی امت بنانی شروع کی اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں، یہی اس کی کتابوں میں ملیں گے:

(۱) وہ اپنی شخصیت کو اجاگر کرنے اور اپنے باطل دعووں پر زور دیتا تھا۔

(۲) قرآن مجید کے متعینہ اور مقررہ معنوں میں تبدیل وتحریف کر کے اس کو متعارف باور کرانا چاہتا تھا۔

(۳) مسلمانوں کی دشمنی اور انگریزوں کے ساتھ دوستی اور وفاداری پر سخت زور دیتا تھا۔

(۴) اسلامی جہاد جس سے مغرب اور خصوصاً انگریز سخت پریشان تھا اس کو ختم کر کے مسلمانوں کو بے دست وپا بنانے کی کوشش کرتا تھا تاکہ مسلمان ہمیشہ اور دوسروں کے دستِ نگر اور غلام رہیں۔ یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا، آخر تک وہ انگریز کا سخت وفادار رہا اور مسلمانوں میں اس وقت وہ بار بار جہاد کے ممنوع وحرام ہونے کا اعلان کرتا رہا جب کہ اس وقت دینی حمیت وغیرت کو بیدار کرنے کی سخت ضرورت تھی اور آخر تک جذبۂ جہاد کے مٹانے کی کوشش میں لگا رہا۔

یہاں اس کے متعلق بطورِ نمونہ اختصار کے ساتھ چند حوالے پیش کرتے ہیں:

قادیانی اور انگریز پادریوں کے مناظرے میں جوش اور تیزی کی وجہ

(۱) مرزا صاحب کو انگریزی حکومت کے ساتھ ایسا اخلاص اور اس کی خیر خواہی کا ایسا جذبہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے جوش نفرت کو کم کرنے کے لیے مختلف تدبیریں کرتا تھا۔ اس نے عیسائی مناظرین اور پادریوں کے مقابلے میں جس جوش وسرگرمی کا اظہار کیا اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ ان عیسائی پادریوں نے اسلام کی تردید اور پیغمبرِ

اسلام کی توہین میں ایسا رویہ اختیار کیا تھا جس سے مسلمانوں میں جوش اور اشتعال پیدا ہو جانے اور حکومت وقت کو نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا، اس لیے میں نے بھی مصلحۃً وقصداً ان کی تردید میں جوش و تاثر کا اظہار کیا تا کہ مسلمانوں کا جوش طبیعت فرو ہو جائے اور ان کو تسکین ہو۔ وہ لکھتے ہیں:

میں اس بات کا بھی اقرار کر رہا ہوں کہ جب کہ بعض پادریوں اور عیسائی مشنریوں کی تحریر نہایت سخت ہو گئی اور حدِ اعتدال سے بڑھ گئی اور بالخصوص پرچہ "نور افشاں" سے جو ایک عیسائی اخبار لدھیانہ سے نکلتا ہے نہایت گندی تحریریں شائع ہوئیں اور ان مؤلفین نے ہمارے نبی ﷺ کی نسبت نعوذ باللہ ایسے الفاظ استعمال کیے ۔۔۔۔ تو مجھے ایسی کتابوں اور اخباروں کے پڑھنے سے یہ اندیشہ دل میں پیدا ہوا کہ مبادا مسلمانوں کے دلوں میں جو ایک جوش رکھنے والی قوم ہے ان کلمات کا کوئی سخت اشتعال دینے والا اثر پیدا ہو۔ تب میں نے ان کے جوشوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے صحیح اور پاک نیت سے یہی مناسب سمجھا کہ اس عام جوش کو دبانے کے لیے حکمت عملی یہی ہے کہ ان تحریرات کا کسی قدر سختی سے جواب دیا جائے تا کہ سریع الغضب انسانوں کے جوش فرو ہو جائیں اور ملک میں کوئی بدامنی پیدا نہ ہو"۔ (بحوالہ قادیانیت: مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

انگریز کی قدیم خدمت گزاری

(۲) اور گورنمنٹ پر پوشیدہ نہیں کہ ہم قدیم سے اس کی خدمت کرنے والے اور اس کے ناصح اور خیر خواہوں میں سے ہیں اور ہر ایک وقت پر دلی عزم سے ہم حاضر ہوتے رہے ہیں اور میرا باپ گورنمنٹ کے نزدیک صاحبِ مرتبہ اور قابلِ تحسین تھا اور اس سرکار میں ہماری خدمات نمایاں ہیں اور میں گمان نہیں کرتا کہ یہ گورنمنٹ کبھی ان خدمات کو بھلا دے گی اور میرا والد مرزا غلام مرتضیٰ ابن مرزا عطا محمد رئیس قادیان اس گورنمنٹ کے خیر خواہوں اور مخلصوں میں سے تھا اور اس کے نزدیک صاحب مرتبہ تھا اور صدر نشیں بالیں عزت سمجھا گیا تھا اور یہ گورنمنٹ خوب اس کو پہچانتی تھی اور ہم پر کبھی کوئی بدگمانی نہیں ہوئی، بلکہ ہمارا اخلاص تمام لوگوں کی نظروں میں ثابت ہو گیا اور حکام پر کھل گیا اور سرکار انگریز اپنے ان حکام سے دریافت کر لیوے جو ہماری طرف آئے اور ہم میں رہے اور ہم نے ان کی آنکھوں کے سامنے کیسی زندگی بسر کی اور کس طرح ہم "ہر ایک خدمت میں سبقت کرنے والوں کے گروہ میں رہے ہیں"۔ (نور الحق حصہ اول: ۲۷-۲۸)

حکومت برطانیہ کی تائید و حمایت اور جہاد کی مخالفت

(۳) میری عمر کا اکثر حصہ اس سلطنت انگریزی کی تائید و حمایت میں گزرا ہے اور میں نے مخالفت جہاد اور

انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس (۵۰) الماریاں ان سے بھر سکتی ہیں، میں نے ایسی تمام کتابوں کو عرب ممالک اور مصر اور شام اور کابل اور روم تک پہنچا دیا ہے، میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان سلطنت کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور مہدی خونی اور مسیح خونی کی بے اصل روایتیں اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل جو احمقوں کے دلوں کو خراب کرنے والے ہیں، ان کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔ (تریاق القلوب)

قادیانی جماعت کی جائے پناہ

(۴) "خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت کو بنا دیا ہے ہر امن جو اس سلطنت کے زیر سایہ ہمیں حاصل ہے نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے نہ مدینہ میں"۔ (تریاق القلوب:۲۶ قادیان)

قادیانی کا انگریزوں کا قلعہ و تعویذ ہونا

(۵) مرزا صاحب نے اپنے عربی رسالہ "نور الحق" میں پوری صفائی اور وضاحت کے ساتھ یہاں تک لکھ دیا ہے کہ ان کا وجود انگریزی حکومت کے لیے قلعہ اور تعویذ ہے وہ لکھتا ہے کہ:

"فلی ان ادعی التفرد فی ھٰذہ الخدمات الی ان اقول انی وحید فی ھٰذہ التائیدات ولی ان اقول انی حرزلھا وحصن حافظ من الاٰفات وبشّرنی ربی وقال ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم فلیس للدولۃ نظیری ومثیلی فی نصری وعونی وستعلم الدّولۃ ان کانت من المتوسّمین"

ترجمہ: "مجھے حق ہے کہ میں دعویٰ کروں کہ میں ان خدمات میں منفرد ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں کہوں کہ میں ان تائیدات میں یکتا ہوں اور مجھے حق ہے کہ میں یہ کہوں کہ میں اس حکومت کے لیے تعویذ اور ایسا قلعہ ہوں جو اس کو آفات و مصائب سے محفوظ رکھنے والا ہے اور میرے رب نے مجھے بشارت دی اور فرمایا کہ اللہ ان کو عذاب نہیں دے گا جب تک تم ان میں ہو پس حقیقۃً اس حکومت کے پاس میرا کوئی ہمسر اور نصر و تائید میں میرا کوئی مثیل نہیں اگر خدا نے اس حکومت کو نگاہ اور مردم شناسی عطا کی ہے تو وہ اس کی تصدیق کرے گی۔"

(نور الحق:۲۴)

انگریز کا خود کاشتہ پودا

(۶) مرزا صاحب نے اس درخواست میں جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو ۲۴ فروری ۱۸۹۸ء میں پیش کی تھی یہاں تک لکھا ہے:

"یہ التماس ہے کہ سرکار دولت مدار ایسے خاندان کی نسبت جس کو پچاس سال کے متواتر تجربے سے ایک وفادار جان نثار خاندان ثابت کر چکی اور جس کی نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چٹھیات میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کے خیر خواہ اور خدمت گذار ہے۔ اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت حزم واحتیاط اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابت شدہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت اور مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔" (تبلیغ رسالت جلد ہفتم:۱۹)

قادیانی اور جہاد

(۷) "جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدت کو خدا تعالیٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے حضرت موسیٰ کے وقت میں اس قدر شدت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کیے جاتے تھے، پھر ہمارے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا۔۔۔۔ اور مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔" (اربعین نمبر ۴/ص۱۵حاشیہ)

☆ آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کے ساتھ بند کیا گیا، اب اس کے بعد جو شخص کافر پر تلوار اٹھاتا ہے اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسول کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نافرمانی کرتا ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا تھا کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا ہے۔

(خطبہ الہامیہ مترجم:۲۹-۲۸ و تبلیغ رسالت:۹/۴۷)

☆ اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال — دین کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دین کا امام ہے — دین کے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسمان سے نورِ خدا کا نزول ہے — اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد — منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ:۳۹)

☆ "گورنمنٹ کا یہ اپنا فرض ہے کہ وہ اس فرقہ احمدیہ کی نسبت تدبیر سے زمین کے اندرونی حالات دریافت کرے۔۔۔۔ ہمارے امام (مرزا صاحب) نے ایک بڑا حصہ عمر کا جو بائیس برس ہے، اس تعلیم میں گزارا ہے کہ جہاد

حرام اور قطعاً حرام ہے یہاں تک کہ بہت سی عربی کتابیں بھی مضمون ممانعت جہاد میں لکھ کر ان کو بلادِ اسلام عرب شام، کابل وغیرہ میں تقسیم کیا"۔ (رسالہ ریویو آف ریلیجز، مولوی محمد علی قادیانی بابت ۱۹۰۲ جلد ۲،۱)

☆ "یہ وہ فرقہ ہے جو فرقہ احمدیہ کے نام سے مشہور ہے۔۔۔۔۔یہی وہ فرقہ ہے جو دن رات کوشش کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے خیالات میں سے جہاد کی بے ہودہ رسم کو اٹھادے"۔

☆ "میں یقین رکھتا ہوں کہ جیسے جیسے میرے مرید بڑھیں گے ویسے ویسے مسئلہ جہاد کے معتقد کم ہوتے جائیں گے کیونکہ مجھے مسیح اور مہدی مان لیناہی مسئلہ جہاد کا انکار کرتا ہے۔" (دیکھیے تبلیغ رسالت:۷/۱۷۰)

مرزا غلام کا مکتوب بنام ملکۂ برطانیہ

۱۸۹۴ء میں مرزا غلام قادیانی نے برطانیہ کی ملکۂ معظمہ قیصرہ ہند کو جو مکتوب نامہ اپنی وفاداری جتانے کے لیے لکھا اس کا مضمون اور الفاظ درج ذیل ہیں:

"یہ عاجز (یعنی مرزا غلام قادیانی) دنیا کے مشغلوں سے علیحدہ ہو کر خدا تعالیٰ کی طرف مشغول ہوا اور مجھے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار کے قریب کتابیں رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک میں اور دوسرے بلادِ اسلامیہ میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی محسن ہے، لہٰذا ہر مسلمان کا یہ فرض ہو چکا ہے کہ اس گورنمنٹ کی سچی اطاعت اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو فارسی اور عربی زبان میں تالیف کر کے اسلام کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں یہاں تک اسلام کے دو مقدّس شہروں مکہ اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں۔
اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ بلادِ شام، مصر، کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا اشاعت کر دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیال چھوڑ دیے جو نافہم ملاؤں کی تعلیم سے ان کے دلوں میں تھے، یہ ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان نہیں دکھلا سکے گا۔ (ستارۂ قیصریہ:۳)

ساٹھ برس کی عمر تک اہم کام

"میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں اپنی زبان اور قلم سے اس اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور ان کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں جو ان کو دلی صفائی اور مخلصانہ

تعلقات سے روکتے ہیں۔" (تبلیغ رسالت:۷/۱۰)

یہ چند حوالے غلام قادیانی کے ذہن کی پوری عکاسی کے لیے کافی ہیں۔ اس کا یہ دعویٰ نبوت اور کردار اس قدر بدبودار اور مجروح تھا کہ اس کو دیکھ کر ایسے شخص کو ایک مجدّد مہدی و مصلح وغیرہ جیسے نام سے پکارنا تو کجا ایک اچھے مسلمان کہلانے کا بھی وہ لائق نہ تھا، اس نے جو پیشنگوئیاں کیں وہ اس کے دعوائے نبوت اور مجدّدیت، مہدیت کی تردید کے لیے کافی تھیں، اس کا جھوٹ ہونا اس قدر واضح تھا جیسا کہ دوپہر کا سورج، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ میں مسیح موعود ہوں اور اس کے لیے اس نے جو تاویلیں کیں اور جو کرتوت کیے وہ اس قدر بے ہودہ ہیں کہ ان کے جواب کی بھی ضرورت نہیں ان کو پڑھ کر ایک سادہ مسلمان بھی سمجھ جاتا ہے کہ یہ تو صاف جھوٹ اور بے ایمانی ہے، لیکن انگریز نے اپنے سایہ میں اسے پروان چڑھنے کا موقع دے دیا اور اس کے قبول کرنے والوں پر بے جا نوازشات کے دروازے کھول دیے، کسی قابلیت کے بغیر ان کو اچھی ملازمتیں دے دیں، اس طرح مختلف طریقوں سے آگے بڑھنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا۔

مگر انگریز اور اس کے وفاداروں کو یہ معلوم نہ تھا کہ مخلص مسلمانوں کا ورغلانہ اتنا آسان نہیں، چونکہ عقیدۂ ختمِ نبوت ایک متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے اس لیے علمائے اسلام نے بالاتفاق غلام قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا ہے۔

سلسلۂ نبوت آپ ﷺ پر تکمیل واختتام کو پہنچا

سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہر قوم میں الگ الگ پیغمبر آئے تھے اور ان کے فروعی مسائل میں ترمیم اور تکمیل ہوتی رہی۔ پہلے انبیا علیہم السلام کے زمانوں میں قومیں علیحدہ علیحدہ تھیں، ان کے درمیان زیادہ میل جول نہ تھا، زیادہ سے زیادہ گھوڑوں اور اونٹوں کے ذریعے طویل مسافتیں طے کر کے ایک دوسرے سے مل سکتے تھے، اس لیے وہ ایک دوسرے سے ناآشنا رہتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے، ان کے درمیان کوئی مضبوط رابطہ نہ تھا۔ پہلی شریعتوں کے جزوی مسائل میں ترمیم و تبدیلی کی وجہ شاید یہی وقت و حالات کی ضرورت تھی، لوگوں کے حالات اور ضرورتوں کے مطابق بندشوں میں کمی زیادتی ہوتی رہی۔

اس لیے انبیا علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبیوں سے اپنی اپنی امتوں کو خبردار کرتے رہے مثلاً یہاں صرف عیسیٰ علیہ السلام جو کہ خاتم الانبیا رسول اللہ ﷺ سے پہلے دنیا میں تشریف لائے اور آپ ﷺ کے متعلق پیشگوئی کی ان کے ارشاد کو نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ:

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روحِ حق ① آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا اور پھر اجلال ظاہر کرے گا"۔ (انجیل یوحنا، ۱۶ باب: ۱۴-۱۲)

غرض ابتدا سے جیسے جیسے ایک طرف عام انسان کا عقل و شعور اور تجربہ بڑھتا جارہا تھا اور ان کے حالات اور وقت کی ضرورتوں کے لحاظ سے دینِ اسلام اور دین حق میں نہیں، بلکہ جزوی، فروعی مسائل میں تبدیلی ہوتی رہی اور اس طرح انسانیت کے حالات و تقاضے ایک نقطہ پر پہنچتے رہے تو ویسے ویسے دوسری طرف مختلف قوموں میں روابط، تعلقات اور میل جول بڑھتا گیا یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جو کہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ اس وقت عام انسانی عقل و شعور بھی سن بلوغ کو پہنچ گیا۔

اور اقوامِ عالم بھی بتدریج ایک دوسرے سے سخت تیزی کے ساتھ متعارف ہونے لگیں اور جو دوری اور جدائی قوموں اور ملکوں میں پائی جاتی تھی آہستہ آہستہ کم ہوتی چلی گئی اور اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم تھا کہ اب بہت جلد دور والے قریب ہو جائیں گے، زمین کی مسافتیں سمٹ کر سالوں کا سفر چند گھنٹوں میں ہو سکے گا اور مغرب میں تقریر کرنے والے کی تقریر مشرق میں بآسانی سنائی دے گی جیسا کہ اس کے متعلق آپ ﷺ نے پہلے پیشگوئی بھی فرمائی تھی۔

تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ نے جس عظیم ہستی اور اپنے پیارے محبوب مخلوق اور بندے کو (جن کو پہلے ہی سے اس کام کے لیے مقرر اور مامور کیا تھا اور اس کے لیے یہ پہلے سے مقدر فرمایا تھا اس کو) تمام دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لوگوں کے لیے نبی اور پیغمبر بنا کر بھیجا اور اسی پر سلسلۂ نبوت کی تکمیل کر کے اس پر نازل کی ہوئی کتاب اور شریعت کی حفاظت کا وعدہ فرمایا اور اس کی تبلیغ کی ذمہ داری خاتم الانبیا سید المرسلین کے کندھوں پہ ڈال دی تا کہ ساری دنیا اس آخری نبی کی پیروی پر جمع ہو جائے اب آپ دیکھ لیں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے بعد بکھری ہوئی دنیا کو کس طرح ایک کر دیا ہے اور کر رہے ہیں، نیز آپ ﷺ کی تعلیم اور ہدایت کی حفاظت کی ہے، کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور اس کی نشر و اشاعت کے لیے مختلف شکلوں میں اسباب اور سامان مہیا کر دیا اور کر رہے ہیں۔
اس صورتِ حال کو دیکھ کر ایک سلیم الطبع اور عقلِ سلیم رکھنے والا انسان از خود اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے بعد نہ کسی نبی کی ضرورت باقی رہی اور نہ کسی دوسری آسمانی کتاب کی۔

---

① مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دہریت سے اسلام تک"

بلکہ یہ ایک ایسا فضول اور فالتو کام ہو گا جیسا کہ کوئی دوپہر کے چڑھتے ہوئے سورج کے سامنے چراغ سے روشنی حاصل کرنے کی حماقت کرتا ہو۔ اللہ تعالیٰ شانہ علیم، خبیر، قدیر و حکیم ذات جو ہر قسم کے عیب سے پاک ہے کوئی بھی فضول اور فالتو کام نہیں کرتا۔

ختمِ نبوت کے دلائل

اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نبوت کو محمد ﷺ پر ختم کرنے کو قرآن مجید میں مختلف انداز میں ایسے بلیغ اسالیب میں بیان فرمایا ہے جو بیک وقت دل و دماغ کو پوری طرح یہ اپیل کرتے ہیں کہ یقیناً آپ ﷺ کو پوری دنیا اور قیامت تک کے لوگوں کے لیے ایسا کامل و مکمل نبی بنا کر بھیجا گیا ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کو مبعوث کیا جائے گا اور نہ کسی نبی کو مبعوث کرنے کی ذرہ برابر ضرورت ہے۔

آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہے

آپ ﷺ کی نبوت قیامت تک کے لوگوں کے لیے ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(۱) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

”اے لوگو اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور ان لوگوں کو (بھی پیدا کیا ہے) جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ“۔(بقرہ:۲۱)

(۲) يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ

”اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے۔“(نساء:۱)

(۳) قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴۹﴾

”کہہ دو (اے پیغمبر) اے لوگو میں تو صرف تمہیں صاف صاف ڈرانے (اور خبردار کرنے) والا ہوں۔“ (حج:۴۹)

یہ چند آیاتِ کریمہ بطورِ نمونہ پیش کی گئیں جن میں قرآن مجید کا خطاب اور آپ ﷺ کے ذریعے جو خطاب کرایا جاتا ہے وہ کسی خاص قوم یا خاص جماعت سے نہیں بلکہ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ”اے لوگو“ یعنی تمام لوگوں کے ساتھ ہے جبکہ آپ ﷺ سے قبل جس قدر انبیاء علیہم السلام گذر چکے ہیں ان سب کا خطاب اپنی اپنی قوم سے تھا۔

قرآن مجید ہی میں دیکھیے! وہ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی دعوت الی اللہ کے حدود اپنی اپنی قوم یا ایک خاص علاقے کی حد تک محدود بتلاتا ہے۔

مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"بے شک ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا تو اس نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔" (اعراف:۵۹)

اور حضرت ہود علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں:

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

"اور (اسی طرح) قوم عاد کی طرف اس کے (وطن اور قوم کا) بھائی ھود کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا اس نے (اپنی قوم سے) کہا اے میری قوم (صرف) اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی (بھی) معبود (بنانے کے لائق) نہیں۔" (اعراف:٦٥)

اور حضرت صالح علیہ السلام کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"اور (اسی طرح) قوم ثمود کی طرف اس کے (وطن اور قوم کا) بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، اس نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم (صرف) اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی (بھی) معبود نہیں۔" (اعراف:۷۳)

اور حضرت شعیب علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا

"اور اہل مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔" (اعراف:۸۵)

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ﴿٦٩﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٠﴾

"اور (اے نبی) آپ انہیں (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کا قصہ سنا دیں جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا یہ تم کس چیز کی عبادت کرتے ہو؟" (الشعراء:٦٩-٧٠)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

"اسی طرح ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت (کا ذریعہ) بنایا۔" (اسراء:۲)

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم بنی اسرائیل کو فرماتے ہیں:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے میری قوم اللہ (تعالیٰ) کی نعمت (اور اس کا احسان) اپنے اوپر یاد کرو۔" (مائدہ:۲۰)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے کہ:

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

"اور اسے بنی اسرائیل کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔" (آل عمران:۴۹)

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف اپنی قوم بنی اسرائیل سے خطاب فرماتے ہیں کہ:

وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ

"اور مسیح نے کہا! اے بنی اسرائیل اللہ تعالیٰ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا (یعنی سب کا) پروردگار ہے"۔ (مائدہ:۷۲)

اور اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیا علیہم السلام کی نبوت کی حدود کو ذکر کر کے بیان فرماتے ہیں کہ:

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ

"بلاشبہ ہم نے آپ سے پہلے پیغمبروں کو اپنی اپنی قوم کی طرف (پیغمبر بنا کر) بھیجا ہے۔" (روم:۴۷)

اور یہ بات صرف قرآن مجید ہی نہیں کرتا، بلکہ جو کتاب "کتاب مقدّس" کے نام سے بائبل سوسائٹی چھاپتی ہے جس کی تحریف سے پوری دنیا آشنا ہے اور جس میں موجود کتابوں کو دیکھ کر ایک سلیم الطبع اور سلیم العقل انسان خود اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں بلکہ بعد کے لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام یا دوسرے انبیا علیہم السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ کی باتوں کو لکھا ہے جس کی حیثیت تاریخ سے زیادہ نہیں ہے۔

پھر بھی اس کتاب میں بہت سے حوالے ایسے ملتے ہیں جن سے یہ بات اچھی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیا علیہم السلام گذرے ہیں سب کے سب خاص وقت اور خاص قوموں اور علاقوں کے لیے تھے۔ مثلاً تورات کے حصہ احبار میں دیکھیے:

"اور خداوند نے موسیٰ سے کہا: بنی اسرائیل سے کہو کہ تم لوگ نہ تو بیل اور نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی

کھانا۔"(احبار: باب ۷، ص ۲۲-۲۳)

یہاں بیل اور بھیڑ بکری کی چربی کی ممانعت کا حکم صرف بنی اسرائیل تک محدود بتلایا جاتا ہے۔

اور برمیاہ میں ہے:

"اے اسرائیل کے گھرانے وہ کلام جو خداوند تم سے کرتا ہے سنو، خداوند یوں فرماتا ہے۔"
(برمیاہ: ۱۰ باب، ۴)

اور حزقیل میں ہے:

"پھر اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد! تو بنی اسرائیل کے پاس جا اور میری باتیں ان سے کہہ۔"
(حزقیل: ۳ باب، ۴)

اور حضرت عیسی علیہ السلام اپنے شاگردوں کو ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

"میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔"
(متی: ۱۵ باب، ۲۴)

اسی طرح پہلی تحریف شدہ آسمانی کتابوں میں بہت سے حوالے ملتے ہیں اور قرآن مجید میں بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جس قدر انبیا علیہم السلام گذر چکے ہیں وہ سب کے سب خاص خاص قوموں، علاقوں اور خاص خاص زمانوں کے لیے آئے تھے، یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے پوری دنیا کے لیے اور آخر تک کے انسان کے لیے پیغمبرِ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

جیسا کہ اس کی پوری وضاحت بھی قرآن مجید ہی میں موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

"کہہ دو (اے پیغمبر یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" (اعراف: ۱۵۸)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

"اور (اے پیغمبر) ہم نے آپ کو تو سارے ہی انسانوں کے لیے بشیر و نذیر (یعنی پیغمبر) بنا کر بھیجا ہے۔"
(سبا: ۲۸)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

بُعِثْتُ اِلَى الْاَحْمَرِ وَالْاَسْوَدِ

"میں گورے اور کالے سب کی طرف (پیغمبر بناکر) بھیجا گیا ہوں۔" (مسند احمد ابو موسیٰ اشعری)

نیز فرماتے ہیں:

وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّةً

"اور میں تمام مخلوقات کی طرف رسول بناکر بھیجا گیا ہوں۔" (مسلم)

اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

وَ کَانَ النَّبِیُّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَی النَّاسِ عَامَّةً

"مجھ سے پہلے ہر نبی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام لوگوں کے لیے بھیجا گیا ہوں"۔ (بخاری و مسلم)

آپ ﷺ کی نبوت کو عام و تام اور دینِ اسلام کو کامل و مکمل اور محفوظ کرنے کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہ رہی

اگرچہ مذکورہ بالا چند آیاتِ کریمہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہیں کہ آپ ﷺ کی نبوت پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے انسانوں اور جنات کے لیے ہے جس کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں، تاہم اس مسئلہ کو دوسرے انداز میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔

آپ ﷺ پر دین کو کامل و مکمل کر دیا گیا ہے تاکہ آئندہ کسی بھی نبی کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا

"آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا، اور میں نے تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا۔" (مائدہ:۳)

اس آیتِ کریمہ میں یہ بتلادیا گیا ہے کہ دینِ اسلام ہی ہے جو ہر جہت اور ہر حیثیت سے کامل اور مکمل ہو گیا ہے، جس میں نہ ترمیم کی گنجائش ہے اور نہ اضافہ و نقصان کی اور نہ اس کے بعد کسی نئے دین کی ضرورت ہے۔

یہ آیت عرفات کے دن حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی ہے۔ بعض ذہین یہودی علما جو قدیم مذاہب کی تاریخ سے واقف تھے بھانپ گئے کہ یہ تو وہ اعزاز ہے جو تنہا مسلمانوں کو بخشا گیا ہے اور یہ اسلام کا طرۂ امتیاز ہے جس میں کوئی دوسرا مذہب و ملت شریک نہیں، اس لیے انہوں نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن

خطاب سے کہا کہ اے امیر المؤمنین آپ اپنی کتاب میں ایک ایسی آیت تلاوت کرتے ہیں جو اگر یہود پر نازل ہوئی ہوتی تو اس روز عید مناتے۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ آیت کہاں اور کب نازل ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کہاں تشریف فرما تھے، وہ عرفات کا دن تھا [1] جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں کسی نئے جشن کی ضرورت نہیں، وہ دن خود عید کا دن تھا اور اسلام بڑے بڑے واقعات پر دوسرے مذاہب کی طرح جشن و عید منانے کا دین نہیں ہے۔

اس سے اس بات کی وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ سلسلۂ نبوت بھی حد تکمیل کو پہنچ کر دروازہ نبوت بند ہو گیا تاہم اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا وعدہ کیا اور بارِ تبلیغ امت کے ذمہ ڈال کر پوری دنیا پر واضح کر دیا کہ ہر قسم کی نبوت کا دروازہ بند ہو گیا، اس کی کوئی ضرورت نہ رہی۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

"ہم نے یہ نصیحت اتاری ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کی (ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے) حفاظت کرنے والے ہیں"۔ (حجر:۹)

اشاعتِ دین اور دعوت و تبلیغ کے متعلق فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت اور اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔" (ال عمران:۱۱۰)

مذکورہ بالا آیات سے جس طرح یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے انسانوں اور جنات کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نئے نبی کی ضرورت نہیں رہی، اسی طرح ان سے یہ بات بھی اچھی طرح ثابت ہو گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر کے رحمت کو ختم نہیں کیا گیا، بلکہ نبوت اور دین کو کامل و مکمل اور عام تام کر کے رحمت کو بھی عام اور تام کر دیا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں کہ رات کی تاریکی میں لوگ مختلف چیزوں سے روشنی حاصل کرتے ہیں تارے بھی

---

[1] بخاری کتاب التفسیر

ہوتے ہیں، چاند بھی، چراغ وغیرہ بھی، لیکن جب سورج کی روشنی پھیل جاتی ہے تو اس کے بعد نہ چاند تاروں وغیرہ جیسی چیزوں کی روشنی سورج کی روشنی کی وجہ سے دکھائی دیتی ہے اور نہ ان چیزوں سے چڑھتی دھوپ میں روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

تو جس طرح سورج کی روشنی کو ختم نہیں کیا، بلکہ روشنی کو کامل اور مکمل کر کے روشنی کو عام اور تام کیا۔ اسی طرح آپ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کو کامل و مکمل کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور نعمت کو عام اور تام کر دیا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کے متعلق یوں ارشاد فرماتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٧﴾

"اور (اے محمد ﷺ) ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی (بنا کر) بھیجا ہے۔" (انبیاء:١٠٧)

اور قرآن مجید کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٧﴾

"یہ تو تمام جہانوں کے لیے نصیحت ہے۔" (ص:٨٧)

قرآن مجید سے یہ بھی معلوم ہے کہ اجمالی طور پر ایمان صرف انہی انبیا علیہم السلام پر رکھنا ہو گا جو آپ ﷺ سے پہلے گذر چکے ہیں

ختمِ نبوت کو مختلف اسلوب میں پیش کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآن مجید نے آپ ﷺ سے پہلے انبیا علیہم السلام اور پہلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کو مقید اور مشروط کیا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نبوت اور رسالت اسلام کے ان بنیادی عقائد میں سے ہے جن کو ماننے یا نہ ماننے پر آدمی مؤمن یا کافر ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اگر نبی ہے تو اس کی نبوت کو نہ ماننے والا کافر ہے اور اگر وہ نبی نہیں ہے پھر بھی اس کو نبی مان لے تو بھی کافر ہو جائے گا، تو جو ابدی کتاب یعنی قرآن مجید جو حق کو باطل سے الگ کرنے والا ہے اور جس نے دین کے اصول میں سے کسی اصل کو نظر انداز نہیں کیا ہے جس پر دین و دنیا کی فلاح و سعادت اور نجات موقوف ہے اس کے لیے ایسے نازک معاملہ میں سکوت اور خاموشی تو درکنار کسی گول مول اور مبہم بات کا بھی کوئی موقع نہ تھا، بلکہ بعد میں آنے والے انبیا پر ایمان لانے کا مسئلہ گذرے ہوئے انبیا پر ایمان لانے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے تاکہ آنے والی نسلیں آئندہ آنے والے انبیا کی اتباع اور ان کی تعلیمات سے محروم نہ رہیں جیسا کہ تقریباً ہر پیغمبر اور رسول نے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشگوئی کی۔

قرآن مجید ہی کو دیکھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد آنے والے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو پیشگوئی کی تھی اس کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

"اور جب عیسیٰ بن مریم نے کہا اے بنی اسرائیل بلاشبہ میں تمہاری طرف اللہ تعالیٰ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں تورات جو مجھ سے پہلے ہے اس کی تصدیق (یعنی سچا ثابت) کرنے والا ہوں اور ایک رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہو گا جب وہ (یعنی احمد مرسل محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے پاس واضح دلیلیں لے کر آگئے تو کہنے لگے یہ تو صریح جادو ہے۔" (صف:٦)

اس وقت کی انجیلوں میں صراحت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "محمد" اور "احمد" موجود ہے جیسا کہ اس کی وضاحت کتاب "دہریت سے اسلام تک" میں کر چکا ہوں۔ یہاں صرف اتنا لکھ دیتا ہوں کہ اس وقت کی انجیلوں میں صراحت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام موجود نہ ہوتا تو بنی اسرائیل اور یہودیوں کو اسلام اور قرآن مجید کے خلاف زبردست ہتھیار اور دلیل ہاتھ آجاتی اور وہ جواب میں کہہ دیتے کہ کہاں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام "احمد" یا "محمد" لیکن اس زمانے میں چونکہ انجیلوں میں یہ سب کچھ موجود تھا اس لیے انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا، بلکہ جادوگر وغیرہ کہہ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی تعلیمات کا انکار کر دیا۔

قرآن مجید ہی میں نہیں، بلکہ یہود و نصاریٰ کی موجودہ کتاب مقدّس بائبل جس میں سخت تحریف و تبدیلی ہوئی ہے اس میں بھی تورات سے لے کر انجیل تک جتنی کتابیں اور رسائل موجود ہیں ان میں بھی آنے والے نبیوں کی پیشگوئیاں موجود ہیں تاکہ آئندہ نسلیں ان پر ایمان لائیں اور ان کا کہنا مان کر چلیں یہاں موجود بائبل سے بطورِ نمونہ چند حوالے نقل کرتا ہوں:

١.... حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ (استثناء:١٨باب،١٧)

٢.... اور یسعیا علیہ السلام کی پیشگوئیوں میں ہے کہ:

"دشت دریا کی بابت بارِ نبوت   عرب کی بابت بارِ نبوت۔" (یسعیا:٢٠باب،١)

۳...."اے دوانیوں کے قافلو تم عرب جنگل میں رات کاٹو گے تیما کی سرزمین کے باشندے روٹی لے کر بھاگنے والے سے ملنے کو نکلے۔(یسعیا:۲۱باب،۱۳-۱۴)

۴.... حضرت عیسیٰ علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی اطلاع دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"
(یوحنا:۱۴باب،۳۰)

ان چند حوالوں سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوئی کہ پہلے انبیا علیہم السلام بعد میں آنے والے انبیا علیہم السلام کے بارے میں بتلاتے تھے اور صرف یہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ انبیا علیہم السلام سے بعد میں آنے والے انبیا علیہم السلام کی ضروری تفصیل بیان کرتے تھے اور پھر وہ اپنی اپنی امتوں کو اس سے خبر دار کرتے تھے، لیکن قرآن مجید جو کہ ابدی اور حق وباطل کو ایک دوسرے سے پوری طرح الگ کر دینے والی اور قیامت تک کے لیے پوری دنیا کی رہنمائی کرنے والی ایسی کتاب ہے جس کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود کر لیا ہے جو اصولی طور پر جامع کامل اور مکمل ہے جو یاجوج ماجوج اور آخیر زمانے والے دوسرے حوادث تک کی پیشگوئی کرتا ہے، کسی نئے نبی اور کسی طرح نئی نبوت اور کسی قسم کی نبوت کی پیشگوئی تو درکنار، اس کی تردید کرتا ہے، وہ پہلے گزرے ہوئے انبیا علیہم السلام، گذشتہ وحی اور سلسلۂ نبوت پر ایمان لانے پر بہت سختی سے زور دیتا ہے اور اس کو سخت ضروری قرار دے کر مضمون کو ختم کر دیتا ہے تاکہ بعد میں آنے والے نئے نبی پر ایمان لانے کے راستے بند ہو جائیں۔

اب اس کے متعلق چند آیتوں کو پڑھ لیجیے جن میں صرف گذشتہ وحی اور سلسلہ نبوت پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔

۱.... وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۵﴾

"اور بلاشبہ آپ کی طرف اور آپ سے پہلے پیغمبروں کی طرف وحی کی گئی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو ضرور تمہارے (تمام) اعمال برباد ہو جائیں گے اور تم یقیناً زیاں کاروں میں سے ہو جاؤ گے۔" (زمر:۶۵)

۲.... يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ

"اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل

فرمائی ہے اور اس کتاب پر جو (اللہ تعالیٰ نے اس سے) پہلے نازل کی تھی۔" (النساء:۱۳۶)

۳.... لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

"لیکن ان میں سے جو علم میں پختہ ہیں اور مسلمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو تجھ پر نازل ہوا اور اس پر (ایمان لاتے ہیں) جو آپ سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔" (النساء:۱۶۲)

۴.... قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۵۹﴾

"کہہ دو اے اہلِ کتاب تم ہم سے اسی بات کا بدلہ لیتے ہو کہ ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے ہیں اور اس (تعلیمِ دین) پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے اور اس پر جو (اس پیغمبر اور کتاب یعنی قرآن مجید سے) پہلے بھیجی جا چکی ہے اور بلاشبہ تم میں اکثر لوگ فاسق (نافرمان) ہیں۔" (مائدہ:۵۹)

۵.... وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾

"اور وہ جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل کیا گیا ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کیا جا چکا ہے اور آخرت پر بھی وہ یقین کرتے ہیں وہی لوگ اپنے پروردگار کے راستے پر ہیں اور وہی لوگ فلاح و نجات پانے والے ہیں۔"

(بقرہ:۴-۵)

مذکورہ بالا آیتوں میں کس انداز سے عقیدۂ ختمِ نبوت کو ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ساری آیتیں یہی بتلاتی ہیں کہ اگر سلسلۂ نبوت کسی درجہ میں بھی جاری ہوتا اور آپ ﷺ کے بعد بھی وحی نازل ہوتی اور اس پر ایمان لانا ضروری ہوتا تو ان آیتوں میں وحی، اس پر ایمان اور نجات، فلاح اور کامیابی کو آپ ﷺ اور آپ ﷺ سے پہلے پیغمبروں اور کتابوں کے ساتھ مقیّد اور مشروط نہ کر لیا جاتا، بلکہ قبل کے ساتھ بعد کا یعنی پہلوں کے ساتھ بعد میں آنے والوں پر ایمان لانے کی تاکید بھی فرماتے۔

لیکن چونکہ نبوت پایہ تکمیل تک پہنچ گئی اور کسی نئی وحی اور نبوت کی ضرورت ہی باقی نہ رہی اور نہ کسی نئے نبی نے آنا ہے اس لئے بعدُ کے لفظ کو چھوڑ دیا گیا تاکہ کسی مکّار اور دجّال کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ لوگوں سے کہتا پھرے کہ میری نبوت پر ایمان لاؤ، ورنہ فلاح نہ پا سکو گے۔

آپ ﷺ اور قیامت کے درمیان کوئی نئی نبوت اور نیا نبی نہیں آسکتا

بلکہ قرآن مجید تو یہ بتلاتا ہے کہ قیامت اور آپ ﷺ کے درمیان کسی نئی نبوت اور کسی نئے نبی کی گنجائش ہی نہیں چنانچہ مذکورہ بالا آیتوں میں سے صرف آخری آیت پڑھ لیجیے اس میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (بقرہ:۵)

یہاں آپ ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لانے اور اس سے پہلوں پر ایمان لانے اور آخرت پر ایمان لانے کو ذکر کرکے یہ اشارہ دے دیا کہ بس آپ ﷺ کے بعد قیامت ہی ہے یعنی قیامت تک پھر کوئی نئی نبوت اور نیا نبی نہیں آئے گا۔

نیز اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتے ہیں:

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ ۚ

"لوگوں کے حساب کا وقت قریب آگیا (یعنی آپ ﷺ کی بعثت قُربِ قیامت کی علامت ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا) اور وہ غفلت میں منہ پھیرے ہوئے ہیں۔" (الانبیاء:۱)

اسی بات کی وضاحت آپ ﷺ نے دو انگلیاں اٹھا کر ان الفاظ میں کی:

بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ

"(میں ایسے وقت میں بھیجا گیا ہوں کہ) میں اور قیامت ان دو انگلیوں کی طرح ہیں۔" (صحیح بخاری)

یعنی جس طرح ان دو انگلیوں کے درمیان کوئی حائل اور تیسری انگلی نہیں، اسی طرح میرے اور قیامت کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جائے گا اور پھر بعثت قیامت تک کے لیے صرف ایک قوم اور خطہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ پوری دنیا کے لوگوں کے لیے ہے اور پوری دنیا کی نجات و فلاح صرف آپ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی اتباع ہی میں منحصر ہے اور منحصر ہوگی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

"کہدیجیے! اے لوگو میں تم سب کے لیے اللہ تعالیٰ کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی

بادشاہی ہے اس کے سوا کوئی اور بندگی کے لائق نہیں وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے پس ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ پر اور اس کے رسول اُمیّ پر جو اللہ تعالیٰ اور اس کی تمام باتوں پر ایمان ویقین رکھتے ہیں اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت یافتہ ہو جاؤ۔" (اعراف:۱۵۸)

تحریف شدہ بائبل سوسائٹی کی نشر کردہ موجودہ انجیل میں بھی آپ ﷺ پر ختم نبوت اور آپ ﷺ کی ابدی رسالت ونبوت کا ذکر موجود ہے

قرآن مجید اور احادیث نے تو ختم نبوت کے عقیدے کو مختلف انداز میں اس قدر صاف ستھرا بیان فرمایا ہے جس کے بعد کسی قسم کی نبوت کی گنجائش باقی نہیں رہتی، لیکن اس کے علاوہ پہلی آسمانی کتابوں میں بہت بڑی بھاری تحریف وتبدیلی کے بعد بھی ایسے اشارے، بلکہ صراحت موجود ہے کہ آپ ﷺ کی تعلیمات ابدی ہوں گی اور پوری دنیا کے لیے ہوں گی۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔"
(یوحنا:۱۶ باب، ۱۶)

اور اسی باب میں آگے چل کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد یوں نقل کیا گیا ہے:

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"
(یوحنا:۱۶ باب، آیت ۳۰)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری یوحنا عارف اپنے مکاشفہ میں کہتے ہیں:

"پھر میں نے ایک اور فرشتے کو آسمان کے بیچ میں اڑتے ہوئے دیکھا جس کے پاس زمین کے رہنے والوں کی ہر قوم اور ہر قبیلہ اور اہل زبان اور امت کے سنانے کے لیے ابدی خوشخبری تھی اور اس نے بڑی آواز سے کہا کہ خدا سے ڈرو اور اس کی تحمید کرو کیونکہ اس کی عدالت کا وقت آپہنچا ہے اور اس کی عبادت کرو جس نے آسمان اور زمین اور سمندر اور پانی کے چشمے پیدا کیے۔" (مکاشفہ:۱۴ باب، آیت ۷-۶)

قرآن مجید نے ختم نبوت کے بارے میں ذرہ برابر تردُّد بھی رہنے نہیں دیا

غور فرمایئے! مذکورہ بالا چند آیتیں اور چند اسلوب کے ساتھ ختم نبوت کا جو بیان کیا گیا وہ ختم نبوت کے لیے کافی وشافی تھا لیکن اللہ تعالیٰ اس بنیادی عقیدہ کی پوری اور مزید وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد فرماتے

ہیں:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

"محمد تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔" (احزاب ۴۰)

خاتَم تاء کے زبر کے ساتھ ہو یا زیر کے ساتھ دونوں صورتوں میں لغت کی تصریحات کے مطابق اس کا مفہوم اور مطلب آخری اور بند ہونے کا ہے اور یہی مفہوم پیغمبر، قرآن مجید اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے لیا ہے۔

لیکن باطل کا طرز و طریقہ یہ چلا آرہا ہے کہ وہ پوری کتاب اور صاحبِ کتاب کی تشریح اور تصریح سے آنکھیں بند کر کے کسی لفظ کو اپنے من مانے معنی پہنانے کی جسارت کرتا ہے یا عبارت کو آگے پیچھے کر کے یا کانٹ چھانٹ، توڑ مروڑ کر لوگوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔

یہاں بھی مرزائیوں نے جب دیکھا کہ خاتم (تاء کے زبر کے ساتھ) کے معنی لغت میں طبع یعنی مہر بھی ہے تو انہوں نے اس سے ڈاک کی مہر مراد لی جو تصدیق و تائید کے لیے لگائی جاتی ہے اور پھر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس آیتِ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انبیا کی نبوت پر مہر لگانے والے ہیں جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مہر لگا دی یعنی جس کی نبوت کی تصدیق کی تو صرف اسی کو نبوت ملے گی اور جس پر مہر نہ لگی وہ منصبِ نبوت پر فائز ہو نہیں سکتا۔

حالانکہ یہ ایسا بے ہودہ اور بالکل غلط معنی ہے کہ کوئی تھوڑا سا عربی جاننے والا بھی یہ حماقت ہرگز نہیں کر سکے گا کہ وہ اس (یعنی مہر) سے مراد تائید و تصدیق کے معنی لے لے کیونکہ طبع یعنی "مہر" کا جو مفہوم اہلِ لغت نے لیا ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہے۔ اہلِ لغت اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ "کسی چیز پر مہر لگا کر اس کو اس طرح بند کیا جائے کہ نہ اس کے اندر کی چیز باہر نکل سکے اور نہ باہر کی چیز اس کے اندر جا سکے۔" [1]

یہ وہ مہر ہے جو لوہے یا چاندی وغیرہ کو پگھلا کر تھیلی یا صندوق وغیرہ کو بند کر کے اس پر لگا دی جاتی ہے چونکہ یہ عمل سب سے آخر میں کیا جاتا ہے اس لیے اہلِ لغت خاتَم تاء کے زبر کے ساتھ کے معنی "انتہا، آخر اور ختم کرنے" کے بھی کر دیتے ہیں۔

اس کا یہی معنی خود قرآن مجید نے بھی بیان فرمایا ہے چنانچہ قرآن مجید کافروں کے متعلق بیان فرماتا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰۤى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَاۤ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۶۵﴾

"آج (یعنی قیامت کے دن) ہم ان (کافروں) کے منہ (کو بند کر کے ان) پر مہر لگا دیں گے (یعنی ان کی

---

[1] دیکھیے لسان العرب وغیرہ۔

زبانیں بند ہو جائیں گی)اور ہمارے ساتھ ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں شہادت دیں گے اس پر جو(کرتوت)وہ کیا کرتے تھے۔"(یٰسین:۶۵)

اور کفار ہی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ

"اللہ تعالیٰ نے ان(کافروں)کے دلوں پر مہر لگادی ہے(یعنی ان کے دلوں کے دروازوں کو بند کر کے ان پر مہر لگادی ہے کہ ہدایت اور نصیحت کی جو باتیں وہ سنتے ہیں وہ ان کے دلوں کے اندر گھس نہیں سکتیں)۔"(بقرہ:۷)

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ مَّخْتُوْمٍ ﴿٢٥﴾ خِتٰمُهٗ مِسْكٌ

"ان(جنتیوں)کو خالص سربمہر شراب پلائی جائے گی اس کی مہر مشک ہو گی۔"(تطفیف:۲۵-۲۶)

خلاصہ یہ ہوا کہ لغت کی تصریحات، قرآن مجید کی آیتوں، حدیثوں(جن کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آجائے گا)اور مسلمانوں نے جو اجماعی مفہوم لیا اس سے بھی یہی بات بالیقین ثابت ہے کہ لفظ خاتم کے عمومی اور مشترک معنی کسی چیز کے بند کرنے کے ہیں جس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں جس قدر انبیا علیہم السلام مقدر تھے، ان سب کو پہلے مبعوث فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے آخر میں بھیجا اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مقدر تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام تعلیمات اور انعامات کو پورا کر کے دروازہ نبوت کو بند کر دیں تو مذکورہ بالا آیتِ کریمہ میں یہی بتلایا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ کو بند کر کے اس پر مہر لگانے والے آخری نبی اور رسول ہیں۔ آپ کے بعد آئندہ کوئی نیا شخص نبی بن کر نہیں آئے گا اور نہ کوئی نیا شخص انبیا علیہم السلام کی اس مبارک جماعت میں داخل ہو سکے گا۔

ختمِ نبوت کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

پہلی کتابوں اور قرآن مجید میں اگرچہ ختمِ نبوت کا عقیدہ بالکل صاف صاف موجود تھا تاہم انکارِ نبوت کے فتنے اور گمراہی سے بچانے کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی آیتوں کی تشریح و تفسیر وحی الٰہی کے تحت اپنی مبارک زبان سے کر دی تاکہ کسی کذّاب و دجّال کے لیے یہ گنجائش ہی باقی نہ رہے کہ وہ قرآن مجید کے الفاظ کو اپنے من مانے معنی پہنا کر دنیا کو راہ حق سے بہکانے کی ناکام کوشش کرے۔

اس کے متعلق بطورِ نمونہ چند حدیثیں پیش کرتے ہیں:

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ مَثَلِیْ وَ مَثَلَ الْاَنْبِیَاءِ مِنْ قَبْلِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ بَنٰی بَیْتًا فَاَحْسَنَہٗ وَاَجْمَلَہٗ اِلَّا مَوْضِعَ لَبِنَۃٍ مِّنْ زَاوِیَۃٍ فَجَعَلَ النَّاسُ یَطُوْفُوْنَ بِہٖ وَیَعْجَبُوْنَ لَہٗ وَیَقُوْلُوْنَ ھَلَّا وُضِعَتْ ھٰذِہِ اللَّبِنَۃُ فَاَنَا اللَّبِنَۃُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ

”میری اور مجھ سے پہلے گزرے ہوئے انبیا (علیہم السلام) کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے حسین و جمیل عمارت بنائی، مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی۔ لوگ اس عمارت کے ارد گرد پھرتے ہیں اور (عمارت کے حسن و جمال اور خوبی پر) حیران ہوتے ہیں، مگر ساتھ ہی یہ کہتے ہیں کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہیں رکھ دی گئی تو میں وہی اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اور بعض روایتوں کے آخر میں یہ بھی ہے:

جِئْتُ فَخَتَمْتُ الْاَنْبِیَاءَ

”میں آیا اور میں نے انبیا علیہم السلام کا سلسلہ ختم کر دیا۔“

(دیکھیے مسلم کتاب الفضائل باب ذکر خاتم النبیین)

حدیث کا مطلب بالکل واضح ہے وہ یہ کہ مجھ سے پہلے دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو شریعت اور جو تعلیمات و احکامات لائے ہیں ان کے مجموعے کو ایسی عمارت اور قصر تصور کرو جو نہایت شاندار، مضبوط اور حسین و جمیل ہو، مگر اس کی دیوار کے ایک کونے میں ایک اینٹ کے برابر جگہ خالی چھوڑ دی گئی ہو اور وہ خالی جگہ کسی ایسے شخص کی منتظر ہو جو آکر اس خالی جگہ کو پُر کر کے اس کے نقص کو پورا کر دے اور محل کی تعمیر کا سلسلہ ختم کر دے۔ اس محل کی تکمیل مجھ پر ہوئی، اب عمارت مکمل ہو چکی ہے اس میں کوئی جگہ ایسی باقی نہیں رہی جسے پر کرنے کے لیے کوئی دوسرا آئے یعنی سابقہ انبیا علیہم السلام کی لائی ہوئی شریعتوں، تعلیمات اور ان کی دعوت و تبلیغ کے ذریعے دین کا محل تیار ہو چکا تھا مگر اس میں جو کچھ کسر اور نقص باقی تھا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارک سے پورا ہوا اور دین کی تکمیل ہو گئی۔ اب اللہ تعالیٰ کا دین نہ ناقص ہے اور نہ اس میں تبدیل و تغیر ہو سکتی ہے اس لیے نہ نئے نبی کے آنے کی ضرورت ہے اور نہ آسکتا ہے اس لیے آخر میں فرمایا:

وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ

”اور میں (اس مقدّس سلسلہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر) سلسلہ انبیا علیہم السلام کو ختم کرنے والا ہوں۔“

(۲) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ أُعْطِيْتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَ أُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ وَ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ طَهُوْرًا مَسْجِدًا وَ أُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَ خُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ

"مجھے اور انبیا علیہم السلام پر چھ چیزوں کے ذریعہ فضیلت دی گئی ہے، مجھے جوامع الکلم سے نوازا گیا ہے (یعنی جامع اور مختصر بات کہنے کی پوری صلاحیت دی گئی ہے کہ مختصر الفاظ میں معانی کے سمندروں کو بند کر کے بیان کرتا ہوں) اور رعب وہیبت کے ذریعے میری مدد کی گئی ہے اور میرے لیے غنیمت کا مال حلال کر دیا گیا ہے اور میرے لیے ساری زمین مسجد (اور عبادت گاہ) بنادی گئی ہے (کہ پاک وصاف جگہ نماز پڑھی جاسکتی ہے) اور (پانی پر قدرت نہ ہونے کی صورت میں زمین سے تیمم کی اجازت دے کر) اس کو پاک کرنے والی چیز بنایا، اور مجھے تمام مخلوقات کی طرف (رسول بنا کر) بھیجا گیا اور مجھ پر (سلسلۂ نبوت کو مکمل کر کے) انبیا علیہم السلام کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا ہے۔"

(دیکھیے مسلم وترمذی وغیرہ)

(۳) حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَنَا مُحَمَّدٌ وَ أَنَا أَحْمَدُ وَ أَنَا الْمَاحِيْ الَّذِيْ يُمْحىٰ بِيَ الْكُفْرُ وَ أَنَا الْحَاشِرُ الَّذِيْ يُحْشَرُ النَّاسُ عَلٰى عَقِبِيْ وَ أَنَا الْعَاقِبُ وَ الْعَاقِبُ الَّذِيْ لَيْسَ بَعْدَهٗ نَبِيٌّ

"میں محمد ہوں اور میں احمد ہوں اور ماحی (مٹانے دینے والا) ہوں، میرے ذریعہ سے کفر مٹادیا جائے گا اور میں حاشر ہوں کہ لوگوں کو میرے بعد حشر کے موقع پر اٹھایا جائے گا۔ میں عاقب (یعنی سب سے پیچھے آنے والا) ہوں، عاقب وہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔" (مسلم وبخاری)

(۴) حضرت عبد الرحمن بن جبیر سے روایت ہے کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مکان سے نکل کر اس انداز میں ہمارے درمیان تشریف لائے گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے رخصت ہو رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دفعہ یہ الفاظ دہرائے:

أَنَا مُحَمَّدٌ وَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ

"میں محمد نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔"

(مسند احمد روایات عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما ابن العاص)

(۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک کے لیے تشریف لے جارہے تھے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں ٹھہرنے کا حکم دیا (تاکہ وہ پیچھے رہ کر حفاظت کریں) حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حکم سے کچھ پریشان سے ہو گئے تو

آپ ﷺ نے فرمایا:

اَنْتَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسیٰ اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ

"میرے ساتھ تمہاری وہی نسبت ہے جو موسیٰ کے ساتھ ہارون کو تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں۔"

(دیکھیے بخاری و مسلم)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہِ طور پر جاتے ہوئے بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو پیچھے چھوڑا تھا، اسی طرح میں بھی آپ کو مدینہ منورہ کی حفاظت کے لیے چھوڑتا ہوں، لیکن چونکہ حضرت ہارون علیہ السلام تو نبی تھے، اس لیے فوراً وحی الٰہی کے تحت فتنہ کے سدباب کے لیے کھل کر یہ بیان فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی ہونے والا نہیں تاکہ ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ کی کوئی آپ ﷺ کے دروازۂ نبوت کو کھٹکھٹانے کی جرأت بھی نہ کر سکے۔

أنت منی بمنزلة هارون من موسیٰ سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ بات یاد رہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی زندگی ہی میں آپ ﷺ کے مدینہ منورہ میں چھوڑنے سے یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ آپ ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ میرے بعد وہ خلیفہ بن جائیں، بلکہ وقتی تقرری تھی۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر حضرت عبد اللہ بن مکتوم رضی اللہ عنہ کو بھی مدینہ منورہ میں حفاظت کے لیے چھوڑا تھا۔

پھر حضرت ہارون علیہ السلام تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے وفات پا چکے ہیں تو یہ حدیث بجائے اس کے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ اول مستحق قرار دے اس کے بالکل برعکس ہو جاتی ہے، کیونکہ یہاں حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ تو پیچھے چھوڑے جانے میں ہے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو وقتی اور عارضی طور پر بنی اسرائیل کی نگرانی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی زندگی میں ہی مقرر کر دیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے جانشین حضرت ہارون علیہ السلام نہیں بنے، بلکہ یوشع علیہ السلام بن گئے تھے، تو یہاں بھی وہی عارضی تقرُّری تھی اور جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ ختم ہو گئی جیسا کہ آپ ﷺ نے دوسرے غزوات میں دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی مقرر فرمایا تھا، لیکن چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ پیچھے رہنے پر خوش نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ میں جان کی بازی لگا کر جہاد میں شریک ہو کر لڑوں تو آپ ﷺ نے رشتہ داری بھی بتلائی اور یہ بھی بتلایا کہ آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے بھائی ہی کو اپنے پیچھے قوم کی نگرانی کے لیے چھوڑا تھا۔

(۲) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اِنَّ الرِّسَالَةَ وَ النُّبُوَّةَ قَدِ انْقَطَعَتْ فَلَا رَسُوْلَ بَعْدِیْ وَ لَا نَبِیَّ

"رسالت اور نبوت کا سلسلہ یقیناً منقطع (اور ختم) ہو گیا ہے میرے بعد نہ تو کوئی رسول آئے گا اور نہ کوئی نبی۔" (دیکھیے ترمذی: ابواب الرؤیا باب، ذهبت لا نبوة وبقية المبشرات)

(۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهٗ نَبِيٌّ وَاِنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِیْ وَسَيَكُوْنُ خُلَفَاءُ

"بنی اسرائیل کی قیادت ان کے انبیا علیہم السلام کرتے تھے جب کوئی نبی وفات ہوتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا، مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا، بلکہ میرے خلفاء ہوں گے۔" (بخاری و مسلم)

(۸) حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِیْ اُمَّتِیْ كَذَّابُوْنَ ثَلَاثُوْنَ كُلُّهُمْ يَزْعُمُ اَنَّهٗ نَبِيٌّ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ

"میری امت میں تیس (۳۰ کذّاب ہوں گے جن میں سے ہر ایک یہ دعویٰ کرے گا کہ وہ نبی ہے حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔" (مسند احمد)

یہ چند قرآنی آیات، صحیح و صریح احادیث اور دوسرے دلائل ہیں جو آپ کے سامنے آگئے ہیں، یہی نہیں بلکہ ختم نبوت کے متعلق اور بھی بہت سی روایات اور دلائل موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی محکم آیتوں اور صحیح و صریح متواتر حدیثوں کے پیشِ نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عقیدۂ ختم نبوت پر ایسا اجماع ہوا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ہستی اور اس کی یکتائی و توحید پر اس لیے مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ کرنے اور اسے کافر و مرتد قرار دینے پر بلا استثناء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہر فرد متفق تھا حالانکہ مسیلمہ بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتا تھا اور اپنی مروجہ اذان میں "وأشهد أن محمد رسول الله" بھی کہتا تھا۔

(دیکھیے تاریخ طبری اردو ترجمہ حصہ دوم: ۱۰۰)

یہی وجہ ہے کہ اول سے لے کر آخر تک مسلمانوں میں کبھی بھی عقیدہ ختم نبوت کے متعلق دو رائے نہیں ہوئیں، بلکہ سب مسلمانوں کی ایک ہی آواز اور ایک ہی عقیدہ رہا، وہ یہ کہ نبوت کا سلسلہ پایہ تکمیل اور اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہ نئی نبوت آئے گی نہ کسی بھی قسم کے نئے نبی و پیغمبر کے آنے کی ضرورت ہے، اس

لیے علمائے اسلام کا یہ فتویٰ ہے کہ اگر کوئی ایسے شخص سے دلیل بھی مانگے جو آپ ﷺ کے بعد نبوت کا مدّعی ہے تو ایسے مدعی نبوت سے دلیل مانگنے والا بھی کافر ہو جائے گا۔

کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ختمِ نبوت کے عقیدے کا پوری طرح قائل نہیں ہے ورنہ اگر قائل ہوتا تو پھر دلیل طلب کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس لیے دلیل مانگنا ہی انکارِ ختمِ نبوت کی دلیل ہے۔

تمام دنیا کی فلاح و نجات صرف اور صرف اسلام میں ہے

دینِ اسلام کے بغیر نجات ناممکن ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی مرضیات و نامرضیات اور اس کی پسند و ناپسند کا علم صحیح علم کمال وثوق اور کسی یقینی غیر مشکوک ذریعے سے حاصل نہ ہو گا اس وقت تک انسان مقصد توحید لاالٰہ الا اللہ سے محروم رہے گا اور اللہ تعالیٰ کو حقیقی معنوں میں الٰہ بنانے اور اس کی بندگی کرنے سے قطعاً قاصر رہے گا۔ پہلے جتنی بھی آسمانی کتابیں دنیا میں آچکی ہیں ان کے متعلق تو یہ مسلَّمہ حقیقت ہے کہ ان میں تغیرّ و تبدُّل ہو چکا ہے اور ان میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے ساتھ انسانوں کے دماغی وسوسے اور انسانی خواہشات سب خلط ملط ہو چکے ہیں اور یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ ان کتابوں میں سے اللہ تعالیٰ کے احکامات اور ہدایات کو لوگوں کے تغیرُّ و تبدُّل ،ان کے خود ساختہ عقائد اور احکامات سے الگ کر دیا جائے۔ ایسی صورت میں ظاہر یہی ہے کہ اُن کتابوں پر عمل کرنے سے اللہ تعالیٰ کی مرضی کی خالص بندگی کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ جو شخص بھی ان کتابوں کو اپنی زندگی کا دستور بنائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے ساتھ لوگوں کی مرضیات و خواہشات کی بندگی کر کے خالص بندگی سے محروم رہے گا جبکہ نجات و فلاح کا دار و مدار خالص بندگی پر ہے، اس ضرورت کے تحت اللہ تعالیٰ نے عین اس وقت قرآن مجید اور پیغمبر قرآن سیدنا و حبیبنا محمد رسول ﷺ کو بھیج دیا جبکہ انسان کی عقل اور تہذیب و تمدُّن کم سنی سے نکل کر سن بلوغ کو پہنچ گئی ہے اور اب پوری انسانیت کے لیے قیامت تک آنے والے واقعات و مسائل کے لیے ایک ہی کتاب اور ایک ہی شریعت کافی و شافی ہو سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس وقت ایک محفوظ کامل و مکمل کتاب قرآن مجید بھیجی اور لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی اور زندگی گذارنے کی سیدھی وصاف شاہراہ کھول دی۔ یہی وہ کتاب ہے جو حق و باطل کی کسوٹی ہے اور یہ وہ فرقان اور قولِ فیصل ہے جو اللہ تعالیٰ کے دین کو تمام آمیزشوں اور تحریفات سے پاک کر کے بالکل ٹھیک ٹھیک پیش کرتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے کہ جو بات اس کسوٹی پر کھری ثابت ہو گی وہ کھری ہے اور جو اس پر کھوٹی ثابت ہو وہ باطل، غلط اور خود ساختہ ہو گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا آخری پیغام اور اپنی تمام تعلیمات وہدایات مکمل طور پر نبی کریم ﷺ کے ذریعے بتادی ہیں

اور قیامت تک آنے والے واقعات و مسائل کے لیے تہذیب و تمدّن، معاشرت اور معاملات زندگی کے تمام شعبوں کے اصول بتلائے ہیں۔ ان تعلیمات وہدایات کو قرآن مجید، سنت اور سیرتِ رسول ﷺ میں اس قدر محفوظ کیا ہے کہ گویا آپ ﷺ آج بھی ہمارے سامنے ہیں اور آپ ﷺ کے ہر قول و فعل کو ہم دیکھ رہے ہیں۔

یہ بات مسلمان تو کیا غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ آج اللہ تعالیٰ کی مرضی کی بندگی صرف اور صرف محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ ﷺ کی تعلیمات میں منحصر ہے اور نجات و فلاح کا دارومدار صرف اور صرف اسلام میں ہے اور بس۔

جو بھی انسان آپ پر ایمان لانے سے گریز کرے گا وہ ہرگز نجات نہ پاسکے گا اگرچہ بظاہر وہ پہلی کتابوں کو مانتا ہو۔ ان پر عمل بھی کرتا ہو، توحید کو بھی اپنایا ہو اور بظاہر وہ کام بھی کرتا ہو جو نیک اور متقی لوگ کیا کرتے ہیں۔

پس اب نجات و فلاح کا ذریعہ صرف وہ تعلیمات وہدایات ہیں جو خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہیں، چوں کہ یہ آخری، دائمی اور عالمگیر دین ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ پر نازل کردہ تعلیمات کو اس قدر عام کیا کہ آج تمام دنیا محمد ﷺ پر نازل کردہ دین کو دینِ اسلام اور اس کے پیروکاروں کو مسلمان کہتی ہے۔

اسلام ہی راہِ نجات ہے۔ اسلام ہی سراسر حق ہے۔[1] اس کے خلاف سب باطل و مردود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ وَ مَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ؕ وَ مَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾

”بے شک دین اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف اسلام ہی ہے اور جنہیں کتاب دی گئی تھی انہوں نے صحیح علم آنے کے بعد باہمی سرکشی کی وجہ سے اختلاف کیا اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیتوں (حکموں) کا انکار کرے تو اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب لینے والا ہے۔“ (آل عمران:۱۹)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۸۵﴾

”اور جو کوئی اسلام کے بغیر کوئی اور دین تلاش کرے گا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ قیامت میں زیاں کاروں میں سے ہوگا۔“ (آل عمران:۸۵)

---

[1] اسلام کی حقانیت کے لیے دیکھئے: ”دہریت سے اسلام تک“ کا باب دوم۔

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا خلاصہ

خلاصہ یہ ہوا کہ رسالت کے بغیر توحید نامکمل ہے۔ عقیدۂ رسالت ہی توحید کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کی خالص بندگی کی راہ متعین کرتا ہے۔ کلمہ اسلام لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ میں پورا دینِ اسلام سمٹ کر آیا ہے، قرآن وسنت اسی کلمہ کی تشریح وتفصیل بیان کرتے ہیں۔ جو شخص اس کلمہ کو پڑھ لیتا ہے تو وہ پورے دینِ اسلام پر چلنے کا یہ عہد وپیمان کرلیتا ہے کہ میں صرف ایک اللہ تعالیٰ کو نفع ونقصان کا مالک ومعبود برحق مانتا ہوں، دنیا اور آخرت کی ہر چیز، ہر نتیجہ اور ہر انجام اسی کے قبضہ واختیار میں ہے اور نفع وخیر صرف اسی کی بندگی میں ہے، لہٰذا میں صرف اسی کی بندگی کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ہر قانون، ہر اطاعت اور ہر حکم سے بے زاری کا اعلان کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی یہ بندگی اس کے آخری سچے رسول محمد ﷺ سے سیکھوں گا جو کہ قرآن مجید اور سنت رسول علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں محفوظ ہے اور میں پوری طرح شریعتِ مطہّرہ اور دینِ اسلام پر اپنی زندگی گذارنے کی کوشش کروں گا اور اس کلمہ کے تمام فرائض اور تقاضوں کو پورا کروں گا تاکہ مجھ سے میرا پروردگار راضی ہو جائے اور مجھے ابدی نعمتیں، جنتیں اور اپنا قرب نصیب فرمائے۔

ایمان اور عقیدے کا بیان

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو علوم واحکام رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے ہیں ان میں سے ایک حصہ تو وہ ہے جس میں ایسی حقیقتوں کی خبر دی گئی ہے جن کو ہم از خود آنکھ وغیرہ مخصوص ذرائع سے معلوم نہیں کرسکتے تھے اور ہم کو یہ حکم ہے کہ ان حقیقتوں کو ہم مانیں اور ان پر ایمان لائیں۔ یہ اسلام کا ایمانی واعتقادی حصہ ہے جو بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ ہے جس میں عملی زندگی کی تعلیمات اور احکام ہیں کہ یہ کام کرو اور یہ مت کرو۔ یہ اسلام کا عملی حصہ ہے جس کے بہت سے شعبے اور اجزا ہیں مثلاً عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق وآداب، دین کی دعوت، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔

یہ تمام چیزیں دینِ اسلام کے شعبے واجزا ہیں۔ دینِ اسلام ان سب پر حاوی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اسلام کے تمام شعبوں کے متعلق اصولی اور ضروری باتیں بیان کی جائیں گی۔ سب سے پہلے اسلام کے ایمانی اور اعتقادی حصہ کے بارے میں کچھ پیش کیا جاتا ہے۔

اسلام کے بنیادی عقائد

اس کے بارے میں پہلے قرآن مجید کی چند آیتیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ

"بلکہ نیکی تو ان لوگوں کی ہے جو ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر اور فرشتوں پر اور اللہ تعالیٰ کی کتاب پر اور پیغمبروں پر۔" (بقرہ:۱۷۷)

(۲) اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ

"رسول ایمان لائے اس پر جو اس کے رب کی طرف اس پر نازل ہوا ہے اور (اس کے ساتھ اس پر) مؤمن لوگ (بھی ایمان لائے ہیں)۔ سب ایمان لائے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔" (بقرہ:۲۸۵)

(۳) وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

"اور جس شخص نے انکار کیا اللہ تعالیٰ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور آخرت کے دن کا تو وہ (صحیح راہ سے بھٹک کر) دور کی گمراہی میں جا پڑا۔" (النساء:۱۳۶)

اسلام کے بنیادی عقائد پانچ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ (۲) اس کے ملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان۔
(۳) اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان۔ (۴) اللہ تعالیٰ کے نبیوں پر ایمان۔
(۵) روزِ آخرت پر ایمان۔

ان پانچ کے اندر اسلام کے تمام عقائد و نظریات آجاتے ہیں مثلاً تقدیر، یہ اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم و حکمت اور قدرت کے ساتھ لازم ہے اور اس کی نفی العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت اور قدرت کو محدود کرنا ہے۔ اب عقائد کی ضروری تفصیل سمجھ لیجیے:

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب

یہ ہے کہ ہمیں، ہمارے ماں باپ، زمین و آسمان، جن، فرشتوں، غرض تمام مخلوقات کو پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ تمام کائنات اس کے قبضہٗ قدرت میں ہے۔ وہی اس کو چلاتا ہے۔ جہاں میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے حکم و علم کے بغیر کسی درخت کا کوئی بھی پتہ نہ ہل سکتا ہے اور نہ گر سکتا ہے۔ اس کا علم کائنات کے ذرے ذرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ بے مثل، بے نظیر اور بے عدیل ہے، وہ کائنات کے ذرہ ذرہ کو دیکھتا ہے۔ غرض وہ ہمیشہ سے اور ہمیشہ تک ساری مخلوقات کے ظاہر اور پوشیدہ چیزوں، خیالات، حرکات

وسکنات کو دیکھتا اور سنتا ہے۔ تمام مخلوقات، موت وحیات، مارنا اور جلانا اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہی زندہ جاوید ہے۔ اس کی زندگی اپنی ذاتی زندگی ہے، اس کے سوا جس کو زندگی ملی ہے اسی کی دی ہوئی ہے۔ نہ اس کا باپ ہے، نہ بیٹا، نہ بیٹی، نہ بیوی اور نہ کوئی رشتہ دار، وہ اس قسم کے تمام تعلقات سے پاک ہے۔ وہ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ سوتا ہے اور نہ اس کو اونگھ آتی ہے۔ وہ ہمہ وقت بیدار اور باخبر ہے۔ مخلوقات جیسے ہاتھ، پاؤں، ناک، شکل وصورت سے پاک ہے۔ اس کا کوئی بھی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ سب پر حاکم ہے، اس پر کوئی حاکم نہیں۔ بندوں کو مشکلات ومصائب سے بچانے والا صرف وہی ہے۔ فائدہ اور نقصان، راحت وتکلیف اور ضرر وغیرہ صرف اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وہ چاہے تو کسی کو عزت دے اور چاہے تو کسی کو ذلت دے۔ وہ رزق گھٹاتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ تمام مخلوقات کی تربیت وپرورش کرتا ہے۔ وہ اکیلے مخلوق کے بغیر سب کچھ کر سکتا ہے اور تمام مخلوق مل کر اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ غرض تمام اچھی اور کمال والی صفات اس کی ذاتی صفات ہیں۔ یہ صفات ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ نہ اس سے کسی وقت اس کی کوئی صفت دور یا کمزور ہو سکتی ہے اور نہ اس صفت میں کوئی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ تقدیر کا مالک صرف وہی ہے۔ وہی تمام اختیارات کا مالک ہے، سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں وہ تمام عیبوں اور ہر طرح کی کمزوریوں سے پاک ہے۔ صرف اور صرف وہی ہے جو عزت وذلت اور نفع ونقصان کا مالک ہے اور کوئی نہیں۔

پس صرف وہی عبادت وبندگی کے لائق ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا عبادت کے قابل نہیں اور صرف اسی کے ہر قانون اور ہر بات پر یقین اور مکمل اعتماد ہونا چاہیے کہ اس ہی میں خیر و نفع ہے اور اس کے خلاف سراسر نقصان وخسران ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا خلاصہ

یہ ہے کہ انسان اس بات کو تسلیم کرے کہ کائنات کا ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے۔ تمام کائنات صرف اسی کی مشیت اور صرف اسی کے حکم وتدبیر سے چل رہی ہے۔ صرف وہی نفع ونقصان، عزت وذلت کا مالک ہے۔ حقیقی نفع وعزت اور خیر صرف اللہ تعالیٰ کے قانون وحکم کے مطابق چلنے (یعنی بندگی) میں ہے اور اس کے خلاف سراسر نقصان وخسران ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا اثر ونتیجہ

ا.... اس عقیدے کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ ایسے شخص کا اللہ تعالیٰ، اس کے ہر قانون، ہر حکم اور ہر بات وہدایت پر

کامل اعتماد و بھروسہ ہو گا۔

۲.... ایسا شخص کامل طور اللہ تعالیٰ، اس کے قانون واحکامات اور ہدایت کے حوالے ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اسی کی بندگی کرے گا اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی بندگی کو اپنا نصب العین بنا لے گا۔

۳.... ایسا شخص صرف ایک اللہ اور اس کی خوشنودی کو چاہتا ہے، صرف اس سے اور اس کے احکامات وہدایات پر چلنے میں نفع و خیر کی امید رکھتا ہے اور صرف اسی سے اور اس کے قانون و حکم کی خلاف ورزی سے ڈرتا ہے اور صرف اسی سے مانگتا ہے، اس طرح اس کے طمع وخوف، امید و بیم کا مرکز و مرجع اور معبود صرف ایک اللہ رب العالمین ہو کر رہ جاتا ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے قانون کے مقابلے میں دوسروں کے قوانین پر اعتماد کر کے مطمئن ہے اور اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کے بجائے دوسروں کے قوانین کی خلاف ورزی میں نقصان و خسران سمجھتا ہے یا خوف وامید کی حالتوں میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا اللہ تعالیٰ کے سوا دوسروں کو ذرہ برابر بھی نفع ونقصان کا مالک سمجھتا ہے تو ایسا شخص دعوی ایمان کے باوجود ایمان سے خالی اور اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹا ہے۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب

۱.... یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی وہ نورانی اور لطیف مخلوق ہیں جو عام طور پر نظر نہیں آتے۔ یہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کے نظم و نسق (آسمان وزمین دنیا کی چیزوں پر بھی اور آخرت، جنت و جہنم سب) پر مقرر فرمائے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے قضاء وقدر کے منصوبوں اور تدابیر کو بروئے کار لانے کے لیے ذریعے اور کارندے ہیں۔

۲.... ان کے اندر برائی اور نافرمانی کا مادہ نہیں رکھا گیا ہے۔ ان کے پاس ذرہ برابر بھی نہ اختیار ہے، نہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کر سکتے ہیں اس لیے یہ ملکوتی قوتیں بلا چوں وچراں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے قانون و حکم کے تحت چلتی ہیں اور ہر آن سرگرم عمل رہتی ہیں۔

فرشتوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ

”وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ صرف وہی کرتے ہیں جو انہیں حکم دیا جاتا ہے۔“ (تحریم:۶)

کائنات کا نظم و نسق چلانے کے لیے فرشتوں کی مختلف جماعتیں ہیں جو مختلف خدمات پر مقرر ہیں اور ہر ایک

کے لیے ایک کام مقرر ہے۔ وہ صرف اسی پر لگی رہتی ہے۔ وہ اپنے کام میں ذرہ برابر بھی خیانت اور سستی نہیں کرتے اور نہ سہل نگاری سے کام لیتے ہیں جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے احکامات پیغمبروں کے پاس لانے پر مقرر ہیں۔ حضرت میکائیل علیہ السلام مخلوق کو روزی پہنچانے اور بارش وغیرہ کے انتظام پر مقرر ہیں اور بے شمار فرشتے ان کی ماتحتی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات بجالاتے ہیں۔ بعض بادلوں کے انتظام پر مقرر ہیں۔ بعض ہواؤں کے انتظام پر مامور ہیں اور بعض دریاؤں، تالابوں اور نہروں پر لگائے گئے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا انتظام وہ خدا تعالیٰ کے حکم کے موافق کرتے ہیں۔

حضرت عزرائیل علیہ السلام تمام جانداروں کی روح نکالنے پر مقرر ہیں، ان کی ماتحتی میں بھی بے شمار فرشتے خدائی احکامات بجالاتے ہیں۔ بعض نیک بندوں کی جان نکالتے ہیں۔ اور بعض بدکاروں کافروں وغیرہ کی جان نکالتے ہیں جب کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام قیامت کے دن صور پھونکنے پر مقرر ہیں۔ بعض فرشتے انسان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں جیسے دو فرشتے جنہیں کراماً کاتبین کہتے ہیں ان میں سے ایک فرشتہ نیک کام لکھتا ہے اور دوسرا برے کام لکھتا ہے۔

اسی طرح وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ہر عمل کا نتیجہ مرتّب کرتے رہتے ہیں اور وہ نتیجہ انسان کی ذات پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی اعمال قانونِ الٰہی کے مطابق مستقبل میں نفع وخیر یا نقصان وخسران کی صورتوں میں سامنے آجاتے ہیں:

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ﴿١٠﴾ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿١٢﴾

"اور بے شک تم پر نگہبان مقرر ہیں معزز لکھنے والے، وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔" (الانفطار: ۱۰-۱۲)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿١٧﴾ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿١٨﴾

"جب کہ دو (فرشتے انسان کے اقوال وافعال کو) لینے (اور ضبط وریکارڈ کرنے) والے (ہر وقت انسان کے) دائیں بائیں طرف بیٹھے رہتے ہیں، وہ انسان جو بھی لفظ بولتا ہے اس کے پاس ایک مستعد نگران موجود ہوتا ہے (کہ ادھر اس کی زبان سے کوئی لفظ نکلا اور ادھر فوراً ایک محافظ اور نگہبان نے اسے محفوظ اور ریکارڈ کر لیا کیا مجال ہے کہ کوئی ایک عمل اور ایک لفظ بھی ریکارڈ سے اور اپنی نتیجہ خیزی سے رہ سکے)۔" (ق: ۱۷-۱۸)

جس طرح بعض فرشتوں کا کام یہ ہے کہ وہ انسان کے اقوال وافعال کو اپنی اصل صورت وشکل میں ریکارڈ

اور محفوظ کرتے ہیں، اسی طرح بعض فرشتے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق آفتوں اور مضر اثرات سے انسان کی حفاظت کرنے پر مقرر ہیں۔ کچھ فرشتے انسان کے مرنے کے بعد قبر و برزخ میں اس سے سوال کرنے پر مقرر ہیں، ہر انسان کی قبر اور برزخ کی زندگی میں دو فرشتے آتے ہیں ان کو منکر اور نکیر کہتے ہیں اور کچھ فرشتے اس کام پر مقرر ہیں کہ دنیا میں پھرتے رہیں اور جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہو چاہے جس صورت میں ہو وعظ ہوتا ہو، قرآن مجید کی تلاوت ہوتی ہو، درود شریف پڑھا جارہا ہو، کلمہ طیبہ یا دوسرے اذکار ہوتے ہوں، دین کی تعلیم ہوتی ہو، بہر حال وہ ایسی ذکر والی مجلسوں میں ہوتے ہیں اور ان کی شرکت کی اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت دیتے ہیں۔

غرض یوں سمجھیے! کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین، جنت و جہنم کے سارے انتظامات پر فرشتوں کو مقرر فرمایا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق وہ کام پورا کرتے ہیں۔ اس کام میں وہ کسی طرح خود مختار نہیں ہوتے، بلکہ اللہ تعالیٰ جو کام جس طرح چاہے اسی طرح اسی کے حکم کے مطابق کر دیتے ہیں۔

۳.... فرشتوں کی گنتی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ہاں اتنا معلوم ہے کے چار مُقرَّب اور مشہور فرشتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام۔ حضرت میکائیل علیہ السلام۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام اور حضرت اسرافیل علیہ السلام۔

ملائکہ اور فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

فرشتوں پر ایمان کے بارے میں بعض ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حقائق تو بے شمار ہیں۔ لیکن ایمانیات کے اندر وہی حقائق ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسان کی زندگی پر مفید اثرات مرتب ہو سکیں تو آخر فرشتوں کے وجود پر ایمان لانے کی وجہ سے انسان کی زندگی اور عمل میں کیا فرق آسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فرشتوں کی حقیقت پر ایمان لانے سے انسان کی علمی و عملی زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

فرشتوں پر ایمان لانے کے اثرات ونتائج

ا.... مادہ پرست مادی چیزوں کے خواص وطبائع کو دیکھ کر انہی مادی خواص [1] وطبائع کی بالذات کار فرمائی کا یقین کرتے ہیں، اس وجہ سے وہ اس بے جان وبے اختیار مادہ ہی کو سب کچھ جان کر اللہ تعالیٰ کا انکار کرتے ہیں حالانکہ ان مادی خواص وطبائع پر روحانی قوتیں مقرر ہیں جو اللہ تعالیٰ کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں۔

---

[1] اس کی پوری تفصیل ''دہریت سے اسلام تک'' میں ملاحظہ فرمائیں۔

اس حقیقت کو ذہن کے قریب کرنے کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان وغیرہ کو پیدا کیا ہے، اس میں ہر عضو اور اندام کے اندر کچھ خاصیتیں اور قوتیں رکھ دی ہیں مثلاً ہاتھ میں پکڑنے کی، آنکھ میں دیکھنے اور کان میں سننے کی قوت رکھ دی ہے لیکن یہ قوتیں اس وقت تک از خود ذرہ برابر کوئی حرکت نہیں کر سکتیں جب تک ان چیزوں کو حرکت دینے والی چیز یعنی حیوانی روح موجود نہ ہو اور یہی روح حیوانی انسان کے پورے مادی جسم پر مسلّط رہتی ہے اور آنکھ سے دیکھنے اور کانوں سے سننے اور ہاتھ سے پکڑنے اور پاؤں سے چلنے۔ غرض ایک ایک چیز کو اس کی خاصیت وطبع کے مقررہ قانون کے مطابق چلاتی رہتی ہے۔ اگر یہ روح نہیں تو پکڑنے یا بینائی کی قوت ہونے کے باوجود یہ قوتیں بے حس وحرکت ہو کر ناکارہ رہ جاتیں۔ یہ حیوانی روح انسان کے ارادہ کے مطابق ان اعضاء کو چلاتی رہتی ہے اور یہ حیوانی روح قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتی کہ اختیاری اعمال میں ذرہ برابر انسان کی نافرمانی کرے اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسان کے ارادے کے تابع ہے اور اس کے ارادی اعمال میں اس کے ارادہ کو پا کر اس کے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرتی ہے اور جو انسان کے غیر اختیاری اعمال ہیں مثلاً بڑھنا، کمزور ہونا، موٹا ہونا وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق سرانجام پاتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مادہ، پتھروں، پہاڑوں، چاند اور سورج وغیرہ دنیا کی تمام چیزوں میں جو قوتیں اور خاصیتیں رکھ دی ہیں ان پر بھی ارواح یعنی ملائکہ مقرر کیے ہیں وہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے مقررہ اصول کے مطابق چلاتے رہتے ہیں۔

یہ فرشتے ایک طرف تو انسان کے سامنے ان چیزوں کو پیش کرتے رہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے حصول واستعمال میں اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق نتائج مرتب کرتے ہیں تو قرآن مجید نے ملائکہ کی حقیقت کو سامنے لا کر ایک طرف ان لوگوں کے غلط عقیدے کو مٹا دیا جو فرشتوں کو خدائی اختیارات دے دیتے ہیں، دوسری طرف مادیت کے بت کو بھی پاش پاش کر دیا اور بتایا کہ یہ مادہ اور خواص بالذات مؤثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو انہی ارواح مجرّدہ یعنی ملائکہ کے ذریعے ان کو مؤثر بناتا ہے اور چلاتا ہے اگر یہ نہ ہو تو یہ تمام قوتیں بے حس وحرکت ہو کر ناکارہ ہو جائیں گی۔

۲.... فرشتوں پر ایمان رکھنے والا مادی قوتوں سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کی نافرمانی سے خوفزدہ ہوتا ہے، کیونکہ مادی قوتوں کو چلانے اور مؤثِّر بنانے والے فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت

سرگرم عمل رہتے ہیں۔

۳.... جب اللہ تعالیٰ پر اور اس کی صفات رحم وعدل اور حکمت پر ایمان لانے کے ساتھ یہ لازم ہے کہ نتائجِ اعمال کے لیے روزِ آخرت اور دوسری زندگی ہو تو اب سوال یہ ہے کہ دنیا اور آخرت میں عروج وترقی اور آخرت کی ابدی فلاح وترقیات کو کیسے حاصل کیا جائے؟ ظاہر ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات کے قانون اور اس کی خالص بندگی سے حاصل کی جائے گا۔ اس بندگی اور اللہ تعالیٰ کے احکامات، قوانین وہدایات کے لیے کتابوں کی اور کتابوں کے بتانے سمجھانے کے لیے رسولوں کی ضرورت ہوئی جیسا کہ اس کا تفصیلی بیان ان شاء اللہ باب نبوت ورسالت میں آجائے گا۔

پس جب انسان کی ایمانی وروحانی ترقی وفلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت ورہنمائی ضروری ہوگئی تو ظاہر ہے کہ ان حقائق پر ایمان لانا ضروری ہوگیا جن کے ذریعے یہ ہدایات اور احکامات انسان کو مل سکتے ہیں، ان ذرائع میں پہلا ذریعہ فرشتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی ظاہری اور حسی مخلوق کے درمیان ایک قابلِ اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی خداداد روحانیت اور لطافت کی وجہ سے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ کا قُرب رکھتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق ہونے کے سبب مخلوق سے بھی نسبت وتعلق رکھتے ہیں اور ایک طرف اپنی خداداد نورانیت ولطافت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار واحکامات کو براہِ راست قبول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور دوسری طرف ان احکامات کو مخلوق اور اللہ تعالیٰ کے بندوں تک منتقل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں تو یہ فرشتے خصوصاً جبرائیل علیہ السلام براہِ راست اللہ تعالیٰ سے اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے وحی الٰہی کو اخذ کرتے تھے اور پھر اس کے حکم کے مطابق اس کے پیغمبروں کو بلاکم وکاست پہنچادیتے تھے تو کتابوں اور نبیوں کے ساتھ فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہوا، کیونکہ ملائکہ پر ایمان اور کتابوں پر ایمان اور رسولوں پر ایمان سب ایک دوسرے سے اتصال رکھنے والی کڑیاں ہیں اور یہ سب کڑیاں مل کر ہی انسان کی عملی زندگی پر اثرانداز ہوتی ہیں اور انسان کے مستقبل اور آخرت کو بناتی ہیں اس لیے آپ قرآن مجید میں غور کریں جہاں تمام ایمانیات کی بات آتی ہے وہاں رسولوں سے پہلے کتاب اور اللہ تعالیٰ کی نازل شدہ ہدایات کا ذکر ہوگا اور کتاب اور نازل شدہ چیزوں یعنی وحی الٰہی سے پہلے فرشتوں پر ایمان کا ذکر ہوگا کیونکہ وحی اور کتاب فرشتوں کے ذریعے ملتی ہے۔

لہٰذا خلاصہ یہ ہوا کہ جس طرح انبیا علیہم السلام عام انسانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانی پیغمبر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہدایات انسانوں تک بلاکم وکاست پہنچاتے ہیں اور ان کے عملی طریقے بتاکر انسانوں کو ان پر ڈالتے

ہیں، اسی طرح انسانی پیغمبروں کے لیے یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی پیغمبر ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات واحکامات اور بندگی کے طور وطریقے بلاکم وکاست انسانی پیغمبروں تک پہنچاتے ہیں اور یہ تینوں کڑیاں یعنی ایمان بالملائکہ، ایمان بالکتاب اور ایمان بالرسول مل کر انسان پر اس کی ترقی اور فلاح کی راہوں کو کھول دیتے ہیں۔

۴.... انسان جب اس حقیقت کو پالیتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز پر فرشتے مقرر ہیں اور یہ بھی مان لیتا ہے کہ یہ تمام کارندے اللہ تعالیٰ کے حکم و قانون کے تحت چلتے ہیں اور اسی کے حکم سے ایک طرف وہ انسان کو اسباب کے استعمال اور حصول سے نہیں روکتے، بلکہ جو انسان ان اسباب کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ فرشتے اس کو وہ اسباب اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون وسنت کے مطابق حوالہ کرتے ہیں۔ اس نے اگر ان اسباب کو غلط طریقے سے حاصل کیا یا غلط استعمال کرکے ناقدری کی تو یہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ان کے خلاف نقصان کی صورت کو پیدا کرتے ہیں اگر وہ ان کو ٹھیک ٹھیک ان احکامِ الٰہی کے مطابق جو اس نے پیغمبروں کے ذریعے بھیجے ہیں حاصل کرتا ہے اور استعمال کرتا ہے تو وہ اس قدر دانی کی وجہ سے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق نفع وخیر کی صورتیں پیدا کرتے ہیں اور نفع ونقصان کے یہ اثرات خود انسان کی ذات پر پڑتے ہیں ان کا اثر انسان کی دنیا کی زندگی پر بھی پڑتا ہے اور بعد والی زندگی پر بھی، وہ کامل طور پر اس سے متاثر ہوتا ہے یا تو ابدی راحتیں، خوشیاں اور ترقیاں پاتا رہتا ہے اور یا ہمیشہ کے لیے بے چینی کے عذاب اور عذاب پر عذاب میں مبتلا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسان اس حقیقت سے باخبر ہو تو اسباب کے حصول یا استعمال میں عارضی لذت وراحت کو نہیں دیکھے گا، بلکہ وہ ہر وقت چوکنا رہے گا کہ کوئی ایسی بات اور ایسا کام نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کے قانون اور حکم کے خلاف ہو، ورنہ عارضی راحت ولذت کے بعد دنیا کی زندگی میں بھی اور کامل طور پر آخرت کی زندگی میں بھی بے چینی، بے اطمینانی، سخت نقصان وخسران اور تباہی کا سامنا کرنا ہوگا۔

۵.... جب انسان ٹھیک ٹھیک اللہ تعالیٰ کے عدل ورحم کے قوانین پر چلتا ہے تو انسان کے آس پاس جو حفاظتی فرشتے ہیں وہ اس کی شیطانی اور جناتی اثرات سے پوری حفاظت کرتے ہیں، اگر وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کو چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، جتنا جتنا وہ اس کی بندگی کی سیدھی راہ سے ہٹتا چلا جاتا ہے اتنا وہ فرشتے بھی حفاظتی سرگرمیاں کم کرتے ہیں جس کے بعد انسان قسم قسم کے اوہامِ قلبی، پریشانیوں اور قلبی مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور بالآخر مکمل طور پر شیطانی اور جناتی اثرات کا شکار ہو کر تباہی کے گڑھوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔

۶.... جس کا اس بات پر ایمان ہو کہ فرشتے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جھک گئے ہیں تو اس سے یہ اشارہ بھی مل گیا کہ جب تک دنیا کے اسباب اور ان کی قوتوں پر فرشتے مقرّر ہیں، جب یہ فرشتے انسان کے لیے جھک گئے ہیں تو جن اسباب اور قوتوں پر یہ فرشتے مقرر ہیں وہ قوتیں اور اسباب بطریقِ اولیٰ انسان ہی کے لیے مسخر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مؤمن ان اسباب اور ان کی قوتوں کو حاصل کر کے دنیا کے سامنے پیش کر سکے گا اور ان سے دنیا والوں کے لیے نفع کے اسباب پیدا کرے گا اور ظاہر ہے کہ ایسا بندہ دنیا کے اسباب اور ان قوتوں کے سامنے نہیں جھک سکتا اور نہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون کے سوا کسی اور کے سامنے جھک سکتا ہے، اس کا سر تو صرف خالق اسباب رب العالمین کے سامنے جھکے گا۔

لیکن آج مسلمانوں کی اکثریت کا حال دیکھو تو یہی نظر آئے گا کہ وہ ان اسباب اور قوتوں کے سامنے صرف جھکے نہیں، بلکہ وہ ان قوموں کے سامنے بھی جھک چکے ہیں جنھوں نے ان دنیاوی اسباب اور ان سے ان کی قوتوں کو مسخر کیا ہے۔ ایسی قوم مسلمان تو کیا مقامِ انسانیت سے گر کر انسان کہلانے کی بھی مستحق نہیں ہے۔

غرض یہ کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے بلاشبہ انسان کی علمی اور عملی زندگی پر بہت گہرے اثرات پڑ سکتے ہیں بشرطیکہ اس حقیقت پر سچائی سے ایمان لایا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب

۱.... اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً جو کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل فرمائی ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی سچی کتابیں ہیں۔ وہ حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی کسوٹی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ کی بندگی اور بندوں کے لیے زندگی گزارنے کا دستور ہے، اس لیے ان کی رہنمائی پر پورا پورا اعتماد کیا جائے اور یہ یقین کیا جائے کہ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے، اس کے علاوہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں، ان کے مطابق چلنے میں ہی سراسر نفع ہے اور ان کے خلاف سراسر نقصان و خسران ہے، ان کو جن لوگوں نے اپنا دستور بنایا اور ان کے مطابق چلے وہ دنیا و آخرت دونوں میں کامیاب و کامران ہو گئے۔

۲.... اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں اپنے پیغمبروں پر نازل کی ہیں جن میں سے بڑی کو کتاب اور چھوٹی کو صحیفہ کہتے ہیں۔

۳.... چار مشہور آسمانی کتابوں کے نام یہ ہیں:

تورات: حضرت موسیٰ علیہ السلام پر۔ زبور: حضرت داؤد علیہ السلام پر۔
انجیل: حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ قرآن مجید: خاتم المرسلین سید الانبیا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی۔

۴.... قرآن مجید سے پہلے جتنی کتابیں تورات، زبور اور انجیل نازل ہوئی ہیں ان سب کو مانیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کتابیں ہیں، ان کو جن لوگوں نے اپنا دستور بنالیا اور ان کے مطابق چلے، وہ دنیا و آخرت دونوں لحاظ سے کامیاب وکامران ہوئے، لیکن چونکہ ان کتابوں میں لوگوں نے ردوبدل کر دیا اسی وجہ سے موجودہ کتابیں جو تورات، زبور وغیرہ کے نام پر موجود ہیں یہ وہ اصل آسمانی کتابیں نہیں، بلکہ ان میں تحریف ہوئی ہے، ان کے متعلق یہ یقین نہیں رکھنا چاہیے کہ یہ اصل آسمانی کتابیں ہیں۔

۵.... آسمانی کتابوں میں سب سے آخری، سب کی خاتم، کامل و مکمل کتاب قرآن مجید ہے۔ یہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والا، ان کو سچا ثابت کرنے والا اور ان کا محافظ بھی ہے کہ ان کتابوں میں جتنی باتیں ایسی ہیں جن کی تبلیغ ہمیشہ اور ہر زمانے میں ضروری ہوتی ہے وہ سب اس قرآن مجید میں موجود اور محفوظ ہیں اور یہ تمام آسمانی کتابوں کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کر دینے والا ہے اور قیامت تک انسانی ضرورتوں کی کفیل ہے اور یہی وہ آخری کتاب ہے جو ہر قسم کی تحریف و تبدّل سے پاک ہے اور پاک رہے گی، کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اسی وجہ سے قرآن مجید کا ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ محفوظ ہے، اس میں ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی اور نہ قیامت تک ہو سکے گی۔ قرآن مجید ایک معجزہ ہے تمام دنیا مل کر اس کی نظیر اور مثل پیش نہ کر سکی، نہ قیامت تک پیش کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے کا لازمی اثر اور اس کا لازمی پھل

اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر ایمان لانے سے انسان کی زندگی پر یہ اثر پڑے گا کہ وہ جس کتاب کو من جانب اللہ مانتا ہے اس سے شدید محبت رکھے گا، اس کو چاہے گا، اس کی تعلیم وہدایت اور رہنمائی پر پورا بھروسہ واعتماد کرے گا اور اسی کو زندگی کا دستور بنائے گا، اسی کے مطابق چلنے میں خیر و نفع کی امید رکھے گا اور اس کے خلاف کرنے سے لرزاں و ترساں رہے گا۔

اگر کوئی قوم یا فرد کتاب اللہ پر ایمان لانے کا مدّعی ہے، مگر اس کو اپنا دستور نہیں بناتا یا اس کے مطابق چلنے میں نفع وخیر کی امید نہیں رکھتا اور اس کے خلاف چلنے سے لرزاں و ترساں نہیں تو ایسا شخص اور ایسی قوم کتاب اللہ پر ایمان کے دعویٰ کے باوجود ایمان سے خالی اور اپنے دعویٰ ایمان میں جھوٹی ہے۔

پیغمبروں پر ایمان لانے کا مطلب وخلاصہ

۱.... اللہ تعالیٰ کی مرضی کی اطاعت اور بندگی انسان اپنی عقل سے پوری طرح نہیں کر سکتا اور نہ تنہا عقل کے زور سے شاہراہ زندگی پر چلنے کی مکمل رہنمائی حاصل کر سکتا ہے۔ یہ رہنمائی وحی الٰہی رسالت و نبوت کے ذریعے ملتی ہے اور وحی ورسالت ہر انسان کو نہیں ملتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے منتخب کردہ افراد کو ملتی ہے، ان منتخب افراد کو انبیا ورُسُل کہا جاتا ہے اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنے علم کے مطابق نبی اور رسول بنا کر بھیجتا ہے۔ وحی اور رسالت کا یہ سلسلہ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل و مکمل ہو کر ختم ہو گیا ہے۔

۲.... کسی کو نبی ورسول ماننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ یہ یقین کرے کہ غیبی حقیقتوں کے بارے میں وہ جو کچھ بتاتا ہے اور ہم کو جو ہدایات دیتا ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ ان کی یہ ساری باتیں گویا اللہ تعالیٰ کی باتیں ہیں اور اس کا ہر حکم اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے سب احکام حق ہی حق ہیں جن میں کسی چوں وچراں اور شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی حضرات ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی بتانے والے ہیں، لہٰذا ان کی اطاعت واتباع میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی ہے اور اسی میں انسان کا نفع اور اس کے خلاف میں سراسر نقصان وخسران ہے۔

۳.... جب یہ بات معلوم ہوئی کہ کسی کو نبی ورسول ماننے کے بعد یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کی ہر بات پر ایمان لایا جائے جو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتلائے اور اس کی کسی ایک بات کا انکار بھی اس کی نبوت کا انکار اور کفر ہے تو ہر اس حقیقت اور حکم پر یقین اور عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے جس کی اطلاع سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

غرض یہ کہ پیغمبر کے ہر حکم اور ہر فیصلے کا ماننا شرطِ ایمان ہے۔ جو شخص پیغمبر کے ایک حکم کے ماننے سے بھی انکار کرے وہ مؤمن نہیں ہو سکتا، البتہ جن مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک زمانہ نہ پایا ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات ان کو دوسروں کے واسطے سے پہنچی ہوں (جیسا کہ ہمارا حال ہے) ان کے لیے یہ حیثیت صرف ان ہی عقائد اور احکامات کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے قطعی اور یقینی طریقہ سے ثابت ہیں جن میں کسی شک وشبہ اور کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں اور ہر دور میں ان کی شہرت بھی اتنی عام رہی ہے کہ دین سے معمولی واقفیت رکھنے والی عوام بھی ان سے واقف رہی ہو جیسا کہ ضروری عقائد، نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی فرضیت وغیرہ اور جن چیزوں کی قطعیت، ان کا یقینی ہونا اور شہرت اس درجہ کی نہیں (اگرچہ ان کا ثبوت ہمارے لیے قابلِ

اطمینان ہو) تو ان کی حیثیت اور ان کا حکم یہ نہیں یعنی ان کا انکار کرنا بھی اگرچہ ایک درجہ کی گمراہی ہے لیکن کفر نہیں۔①

۴....اللہ تعالیٰ کے تمام رسول اور تمام انبیا علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے بندے انسان و بشر ہوتے ہیں، لیکن وہ انسانیت کے حقیقی اور بلند ترین نمونے ہوتے ہیں۔ وہ احکام، اخلاق اور فضائلِ اعمال کے مظہر اور زندہ شخصیات ہوتے ہیں، ان کا تعلق مافوق الفطرت مخلوق سے نہیں ہوتا، نہ وہ خدا ہوتے ہیں، نہ خدائی میں شریک ہستیاں اور نہ خدا کی اولاد، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور انسان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی انہیں اپنے بندوں تک احکام پہنچانے کے لیے مقرر فرماتا ہے۔ وہ سچے ہوتے ہیں کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام پورے پورے پہنچادیتے ہیں ان میں کمی بیشی نہیں کرتے اور نہ وہ کسی پیغام کو چھپاتے ہیں اور نہ جھوٹ موٹ کے لباس اور شکل و صورت کو اختیار کرتے ہیں۔ خود ساختہ انداز، تکلّف و تصنّع اور بناوٹ سے اپنی پوری زندگی میں بالعموم اور اپنی دعوت کی گفتگو اور دلائل میں بالخصوص بہت دور رہتے ہیں:

قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ۝۸۶ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۝۸۷

"میں تم سے اس کا صلہ نہیں مانگتا اور نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں۔۔۔" (ص:۸۶-۸۷)

۵....وہ معصوم اور پاک ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اول سے آخر تک اس قدر سلیم الفطرت اور سلیم القلب ہوتے ہیں کہ ان سے ارادہ کے ساتھ گناہ اور خطا کا صدور ناممکن ہوتا ہے۔

۶.... کوئی شخص بھی اپنی کوشش، عبادت اور ریاضت سے نبی و رسول نہیں بن سکتا اور نہ اس میں کسی شخص کے ارادے کو کوئی دخل ہوتا ہے، بلکہ یہ عطائے الٰہی ہے جس کو چاہا اسے رسالت و نبوت کے اس عظیم منصب کے لیے منتخب فرمایا۔

۷....اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بہت سے پیغمبر بھیجے ہیں ان کی ٹھیک تعداد اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے نام معلوم ہیں جیسے حضرت آدم علیہ السلام، حضرت ادریس علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام وغیرہ۔ اور بہت سے انبیا علیہم السلام کے نام و حالات سے ہم ناواقف ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں، ان سب کو برحق مانتے ہیں۔

۸....دنیا میں آنے اور بعثت کے لحاظ سے سب سے پہلے پیغمبر حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور سب سے آخر خاتم الانبیا

① اس کا مفصل بیان "مسلک اعتدال" میں پڑھ لیجیے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ان پر نبوت ختم ہو گئی، ان کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا اور نہ کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی جدید شریعت اور الہامی کتاب کی بلکہ آپ ﷺ کی نبوت و رسالت دنیا کے تمام انسانوں اور جنات کے لیے قیامت تک رہے گی، البتہ نبی کریم ﷺ کے بعد نظامِ بندگی یعنی عدل و قسط کے نظام اور خلافت کو علیٰ منہاج الرسول ﷺ قائم کرنا اور رکھنا امت کا بنیادی فریضہ ہے اور اب قیامت تک لوگوں کی نجات و فلاح صرف خاتم الانبیا سیدنا و مولانا محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیمات و ہدایات کی اتباع اور پیروی میں ہے۔ آپ ﷺ کے بعد جو شخص بھی نبوت اور پیغمبری کا دعویٰ کرے وہ کذّاب اور جھوٹا ہے۔

۹.... منصبِ نبوّت کے اعتبار سے تمام انبیا علیہم السلام برابر ہیں، لیکن فضیلت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فوقیت عطا فرمائی ہے۔ تمام پیغمبروں میں سب سے زیادہ فضیلت اللہ تعالیٰ نے نبی کریم سیدنا محمد ﷺ کو عطا فرمائی ہے۔ حضور ﷺ عرب کے بہترین خاندان قریش میں سے ہیں اور پھر قریش میں سب سے اعلیٰ شاخ بنی ہاشم میں سے ہیں۔ آپ ﷺ کے والد کا نام عبد اللہ اور دادا کا نام عبد المطلب اور پردادا کا نام ہاشم ہے تو یہ سلسلہ نسب اس طرح ہوا۔

حضرت محمد (ﷺ) بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف۔ آپ ﷺ حضرت اسماعیل علیہ السلام (جنھوں نے اپنے آپ کو اللہ کا حکم بجالانے کے لیے ذبح کرنے کے لیے پیش کیا تھا) کی اولاد میں سے ہیں اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ و السلام کے صاحبزادے ہیں۔

انبیا علیہم السلام پر ایمان لانے کے زندگی پر اثرات

انبیا علیہم السلام اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی وجہ سے انسان کی زندگی میں لازماً تبدیلی آئے گی، اس کی پوری زندگی نبی کریم ﷺ کی سنت اور طریقے کے مطابق ہو گی اور اسی میں خیر اور نفع دیکھے گا اور پائے گا، جو شخص نبی کریم ﷺ کی ان باتوں کی اتباع اور پیروی نہیں کرے گا جو آپ ﷺ سے یقینی طور پر یا قابلِ اطمینان طور پر ثابت ہیں تو اس کا حقیقی ایمان نہیں، بلکہ ایمان کا زعم اور خیال ہے، ایسا شخص صرف خوش فہمی میں مبتلا ہے حالانکہ نجات کا دارومدار خوش فہمیوں پر نہیں، بلکہ حقیقی ایمان پر ہے۔

آخرت پر ایمان لانے کا مختصر مطلب

آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ یہ یقین کرے کہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری زندگی اور ایک دوسرا عالَم آنے والا ہے۔ وہاں انسان کو اس کے اچھے اور برے ارادوں اور اعمال کی جزا و سزا ملے گی اور اس میں

انسان اپنے ہر ارادے، قول اور فعل کا جواب دہ ہو گا۔اس عقیدہ کی ضروری تفصیل یہ ہے:

ا.... انسان دنیا میں غیر ذمہ دار نہیں ہے، بلکہ دنیاوی زندگی کی ہر اختیاری حرکت، قول و فعل اور نیت کے لیے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ ہے۔

۲.... جس طرح انسان دنیا میں ہمیشہ نہیں رہتا اسی طرح دنیا کا یہ نظام بھی ہمیشہ کے لیے نہیں، بلکہ اس نظامِ عالَم کے لیے بھی موت کا وقت مقرر ہے، یہ مقررہ وقت پر درہم برہم ہو جائے گا، اس کو قیامت کہا جاتا ہے۔

۳.... اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک دوسرے عالَم میں پوری نوع انسانی کو جو ابتداء سے قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی بیک وقت اٹھائے گا اور سب کو جمع کر کے ان کے اعمال کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے کی رو سے جو لوگ نیک نکل آئیں گے وہ جنت اور دائمی خوشیوں پر خوشیاں حاصل کریں گے اور جو لوگ اس فیصلے کی رو سے بد ٹھہریں گے وہ جہنم میں پھینک دیے جائیں گے۔

۴.... موت واقع ہونے سے انسان ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتا ہے مثلاً دادا کی پشت سے باپ کی پشت میں، باپ کی پشت سے ماں کے پیٹ میں آگئے، اس میں صورت اور جسم کا ڈیل ڈول بنا اور اب دنیا کے پیٹ میں آئے، اس میں آکر ہر انسان سیرت بنا کر دنیا سے چلا جاتا ہے، پھر جو شخص مر جاتا ہے تو وہ اس کے بعد ایک اور زندگی یعنی قبر اور برزخ کی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے، وہاں اس کی سیرت کے مطابق معاملات شروع ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اپنی سیرت کے مطابق خوشی وراحت یا غم وتکلیف اور درد اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق پالیتا ہے، پھر جب دنیا پر اجتماعی موت طاری ہو جائے گی اور یہ نظامِ عالَم درہم برہم ہو جائے گا تو اس کے بعد تمام لوگ برزخی اور قبر کی زندگی کے بعد ایک اور قسم کی زندگی میں داخل ہو جائیں گے۔

لہٰذا آخرت سے مراد انسان کی پچھلی اور بعد میں آنے والی زندگی ہے اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل ومقامات اور حالات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے (جو انسان کے جسم اور اس کے اعضا اور رگ وریشہ پر طاری ہوتی ہے) لے کر حشر ونشر اور اس کے بعد تک پیش آتے ہیں یا پیش آئیں گے۔ اس بات کی تصدیق خود نبی کریم ﷺ کی حدیث میں بھی موجود ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قبر (برزخ) آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔(حاکم، ترمذی ابن ماجہ)

بہر حال انسان ختم نہیں ہوتا، بلکہ اس کے جسم پر موت طاری ہو جاتی ہے، انسان خود بھی اس موت کا مزہ چکھ

لیتا ہے اس طرح وہ ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک مقام سے دوسرے مقام میں منتقل ہوتا ہے اور پہلی جگہ سے دوسری جگہ کو اپنی وسعت اور خوشی یا اس کے برعکس پریشانیوں اور دکھ درد میں بڑھا ہوا پاتا ہے۔

۵.... اس سے معلوم ہوا کہ کامیابی وناکامی کا اصل معیار دنیا کی خوشحالی و بدحالی نہیں، بلکہ در حقیقت فلاح پانے والا کامیاب انسان وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے کی رو سے کامیاب ٹھہرے اور ناکام وہی ہے جو پچھلی اور بعد میں آنے والی زندگی اور آخری فیصلے میں ناکام رہے۔

آخرت پر ایمان لانے کا لازمی اثر و نتیجہ

۱.... آخرت کو ماننے والا شخص بڑا ذمہ دار ہوتا ہے۔

۲.... وہ غریبوں، مسکینوں اور بے کسوں کا خیال رکھے گا اور ہر ذی حق کو اپنا حق پورا پورا دے گا اور دلوائے گا۔

ایک کاشتکار اپنی ڈھیروں من گندم زمین میں بکھیر دیتا ہے اور صبح و شام مشقت کرتا ہے، یہ صرف اس لیے کہ اس کو گمان ہوتا ہے کہ اس سے مستقبل میں کئی سو گنا زیادہ گندم ملے گی تو جس شخص کا آخرت پر ایمان ہو تو وہ فقیر و یتیم اور ہر ذی حق کو حق دے کر خوش ہو گا اور اس کو وہ غنیمت سمجھے گا کہ اس کا ثمرہ مستقبل اور آخرت میں ضرور ملے گا۔

۳.... وہ زندگی کے کسی لمحے کو ضائع کرنے سے پریشان اور شرمندہ ہو گا اور اپنے لمحات کو آخرت کے لحاظ سے قیمتی سے قیمتی بنانے کی کوشش کرے گا۔ جو کام اس کی آخرت اور دوسری زندگی کے لیے مفید ہو اگرچہ اس کام کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں اسے سخت دکھ درد یا سخت مشقت یا سخت نقصان اٹھانا پڑے بہر حال وہ اس کام اور بات کو کر گزرے گا جس سے اس کی آخرت سنورتی ہے اور ہر اس کام سے پرہیز کرے گا جس سے اس کی آخرت کی زندگی پر زد پڑتی ہے اگرچہ دنیا کی زندگی میں اس بات کی وجہ سے اس کو بڑی راحت، عزت اور بہت مال و دولت حاصل ہونے کا یقین ہو۔

۴.... وہ ہر اچھا اور نیک کام اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے اور اس پر کسی دنیاوی غرض کے بجائے آخرت میں جزا و ثواب کا امیدوار ہوتا ہے۔ اس میں ریاکاری کی گنجائش نہیں ہوتی جیسا کہ ایک کاشتکار اور باغبان اپنی کاشت اور مشقت کے بارے میں یہ گمان رکھتا ہے کہ ایک ایک تخم کے بدلے سینکڑوں ہزاروں گنا ملتا ہے تو دن رات محنت کرتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے یا نہیں وہ ایسی تمام باتوں اور نمائشوں سے بے فکر ہو کر محنت کرتا ہے، اسی طرح آخرت پر ایمان رکھنے والے کی نظر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے نتائج پر ہوتی ہے نہ کہ

لوگوں پر کہ وہ دیکھتے ہیں یا نہیں یا لوگوں کو میرے کارِ خیر کا علم ہو رہا ہے یا نہیں، وہ ایسی تمام باتوں سے بے پرواہو کر آخرت کی کھیتی میں عمل کرتا ہے۔

۵.... جو شخص یتیموں، بے کسوں اور غریبوں کا خیال نہیں رکھتا اور دنیا کی عارضی لذّت راحت اور عزت کو اپنا کر آخرت کی زندگی کو نظر انداز کرتا ہے اور وہ اپنے دنیوی معاملات اور مفادات میں تو محتاط ہوتا ہے مگر آخرت کے معاملے میں سرسری توقعات کو کافی سمجھتا ہے یا آخرت کے معاملہ میں باطل شفاعتوں اور سفارشوں پر سہارا کیے ہوئے ہوتا ہے تو ایسے شخص کا آخرت پر ایمان نہیں اور وہ دعویٰ ایمان کے باوجود بے ایمان اور اپنے دعوی ایمان میں جھوٹا ہے۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص آخرت کی دائمی عزت اور خوشی پر دنیا کی عزت وراحت کو ترجیح دیتا ہے ایسا شخص آخرت پر ایمان رکھنے والا نہیں اور ایسا شخص جو کارِ خیر بھی کرتا ہو گا تو اس کے پیش نظر دنیا کی عزت یا اور کوئی دنیوی مفاد ہو گا۔ یہی ریاء کاری اور نمائشی زندگی ہوتی ہے جو آخرت کے مقصد سے خالی ہو کر انسان کی پوری زندگی کو ایک کھیل تماشا بنا کر رکھ دیتی ہے۔

باب..... تقدیر

مذکورہ بالا پانچ عقائد کے علاوہ اسلامی عقائد میں سے عقیدۂ تقدیر بھی ہے جو کہ ایک غیبی حقیقت ہے اور قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات سے صاف صاف ثابت ہے، نیز یہ تقدیر اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت اور قدرت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ عقیدۂ تقدیر سے انکار دراصل اللہ تعالیٰ کے لامحدود علم وحکمت اور قدرت کا انکار ہے۔ اس عقیدے کا انکار بہت ہی عظیم گمراہی اور ضلالت ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب اس عقیدہ کو سمجھیے۔

عقیدۂ تقدیر کا مطلب

عقیدۂ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات میں جو بھی چیز موجود ہے یا آئندہ پیدا ہوگی اللہ تعالیٰ نے اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے ذرات کی تعداد، اس کے عناصر کی نوعیت اور مقدار وغیرہ ہر چیز طے کردی ہے اور یہ کہ وہ اس دنیا میں کیا کرے گی؟ کتنی مقدار میں وہ اپنا کام کرے گی؟ اس کی کیا صورت ہوگی؟ اس کی خصوصیات وصفات کیا ہوں گی؟ کس مقام اور کس جگہ میں ہوگی؟ وہ کس وقت وجود میں آئے گی؟ اور اس پر طاری ہونے والی ہر حرکت وسکون کی کیفیت اور اس کے وجود میں آنے اور اس کے بقاو قیام کے ذرائع او اسباب کیا ہوں گے؟ اور اس سے کیا کیا نتائج برآمد ہوں گے؟

غرض اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہر چیز کے متعلق ایک اندازہ اور منصوبہ مقرر فرمایا ہے۔ دنیا کا ایک ایک ذرہ اور ہر ایک چیز کے متعلق پوری تفصیلات اللہ تعالیٰ نے پہلے سے طے کر رکھی ہیں۔ اس اندازے اور منصوبے کے مطابق کائنات کا سارا نظام چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم وحکمت سے مقرر اس اندازے کو تقدیرِ الٰہی یا مقدر کہا جاتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات پر یقین کیا جائے اور مانا جائے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اور ہورہا ہے یا جو کچھ ہوگیا یا آئندہ ہوگا وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ کے علمِ سابق اور اس کے مقررہ اندازے کے مطابق ہورہا ہے، اس حقیقت کو قرآن مجید میں بار بار دہرایا گیا ہے یہاں بطورِ نمونہ چند آیتوں کو ذکر کردیتا ہوں:

۱..... سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ﴿١﴾ الَّذِىْ خَلَقَ فَسَوّٰى ﴿٢﴾ وَالَّذِىْ قَدَّرَ فَهَدٰى ﴿٣﴾

"اپنے عالیشان پروردگار کے نام کی تسبیح بیان کیجیے جس نے (ہر چیز کو) پیدا کیا پھر (صحیح تناسب سے اس کو مختلف مراحل سے گذار کر نوک پلک کو) درست کیا اور جس نے (ہر چیز کی) تقدیر بنائی (یعنی اس کا خاص اندازہ مقرر کیا) پھر اسے (حفظ وبقا اور تکمیل ومقصد تک پہنچنے کی) راہ دکھائی۔" (اعلیٰ:۱-۳)

۲.... زمین کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَاتَهَا

"زمین کے اندر اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔" (حم سجدہ:۱۰)

۳.... اور سورج و چاند کے متعلق ارشاد ہے:

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ﴿٣٨﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنَاهُ مَنَازِلَ.........

"اور سورج ہے جو اپنے ٹھکانے کی طرف چلتا رہتا ہے اور یہ تقدیر (یعنی اندازہ و حساب اور مقررہ نظام) اس ہستی کا ہے جو زبردست اور علیم ہے اور چاند ہے اس کے لیے ہم نے منزلیں اندازہ (مقرر) کر دی ہیں"۔ (یٰسین:۳۸-۳۹)

۴.... اور انسان کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

مِن نُّطْفَةٍ ۚ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ﴿١٩﴾ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ﴿٢٠﴾

"(پانی کی) ایک بوند سے اس (انسان) کو پیدا کیا، پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا (اور خاص انداز کے مطابق اس کی شکل و صورت بنائی) پھر اس کے لیے (ولادت اور مہد سے لے کر لحد تک اور مادی و روحانی اور ابدی فلاح و نجات کی) راہ آسان کر دی۔" (عبس:۱۹-۲۰)

۵.... ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

قَدْ جَعَلَ اللَّهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ﴿٣﴾

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ بنالیا ہے۔" (طلاق:۳)

۶.... ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا ﴿٢﴾

"اور اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر ایک تقدیر (اندازہ) مقرر کیا۔" (فرقان:۲)

اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور تقدیر ہر چیز کے لیے ہے

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور جس چیز کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس مقصد کے اعتبار سے اس کو خاص قالب، وصورت اور صلاحیتیں عطا فرمائی اور پھر اسی کی تحصیل و تکمیل کے لیے اس کے اندر ایک جبلی اور فطری رہنمائی بھی رکھ دی ہے مثلاً شہد کی مکھی کو شہد بنانے کے لیے پیدا فرمایا ہے تو مقصد وجود کے مطابق اس کی صورت بنائی اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس کے ننھے سے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے وہ تمام قوتیں اور

صلاحیتیں رکھ دی ہیں جو اس کے لیے ضروری ہیں اور پھر اس کو جبلّی اور فطری طور پر یہ الہام بھی فرمایا کہ وہ کس طرح اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو استعمال کرے اور اپنے شہد کا ذخیرہ حاصل کرے، یہی حال کائنات کی ہر چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز کا ہے۔

یہی حال ہر جاندار و بے جان چیز کا ہے، چاند، سورج، ہوا، پانی، درخت، جڑی بوٹی، گھاس، ہر چیونٹی و مکڑی، چرند پرند اور ہر درندے کا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک قسم کی خلقت اور اس کی ضرورت کے اعتبار سے ایک فطری رہنمائی وہدایت عطا ہوتی ہے اور ہر ایک چیز پر اپنی ترقی، اپنی بقا و حفاظت اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے طریقوں کو کھول دیا ہے۔

بچے کو دیکھیے! کہ اس کو غذا کا محتاج بنایا ہے تو اس کے لیے غذا کا انتظام بھی فرمایا، دودھ پینے والے بچے کی ماں کے پستانوں میں دودھ پیدا کرتا ہے اور پھر بچے کو یہ رہنمائی دی ہے کہ وہ ماں کے پستانوں کو چوسے اور اسی سے اپنی غذا حاصل کرے اور جو بچے دودھ نہیں پیتے مثلاً چڑیا کا بچہ تو اس کی رہنمائی یوں ہے کہ وہ اپنے منہ کو کھلا رکھے ہوئے ہوتا ہے اور ماں اس کے منہ میں غذا ڈالتی ہے۔[1]

اس کائنات میں انسان بھی ہے جس کو اشرف المخلوقات کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے بہترین خلقت بھی عطا فرمائی ہے اور نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے جبلی اور فطری رہنمائی کے ساتھ ساتھ عقل و شعور اور ادراک کی ہدایت و رہنمائی سے بھی نوازا ہے جس کی وجہ سے وہ خشکی و تری، نباتات اور حیوانات پر حکومت کرتا ہے اور انہیں صلاحیتوں کی وجہ سے کائنات کی چیزیں اس کے لیے مسخر ہیں اور اس میں طرح طرح کے تصرُّفات اور ایجادات کرتا رہتا ہے، اس طرح اس کی روحانی و اخلاقی ترقی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر خیر و شر کی تمیز اور شعور ودیعت فرمایا ہے اور پھر اس کی رہنمائی کے لیے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا کہ وہ بتائیں اور سکھائیں کہ زندگی کا کون سا طریقہ اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اور اس کے اختیار کرنے میں وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے جس کے لیے اس کو بنایا گیا ہے اور وہ کون سا طریقہ ہے جس کو اپنا کر وہ ابدی فلاح و نجات پا سکتا ہے اور کون سا طریقہ اس کی فطرت سے متصادم اور بے جوڑ ہے اور اس پر چلنے میں اس کی صلاحیتوں کی دنیا اور آخرت کی تباہی و بربادی ہے، پھر اس کے وجود اور ولادت سے لے کر اس کی موت تک کے سارے مراحل و مقامات، تمام اطوار و ادوار اور جملہ امتحانات وغیرہ بھی اللہ تعالیٰ نے مقدّر

---

[1] اس کا پورا بیان وحی رسالت کے باب میں موجود ہے۔ مختار

فرمائے ہیں جو لازماً پیش آکر رہتے ہیں، پھر ان سے عہدہ بر آہونے کا طریقہ بھی اس نے بتادیا ہے، اگر انسان وہ طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ سلامتی سے ان کٹھن مراحل سے گزر جاتا ہے، دائمی ترقیاں اور ابدی خوشیاں پالیتا ہے اور اگر وہ اس سے ہٹ کر اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو یہ چیز اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہے۔ ان ساری چیزوں کے قوانین اور اندازے اللہ تعالیٰ کے یہاں مقرر ہیں اور یہی وہ تقدیر ورہنمائی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے: وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰیْ ”اور جس نے مقدر کیا پس ہدایت بخشی۔“

مذکورہ بالا چند آیتوں اور ان پر بحث سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر، اندازہ اور اس کی ہدایت ورہنمائی کائنات کی ہر ہر چیز کے لیے ہے، اس سے کوئی بھی چیز مستثنیٰ نہیں اور یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں اور مخلوقات میں سے ایک مخلوق انسان بھی ہے۔ اسی انسان کی وجہ سے یہ مسئلہ تقدیر ذرہ سا الجھ جاتا ہے کیونکہ کائنات میں انسان ہی ایک ایسی ہستی دیکھنے میں آتی ہے جس میں عقل وارادہ کا کھل کر مشاہدہ ہو رہا ہے۔

انسان مجبور یا مختار؟

اس سے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ یہ بحث اس لیے پیدا ہو جاتی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی تقدیر بنائی ہے تو پھر انسان کے افعال کی حقیقت کیا ہے؟ کیا ان میں انسان مجبور سمجھ لیا جائے یا مختار؟

اگر انسان مختار مانا جائے تو پھر لازمی طور پر اس میں قدرت واختیار کی صفت بھی تسلیم کرنی ہوگی اور جب انسان میں قدرت واختیار کو تسلیم کیا جائے تو ایسی صورت میں قضاوقدر کے سامنے انسان کے مجبور ہو جانے کا کوئی معنی باقی نہیں رہتا۔

اور اگر انسان اپنے فعل میں مجبور سمجھا جائے تو یہ اس کے اختیار وقدرت کا انکار ہے اس لیے انسان کے افعال سے متعلق قضا وقدر کے مسئلہ میں مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے جبریہ اور قدریہ وغیرہ جیسے مختلف فرقے ظہور میں آجاتے ہیں حالانکہ مذکورہ بالا بیان میں اگر غور وفکر کیا جائے تو ان تمام سوالات کا حل نکل جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کے متعلق کچھ تفصیل سے ذکر کر کے اس کو ایک اور انداز سے بھی پیش کرتے ہیں تاکہ اس مسئلہ کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

درحقیقت مخلوق میں کوئی کمال نہیں اس میں جو بھی کمال نظر آتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر ایک چیز کو پیدا فرمایا۔ اس کے کام اور اس کے فرائض کے مطابق اسے وجود بخشا اور اسی کے مطابق اس میں صلاحیتیں رکھ دی ہیں اور اس کی اس خداداد وجود اور صلاحیتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ اس میں حسن وخوبیاں اور فائدے وکمالات پیدا کرتا ہے۔

مثلاً پھولوں میں خوشبو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن سننے وغیرہ کی نہیں، اسی طرح پانی میں جو صلاحیتیں ہیں وہ پتھر میں نہیں اور پتھر میں جو ہیں وہ تمام کی تمام پانی میں نہیں، یہی حال تمام چیزوں کا ہے، بلکہ ایک قسم کی چیزوں میں اختلاف موجود ہے بلکہ ایک ہی درخت کے پھول اور پھل اگرچہ بظاہر شکل وصورت اور مزہ میں بالکل ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں لیکن وہ بھی بالآخر کسی نہ کسی نقطے پر ہر ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں، بہر حال کائنات کی کسی بھی چیز میں کمال وحسن نہیں، بلکہ پردہ کائنات پر جو بھی حسن وکمال نظر آرہا ہے یہ سب کچھ چیزوں کی استعداد اور صلاحیتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے آرہا ہے، صرف ایک اللہ تعالیٰ ہی ہے جو بے انتہا اور غیر محدود صفات وکمالات کا مالک ومختار ہے اور اپنی مخلوق اور اس کائنات کی طرف مسلسل بغیر کسی انقطاع کے متوجہ رہتا ہے اور وہ ہر ایک چیز کو اپنی اپنی ساخت اور صلاحیت کے مطابق فیض اور فائدہ پہنچاتا رہتا ہے۔

مخلوقات میں نقصان کا نظر آنا اور اس کی وجہ

اس سے یہ راز بھی کھل گیا کہ دنیا میں کچھ چیزیں جو ہمیں ناقص نظر آرہی ہیں وہ اس لیے نہیں کہ (العیاذ باللہ) کامل اور باکمال ہستی اللہ رب العالمین سے ناقص مخلوق پیدا ہو جاتی ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مختلف چیزوں میں مختلف اوقات میں بتدریج ان کی استعدادوں کے مطابق خوبیاں اور فائدے پیدا کررہا ہے، کسی میں ایک فائدہ، کسی میں دو فائدے، کسی میں تین، کسی میں چار فائدے اور خوبیاں، اس طرح کسی میں کم کسی میں زیادہ تو جن چیزوں میں دوسروں کی نسبت کم خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان دوسری چیزوں کے مقابلے میں ناقص دکھائی دیتی ہیں حالانکہ اس چیز میں ضرور بالضرور کوئی نہ کوئی فائدہ وکمال ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کی گئی ہے۔

اس تفاوت وفرق کی وجہ سے اس کائنات کا یہ نظام چل رہا ہے۔ اگر کائنات کی چیزوں میں یہ مختلف استعدادیں اور یہ کمی بیشی کا اختلاف نہ ہوتا اور کسی میں کم اور کسی میں اس کے مقابلے میں زیادہ صلاحیتیں نہ ہوتیں تو دنیا کی یہ تمام

چیزیں ایک چیز بن کر دنیا کا یہ نظام درہم برہم ہو جاتا۔ غرض اللہ تعالیٰ کی ہر صفت اور ہر کمال ہر لحاظ سے کامل ومکمل لامحدود اور بے انتہا ہے اور مخلوق میں جو کچھ بھی دکھائی دیتا ہے وہ سب کچھ ضعیف در ضعیف محدود اور ناقص ہے جیسا کہ اس کی تفصیل "صفات الٰہی کے بیان" میں گذر چکی ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ کی صفات کا عکس اور سایہ ہوتا ہے؟

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی صفات کا ظہور چیزوں میں ہو رہا ہے یا یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے سائے اور عکس ہیں یا کوئی شخص اللہ تعالیٰ یا اس کی صفات کا مظہر ہے، یہ تمام تعبیرات عام آدمی کے عقیدے میں کئی خرابیاں پیدا کرتی ہیں:

۱.... ایک یہ کہ اس سے حلول کا عقیدہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

۲.... دوسری بات یہ کہ اس کی وجہ سے مخلوق کا اللہ تعالیٰ یا اس کے صفات کے مشابہ ہونے کا خیال وگمان پیدا ہو جاتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات اور ہر لحاظ سے یکتا اور بے مثل ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ

۳.... تیسرا نقصان اس کا یہ ہے کہ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ بے اختیار قوانین کا مجموعہ ہے جس سے اس کے اختیار کے بغیر خود بخود چیزیں اور چیزوں کی صفات وجود میں آتی ہیں جیسے کہ سورج سے بغیر اس کے اختیار کے گرمی اور روشنی کا ظہور ہوتا ہے اور میدان میں بکھرے ہوئے مختلف رنگوں کے شیشوں سے رنگ برنگ شعاعیں نکلتی ہیں۔ یہی حال عکس اور سایہ کا ہوتا ہے ہر چیز کا عکس اور سایہ اس چیز کے اختیار اور قدرت سے باہر ہوتا ہے، پانی میں انسان کی صورت نظر آتی ہے وہ چاہے یا نہ چاہے اس کی صورت پانی میں دکھائی دے گی یہی حال سایہ کا ہے۔

اسی طرح ایسی تعبیرات میں کئی اور خرابیاں بھی ہیں لہٰذا ایسی تعبیرات سے بچنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہمارے اسلاف کے مضامین اور کتابوں میں اگر ایسی تعبیرات مل جاتی ہیں تو ان کا مطلب یہی لینا چاہیے کہ ان چیزوں میں ساری کی ساری خوبیاں جو نظر آتی ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اس کی خداداد استعداد اور وجود کے مطابق حسن وکمال اور فائدے پیدا کر دیتا ہے۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے ظلال سائے اور عکس نہیں، بلکہ قادرِ مطلق مختار کل ذات کی ذاتی صفات اور اس کی قدرت کے آثار اور کرشمے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خلافتِ انسانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں بہت کچھ صلاحیتیں ہونی چاہئیں

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی ہر ایک چیز میں اس کے وجود، صلاحیت اور استعداد کے مطابق خوبی و کمال پیدا کرتا ہے تو اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مقامِ خلافت پر فائز کیا ہے اور اسی وجہ سے تمام کائنات کے مقابلہ میں اس کو بہت ہی زیادہ صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ اس لیے مختلف مدارج کے لحاظ سے اجمالی طور پر جس قدر خوبیوں اور کمالات کا ظہور انسان سے ہوتا ہے کسی دوسری مخلوق میں وہ دکھائی نہیں دیتا انسان دیکھتا ہے سنتا ہے عقل و شعور رکھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسان میں بینائی، شنوائی اور عقل و شعور وغیرہ کی قوتیں اور صلاحیتیں رکھ دی ہیں اسی طرح اس سے ارادہ اور اختیار کا ظہور بھی ہوتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی نیابت اور نمائندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان میں اختیار اور ارادہ کی پوری قوتیں موجود ہوں تاکہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکے اور انسان کا یہی اختیار تقریباً اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں دکھائی دے رہا ہے، ملائکہ نے انسان کی پیدائش کے موقع پر جو یہ پیشگوئی کی تھی کہ یہ انسان زمین پر فساد اور خون ریزی کرے گا شاید اس پیشگوئی کی وجہ بھی یہ تھی کہ انسان جیسے ظلوم وجہول کو جب اختیار دے دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ اس قوت اختیار کو غلط استعمال کر کے فتنہ و فساد برپا کر دے گا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسان کی علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ فرشتوں کے سامنے کرایا اور انہیں یہ بتلا دیا کہ یہی تو ہے جو نیابت اور خلافت کا فریضہ انجام دے سکتا ہے کیونکہ جس طرح اس میں دوسری صلاحیتیں اور قوتیں ہیں اسی طرح اس میں علم، رحم اور عدل وغیرہ جیسی صفات قبول کرنے اور اللہ تعالیٰ سے تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم حاصل کرے گا اور اپنے اختیار کو صحیح طور پر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے مطابق استعمال کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ کی نیابت اور خلافت کی ذمہ داری پوری کرے گا اور اس میں اس کی پوری صلاحیت موجود ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ایک طبقہ (یعنی پیغمبروں کا طبقہ) ایسا پیدا کیا جو اپنی خداداد صلاحیتوں اور بلند ترین فطرت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم پانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اور پھر انہی کے واسطے سے ان کی امت خدائی تعلیم کو حاصل کر کے اپنے اختیارات کی حدود کو پہچانتی ہے اور اس پر عمل کرتی ہے اور پیغمبروں کے اس عظیم طبقہ کے آخری اور مکمل ترین انسان حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے بعد کوئی بھی نبوت لے کر نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ بندوں پر جبر نہیں کرتا، اس سے متعلق احادیث

بعض لوگوں نے تقدیر کا بہت ہی غلط مطلب لیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جبر کر کے ان پر فیصلہ مسلّط کرتا ہے اور وہ اپنے افعال کے ارتکاب میں مجبور محض ہوتے ہیں۔ ایسے ناسمجھ اور کم فہم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے احکام کی خلاف ورزی کر کے اپنی بے گناہی کے لیے بعض حدیثوں کو بھی آڑ اور بہانہ بنالیتے ہیں۔

۱.... مثلاً یہ کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی باہم ملاقات ہوئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے کہا کہ آپ ابو البشر ہیں آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور اپنی روح پھونک دی اور آپ کو ہر چیز کے نام سکھائے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو اور ہمیں جنت سے نکلوایا؟

حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا تم موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے رسول ہو تم سے اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور تم نے تورات پڑھی ہے کیا تم نے اس میں یہ نہیں دیکھا ہے وَعَصٰی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی اور آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور (اپنی مراد پانے میں) بھٹک گئے۔ یہ میری پیدائش سے چالیس سال قبل لکھ دی گئی تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہاں! حضرت آدم علیہ السلام نے کہا پھر ایسی بات پر مجھے کیوں ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے میرے لیے مقدر فرمائی تھی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَحَجَّ اٰدَمُ مُوْسٰی "پس آدم علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام پر (دلیل میں) غالب آگئے۔ (بخاری)

اس مضمون کی حدیث مسلم نے بھی روایت کی ہے۔ اس حدیث کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام لکھی گئی تقدیر کو اپنے گناہ کے لیے بھی تقدیر کا بہانا بنالیتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: "(حضرت) آدم (علیہ السلام) موسیٰ (علیہ السلام) پر حجت میں غالب آگئے۔" کا مطلب بھی وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے بندہ کے لیے جو کچھ مقدر کر رکھا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو اسی عمل کرنے پر مجبور کر دیتا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کے افعال و اعمال، ان کی کمائی اور ان کے خطاءً یا قصداً و عمداً گناہوں میں مبتلا ہونے کا پیشگی علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ میرے بندے اپنے خداداد اختیار سے یہ سب کچھ کریں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں بھی حضرت آدم علیہ السلام کی دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ

آدم علیہ السلام شیطان کے فریب میں آکر اپنی خواہش اور اپنے اختیار سے اس درخت کا پھل کھائیں گے جس سے ان کو منع فرمایا گیا تھا۔ پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا علم غلط ثابت ہوتا تو یہاں حضرت آدم علیہ السلام نے گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یوں کہہ دیا کہ تمہیں صرف اسبابِ ظاہری اور میرا کسب واختیار تو یاد رہا، لیکن تورات کی تختیوں (جو میری پیدائش سے بھی چالیس سال پہلے تیار ہو چکی تھیں) کو صرفِ نظر کر دیا کہ اس میں میرے متعلق یہی لکھا تھا کہ اس سے یہ کام سرزد ہوگا۔ نیز بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ: وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى "اور (اس پر ایمان لانا کہ) خیر وشر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔" اس کا مطلب یہ نہیں کہ خیر وشر والے کام (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے جبراً کرائے جاتے ہیں اور خود اللہ تعالیٰ اس کے مرتکب ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خیر یا شر یعنی اچھے اور برے نتائج اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ انسانوں کو جو راحت ورنج، خوشی وتکلیف، مال ودولت، افلاس، صحت ومرض اور جنت یا دوزخ جو کچھ ملتا ہے سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتا ہے اور یہ سارے نتائج اور ثمرات اللہ تعالیٰ کے قانونِ مشیت، اس کی مقررہ سنت اور قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہیں۔

۲.... ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَوَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهٖ اِنَّ اَحَدَكُمْ يَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَا يَكُوْنُ بَيْنَهٗ وَبَيْنَهَا اِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا.....

"پس اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے تم میں سے کوئی شخص جنتیوں کا سا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور اس پر نوشتۂ تقدیر غالب آتا ہے اور وہ دوزخیوں کا عمل کرنے لگتا ہے اور بالآخر دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے، اسی طرح کوئی شخص دوزخیوں کا سا عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے، اور اس پر نوشتۂ تقدیر غالب آجاتا ہے اور وہ جنتیوں کا عمل کرنے لگتا ہے اور بالآخر جنت میں داخل ہو جاتا ہے"۔ (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، مشکوٰۃ)

اس حدیث کا مطلب بھی یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو مجبور کر کے ان پر نیکیاں یا بدیاں مسلّط کر دیتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بندوں کے خاتمہ کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے کہ کون کس حالت میں مرے گا؟ کفر پر مرے گا یا اسلام پر؟ ایک آدمی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوتا ہے، ماں باپ کو دیکھ کر اسلام کے مطابق نماز روزہ وغیرہ کی پابندی کرتا ہے اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ اسلام کے مطابق گزارتا ہے، لیکن اس کے اندر چھپی ہوئی

بداعمالیوں کے کچھ ایسے جراثیم ہوتے ہیں اور اس کے کچھ ایسے جذبات ہوتے ہیں جن کی پرورش ہوتی ہے، وہ ان نیکیوں پر غالب آجاتے ہیں اور بندہ اس کے بعد یا تو الحاد وزندقہ، کفریہ عقیدہ اور بداعمالیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے یا اسلام پر رہتے ہوئے سخت جرائم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اس پر اس کی موت آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ دائمی یا عارضی جہنم کی سزا کا مستحق بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں اس بندہ کا قرآن وسنت کا انکار کر کے مرتد ہو جانا یا کسی کفریہ عقیدہ اور زندقہ میں مبتلا ہونا یا بداعمالیوں اور سخت قسم کے جرائم میں گرفتار ہونا اس کے اپنے خداداد اختیار کی وجہ سے ہی ہوتا ہے، اسی طرح ایک شخص ایک کافرانہ یا گمراہانہ اور مجرمانہ ماحول ومعاشرہ کے مطابق زندگی گزارتا ہے لیکن اس کے اندر نیکی کے کچھ ایسے مادے اور کچھ ایسی خصلتیں ہوتی ہیں جن کی وجہ وہ توفیقِ الٰہی سے بالآخر کفر وشرک یا گناہوں سے توبہ کر کے اپنے کو اسلامی تعلیمات کے مطابق بنالیتا ہے اور اسی پر اس کو موت آجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور رضا وجنت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس حدیث میں ذرا غور وفکر تو کیجیے! حدیث کی تعلیم وہدایت تو یہی ہے کہ بندے کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ڈرتا رہے، کبھی بھی فخر کی نفسیات میں مبتلا نہ ہو لیکن اگر اس حدیث سے الٹا مطلب لیا گیا تو یہی حدیث جو انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف اور تواضع وانکساری پیدا کرتی ہے اس کے بجائے اس حدیث کو اللہ تعالیٰ سے بے خوف بنائے جانے اور گناہوں پر جری بنانے کا ذریعہ بنالیا جائے گا۔

اس طرح کی حدیثوں کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کو کسی شخص کی حالت کے بدل جانے کا علم پہلے سے تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر وارتداد وغیرہ یا اسلام اور نیکیوں پر آمادہ کیا اور اس کو برے یا اچھے خاتمہ تک پہنچا دیا، بلکہ اس طرح کی حدیثوں کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کو ہر وقت نیکیوں کا پابند رہنا چاہیے، ان میں آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے، اپنے اعمال پر کبھی نازاں نہ ہونا چاہیے اور نہ مطمئن ہو کر یہ سمجھیں کہ بس میں تو فلاح پا گیا اور نہ کسی پر یہ حکم لگائیں کہ وہ جہنمی اور دوزخی ہے، کیا معلوم زندگی کے باقی حصہ میں اس کا رخ اور اس کا خاتمہ کس حالت پر ہونے والا ہے۔

حدیث کی تفصیل گویا یہ ہوئی کہ اچھے برے خاتمہ کا علم اللہ تعالیٰ کو ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ بندہ کب تک جرائم اور بداعمالیوں کی دلدل میں پھنسا رہے گا اور اس کے اندر کون کون سی خوبیاں ایسی ہیں جو بالآخر غالب آجائیں گی اور یہ بندہ بالآخر اپنے اختیار سے جرائم اور گناہوں کو چھوڑ کر توبہ کرے گا اور اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرے گا، اس طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ میرا فلاں بندہ کچھ عرصہ تک دین

دار نظر آئے گا اور لوگوں سے اس کی اندرونی خباثت چھپی ہوئی ہوگی اور یہ خود بھی سمجھے گا کہ بس میں ہی سب سے اعلیٰ یا میں ہی بہتر اور جنتی ہوں۔ لیکن بالآخر اس کی اندرونی خباثتیں غالب آجاتی ہیں اور اس کی شیطانیت بسا اوقات لوگوں کے سامنے بھی آجاتی ہے اور اپنے اختیار وخواہش سے غلط راستوں پر پڑ کر جہنم کا مستحق بن جاتا ہے۔ جو لوگ اس راز کو پائیں گے وہ قطعاً فخر وناز کی نفسیات اور احساسات میں مبتلا نہیں ہوسکتے، ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے خوف وعظمت سے لبریز ہوجاتے ہیں اور وہ سراپا تواضع وانکساری کے پیکر بن جاتے ہیں۔

اس لیے نہ تو اپنے اعمالِ خیر کی توفیق (جو آپ کو مل رہی ہے) سے مطمئن رہیں اور نہ نازاں ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے برابر عمل کرنے اور اپنے ایک ایک لمحہ کو اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں گزارنے کی کوشش کریں اور کسی شخص پر اس کی زندگی میں یہ حکم نہ لگائیں کہ وہ قطعی اور یقینی دوزخی ہے، کیونکہ نجات اور عذاب کا دارومدار انسان کے خاتمہ اور ان اعمال پر ہے جن پر اس کو موت آجاتی ہے۔

بندہ افعال اور اعمال کے لحاظ سے خود مختار ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار وقدرت کی صفت سے نوازا ہے، اس سے انکار کرنا بدیہی وجدان کا انکار ہے کیونکہ ایک بے وقوف سے بے وقوف شخص بھی اختیاری حرکات اور غیر اختیاری حرکات میں فرق کرسکتا ہے، موٹر کار بھی چلتی ہے اور انسان بھی چلتا ہے ہر کوئی جانتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ اور اختیار ومرضی سے چلتا ہے، موٹر اور سائیکل وغیرہ کو مجبوراً چلایا جاتا ہے، وہ اپنے چلنے میں خود مختار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر آدمی اپنی حرکات وافکار میں غلطی کرتا ہے تو وہ اسی کی طرف منسوب ہوتی ہے اور اگر کار یا سائیکل کسی سے ٹکراتی ہے تو اس کی غلطی کی نسبت سائیکل کی طرف نہیں بلکہ انسان ہی کی طرف کی جاتی ہے اور یہی دینِ اسلام کی تعلیم بھی ہے کہ انسان افکار واعمال کے اختیار اور کسب کرنے میں خود مختار ہے۔ ورنہ اگر انسان دوسری مخلوقات کی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے تو یہ صرف عقل ومشاہدہ اور انسان کے اندرونی وجدان کے خلاف نہیں، بلکہ یہ تو قرآن وحدیث کا بھی انکار ہے۔ اس کی تائید اور دلیل میں قرآن وحدیث سے بہت کچھ پیش کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں بطورِ نمونہ چند دلائل پیش کرتے ہیں:

۱.... اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے بہت سے احکامات تعلیم فرمائے ہیں مثلاً عقیدہ توحید کو ماننا، نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، حج کرنا وغیرہ وغیرہ، اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت سی چیزوں سے روکا ہے، مثلاً شرک سے، کفر سے، زنا سے اور چوری وغیبت وغیرہ سے۔ اور پھر نیک اعمال اختیار کرنے اور بداعمال وجرائم سے

پرہیز کی بنا پر دنیا و آخرت کی کامیابی اور جنت کی بشارت دے دی گئی ہے اور نافرمانی کی صورت میں ناکامی، سخت سزاؤں اور جہنم کے عذاب سے خبر دار کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ انسان کو کچھ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنے اختیار کی بنا پر کسی ایک فکر و عمل کو اختیار کر لیتا ہے جس کی وجہ سے وہ عذاب یا ثواب کا مستحق بن جاتا ہے۔

ورنہ اگر انسان بالکل مجبور محض ہوتا تو پھر انسان سے دینِ اسلام کے سارے مطالبے اور ان کے نتیجے میں جنت یا دوزخ ملنے کی ساری تعلیم بے اہمیت اور بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

۲.... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

”(اے لوگو!) اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرنے لگو اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ تو بڑا قدر دان اور خوب جاننے والا ہے۔“ (نساء:۱۴۷)

۳.... وَ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۶۹﴾

”اور جو لوگ ہماری خاطر محنت کرتے ہیں ہم (بھی) ضرور ان پر (اپنی خوشنودی اور قرب و ثواب کی) راہیں کھول دیں گے اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ محسنین کے ساتھ ہیں۔“ (عنکبوت:۶۹)

۴.... اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَ اِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ کبھی کسی قوم کی (اچھی یا بری) حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اپنے آپ میں تبدیلی پیدا نہیں کرتے اور جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کو (ان کی بداعمالیوں کے نتیجے میں) کوئی تکلیف پہنچانے کا ارادہ کرتے ہیں تو پھر نہ کسی کے ٹالنے سے وہ ٹل سکتی ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کا کوئی حامی و مددگار ہو سکتا ہے۔“ (رعد:۱۱)

۵.... اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾

”بے شک یہ ایک نصیحت ہے پس جس کا جی چاہے وہ اپنے پروردگار (کی خوشنودی اور قرب) کی طرف (جانے والے) راستے کو اختیار کر لے۔“ (مزمل:۱۹)

۶.... وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ

اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ

”کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے انکار کرے ہم نے ایسے ظالموں کے لیے آگ تیار کر رکھی ہے اس آگ کی دیوار نے انہیں گھیرے میں لے لیا ہے“۔ (کہف:۲۹)

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان اپنی رائے اور عمل میں آزاد و خود مختار ہے کہ جس عقیدے و عمل کو اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے تو پھر قرآن مجید کی ان آیتوں کا کیا مطلب ہے جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کفر و ایمان میں کسی ایک کو اختیار کرنے میں آزاد نہیں، بلکہ بے بس اور مجبور ہے مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

”بے شک جن لوگوں نے کفر (یعنی انکار حق) کیا ان کے لیے برابر ہے کہ ان کو ڈراؤ یا نہ ڈراؤ (بہر حال) وہ ماننے والے نہیں ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“ (بقرہ:۶-۷)

یا مثلاً قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک ہے:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ۝

”پس کیا وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزیّن کر دیا گیا ہے، پھر وہ اس کو اچھا سمجھنے لگے، بے شک اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے پس (اے نبی) ان (کافروں) پر حسرتیں (اور افسوس و غم) کھا کر (کہیں) آپ کی جان نہ چلی جائے بے شک جو کچھ (کرتوت) وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔“ (فاطر:۸)

یا مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے۔" (تکویر:۲۹)

اس طرح قرآن مجید میں جگہ جگہ ایسی آیتیں ملتی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کافر و مؤمن، صالح و فاجر سب کے سب اپنے فعل و عمل میں بے اختیار اور مجبور ہیں کیونکہ جب کفار کے دلوں پر مہر لگا دی ہے یا ان میں ہدایت پانے کی صلاحیت ہی نہیں یا وہ کسی بات کے چاہنے اور اختیار کرنے میں مجبور ہیں تو پھر آخر وہ کیسے ہدایت پا سکیں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے سوالات قرآن مجید میں تدبُّر اور غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے کہ قرآن مجید کی ان آیتوں اور ان کے سیاق و سباق میں بھی ان کا حل، ان کا مطلب اور مقصد موجود ہوتا ہے اور ان کے علاوہ دوسری آیتوں میں بھی انہی حقائق کی تفصیل اور وضاحت موجود ہوتی ہے۔

اس مختصر جواب کے بعد اب تفصیلی جواب کی طرف آتے ہیں اور اس کے بارے میں پہلے اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون کو پیش کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی کے لیے بنایا ہے اور جس کی وجہ سے کوئی شخص اور قوم ہدایت پاتی ہے اور کوئی گمراہ قرار پاتی ہے۔

ہدایتِ حق اس کو ملتی ہے جس کو اللہ چاہے

اس بات میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہوا یا ہوتا ہے یا ہوگا یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہنے پر منحصر ہے، اس کی مشیت اور چاہے بغیر کسی چیز، کسی واقعہ اور کسی بات کا وجود میں آنا ناممکن ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ لامحدود اور بے انتہاء رحم و حکمت، عدل اور تمام صفات کا مالک ہے تو ایسی ہستی کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ اس کا کوئی فیصلہ جذباتی یا العیاذ باللہ ذرہ برابر عدل اور حکمت سے ہٹا ہوا ہوگا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت اور چاہنے کے مطابق ہر چیز کے لیے ایک قانون اور ایک ضابطہ مقرر فرمایا ہے، اس کی ہر مشیت، ہر چاہت اور ہر قانونِ مشیت ہر لحاظ سے پوری طرح رحم و عدل اور حکمت پر مبنی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایتِ حق کے بارے میں یہ قانون مقرر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خیر و شر کا امتیاز بھی رکھا ہے اور تقویٰ کا جوہر بھی، اس کے علاوہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے لوگوں کے سامنے حق و باطل اور خیر و شر کو بالکل واضح کر دیا ہے، پھر ہدایتِ حق اسے ملتی ہے جو حق و ہدایت کا طالب بنے اور حق کی راہ اختیار کرنا چاہے اور جو لوگ حق و ہدایت کے بجائے جانوروں کی طرح محض عیشِ دنیا کے طالب بنتے ہیں اور اس روش پر چل نکلتے ہیں تو ایسے لوگ بالآخر حق و ہدایت کی توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس قانون کی

نشان دہی قرآن مجید نے بہت سی جگہوں میں فرمائی ہے جیسا کہ اس کا کچھ بیان ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔

اللہ تعالیٰ تو رحمن ورحیم ہے لیکن بندے اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں

جس طرح اللہ تعالیٰ رحمن ورحیم اور عدل والی ذات ہے، اپنی مخلوق خصوصاً انسانوں پر بہت ہی مہربان ہے، کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کے لیے جو ضابطے اور قوانین بنائے ہیں وہ بھی نہایت رحم وعدل اور حکمت پر مبنی ہیں۔ ان قوانین اور ضابطوں میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر خیر وشر اور حق وباطل کے امتیاز اور تقویٰ کا جوہر رکھا ہے (حق کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی دی ہے) اور انسان کے اندر نفسانی خواہشات بھی ہیں، ان دونوں قوتوں کے باہمی ٹکراؤ سے انسان کی انسانیت اور روح وتقویٰ کی پرواز ہوتی ہے۔ یہ تمام تر قوتیں اور صلاحیتیں انسان کے فائدے کے لیے ہیں، اگر انسان عقل سے کام لیتا ہے، اپنی خواہشات کی مخالفت کر کے حق اور ہدایت کا طالب بنتا ہے تو فرشتوں سے بھی بازی لے جاتا ہے اور اگر خواہشات کی راہ کو اپناتا ہے اور عقل کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو جانور بنالیتا ہے تو ایسا شخص جانوروں کی سطح سے بھی نیچے آگرتا ہے۔

غرض یہ کہ کسی بھی مکلَّف انسان کو پیدائشی طور پر قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم نہیں کیا جاتا، بلکہ بعض لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کر کے اپنی صلاحیتوں کو خود اپنے اختیار سے بعض اوقات ایسے برباد کرتے ہیں کہ ان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی، اس کی مثال یوں سمجھیں کہ لکڑی میں سے آگ نکلنے کی صلاحیت موجود ہے، لکڑی سے جب کوئلہ بن جاتا ہے تو اس میں بھی آگ کی صلاحیت کسی قدر موجود رہتی ہے لیکن بالآخر جب وہ راکھ بن جاتی ہے تو اس میں قانونِ الٰہی کے تحت یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی کہ اس سے آگ نکلے، اسی طرح جسمانی صحت کے لیے بھی اصول مقرر ہیں، اگر کوئی شخص لگاتار جسمانی صحت کے اصولوں کو توڑتا ہے تو بالآخر وہ اپنی دفاعی قوتوں کو ناکارہ بنادیتا ہے جس کے بعد حکیم اور ڈاکٹر اسے لاعلاج مریض قرار دیتے ہیں، یہی حال انسان کی روحانی صحت اور قبولِ حق کی قوت اور صلاحیت کا بھی ہے، کہ اگر روحانی صحت کے اصولوں کی پابندی کی جائے تو انسان کی روحانی اور قبولِ حق کی قوتیں ترقی کرتی ہیں اور اگر ان کو لگاتار توڑتا چلا جائے تو بالآخر انسان کی یہی خداداد صلاحیتیں قانونِ الٰہی کے تحت تباہ وبرباد ہو جاتی ہیں، اس بات کا تجربہ ہر کوئی اپنے اندر بھی کر سکتا ہے اور دوسرے انسانوں میں بھی کہ جب کوئی انسان جان بوجھ کر پہلے پہل کوئی گناہ یا انکار حق کر دیتا ہے تو اس کا دل اور اس کا ضمیر اسے سخت ملامت کرتا ہے، لیکن جب وہ مسلسل اپنی خواہشات وجذبات

کی پیروی کرتا ہے اور اپنے دل وضمیر کے مسلسل خلاف کرتا ہے تو بالآخر ایک مرحلہ ایسا بھی آجاتا ہے کہ اس کا ضمیر کند ہو جاتا ہے اور دل اندھا، اس سے قبولِ حق کی صلاحیت سلب ہو جاتی ہے اور پھر اس کو برائیاں ہی خوبصورت اور اچھی نظر آتی ہیں اور وہ ان کو بالکل ٹھیک اور درست سمجھنے لگتا ہے قرآن مجید میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا

"پس وہ شخص جس کے لیے اس کا برا عمل مزین (اور خوشنما) کر دیا گیا پھر وہ اس (برے عمل) کو اچھا سمجھنے لگا ہو"۔ (فاطر:۸)

اور ایک دوسری جگہ اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾ كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾

"اور اسے نہیں جھٹلاتا مگر ہر وہ شخص جو حد سے گزرنے والا گناہ گار ہو، جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پہلے لوگوں کے افسانے (جھوٹی کہانیاں) ہیں۔ ہر گز نہیں، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) ان کے کرتوتوں (یعنی بداعمالیوں) کے سبب ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے (جس کی وجہ سے ان کے دل برباد ہو کر حق وباطل میں فرق نہیں کر سکتے)۔" (تطفیف:۱۲-۱۴)

اس حقیقت کی طرف رہنمائی نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی موجود ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ داغ لگ جاتا ہے اگر وہ توبہ کرے اور اس سے باز آجائے اور استغفار کرے (اللہ تعالیٰ سے بخشش اور معافی مانگے) تو (وہ داغ ودھبہ دھل جاتا ہے اور) دل صاف اور منور ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ (توبہ واستغفار کے بجائے) لگاتار مزید گناہ کرتا چلا جائے تو وہ داغ دھبے بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ سارے دل پر چھا جاتے ہیں (اور اس کے دل کو بینائی سے محروم کر دیتے ہیں) اور یہی وہ "ران" (زنگ) ہے جس کا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے:

كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾......

(دیکھیے ترمذی ابواب التفسیر)

انسان کی اپنی اختیاری بد اعمالیاں ہوتی ہیں جو قانون الٰہی کے تحت دلوں کو ہدایت کی بینائی سے محروم کر دیتی ہیں

غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دوسری چیزوں کی طرح روحانی صحت کے لیے بھی کچھ اصول مقرر کر دیے ہیں، ان اصولوں پر عمل کرنے سے روحانی اور قلبی قوتیں بڑھتی چلی جاتی ہیں اور ان کے توڑنے کی وجہ سے دل کی کھیتی بالآخر اجڑ کر برباد ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

فَرِيْقًا هَدٰى وَ فَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

"ایک گروہ کو (اللہ تعالیٰ نے) ہدایت دی ہے اور ایک (دوسرا) گروہ ہے جس پر گمراہی ثابت ہو گئی ہے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنالیا ہے اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں"۔ (اعراف:۳۰)

اس آیتِ کریمہ میں ان پر گمراہی کے ثبوت اور چسپاں ہونے کی وجہ یہ بتلائی گئی ہے کہ انہوں نے (نفس اور) شیطان کو اپنا دوست بنا رکھا تھا، دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾

"(اے نبی) بھلا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے علم (اور سمجھ بوجھ) کے باوجود اسے گمراہ کر دیا ہے اور اس کے کانوں اور اس کے دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے پس اللہ تعالیٰ کے بعد اسے کون ہدایت دے سکتا ہے کیا پھر بھی تم لوگ نصیحت حاصل نہیں کرتے۔" (جاثیہ:۲۳)

اس آیتِ کریمہ میں بتلایا گیا کہ خود پسندی، انانیت، خواہشِ نفس کی بندگی اور پیروی کی نحوست نے اس کے دل کو تباہ کر دیا جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آ گیا جس کی وجہ سے اس کے اندر اس سے قبول حق کی صلاحیت اور استعداد ختم ہو گئی، اس طرح وہ حق کے سننے اور نور حق کی بینائی سے محروم ہو گیا۔

نیز ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ

اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

"لیکن جو کفر کے لیے سینہ کھول دے گا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی اور اللہ تعالیٰ کفر اختیار کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا یہی لوگ ہیں جن کے دل اور جن کی سماعت و بصارت پر اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی اور یہ لوگ ہیں جو آخرت سے غافل ہیں۔" (نحل:۱۰۶-۱۰۸)

اس آیتِ کریمہ میں صاف طور پر اللہ تعالیٰ کی اس سنت اور قانون کو بیان فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے غضب، اس کے عذاب اور دلوں پر مہر لگائے جانے کے لیے مقرر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور ان پر حق کے واضح ہو جانے کے بعد بھی وہ محض دنیا پرستی کی وجہ سے انکارِ حق کی راہ اختیار کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کے لیے عذاب عظیم ہے، ایسے کافروں کے لیے ایمان کی راہ نہیں کھولی جاسکتی اور جو لوگ حق کو دیکھنے کے بعد محض اپنے دنیوی مفادات کی خاطر اس سے مسلسل آنکھیں بند کر دیتے ہیں تو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آجاتے ہیں اور ان کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر مہر لگادی جاتی ہے اور اس طرح وہ ہدایت پانے کی توفیق سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح قرآن مجید میں جہاں بھی یہ بات آئی ہے کہ کافروں کو ہدایت نہیں مل سکتی ہے یا ان کے دل، کان اور آنکھ پر مہر لگادی گئی ہے ان سے تمام غیر مسلم اور کفار مراد نہیں، خود نبی کریم ﷺ کے عہدِ مبارک میں بہت سے لوگ ایسے تھے جو ابتداء میں سخت مخالف اور منکر رہے لیکن بعد میں اسلام لائے اور جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم بنے، اس طرح ہر زمانے میں بعض حق کے شدید مخالفین بعد میں حق کے شیدائی بن جاتے ہیں، لہٰذا جہاں جہاں کفار کے بارے میں ایسی بات کہی جاتی ہے تو اس سے کفار اور منکرینِ حق کا ایک مخصوص گروہ مراد ہوتا ہے اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو حق کی مخالفت صرف اس لیے نہیں کرتے کہ وہ حق کو حق نہیں سمجھتے بلکہ ان پر حق کا حق ہونا واضح ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود محض دنیا پرستی مثلاً مال و عزت، منصب و جاہ اور عیش و عشرت وغیرہ کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتے ہیں اور جب یہ مخالفت اس قدر گہری ہو جائے کہ وہ منکرِ حق کے دل میں گھر کر جائے تو وہ قبولِ حق و ہدایت کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح اگر قرآن مجید کی ان آیتوں میں غور کیا جائے جن میں یہ ذکر موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے

دلوں پر مہر لگائی ہے یا ان کو گمراہی میں پھینک دیا ہے تو انہی آیتوں کے سیاق وسباق اور ان کے آگے پیچھے الفاظ کو دیکھنے سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی بداعمالیاں پہلے ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جوابی اثر اس کے بعد ہوا کرتا ہے اور جب انسان اپنے اختیار کے ساتھ مسلسل حق کا انکار کر دیتا ہے یا جان بوجھ کر مسلسل جرائم کا ارتکاب کرتا چلا جاتا ہے تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ اس کی عقلِ سلیم زائل ہو جاتی ہے، اس کا دل وضمیر برباد ہو کر اس کے دل ودماغ اور اس کی روحانیت پر مہر لگ جاتی ہے پھر وہ ہدایت پانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کے برعکس وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی طرف میلان رکھتا ہو اور حق کی جستجو میں رہتا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی راہیں کھول دی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور ضلالت کا یہی فیضان ہے جو انسان کی نیک اعمالیوں اور بداعمالیوں کے نتیجے میں بندوں پر ہوتا رہتا ہے، ایسی صورت میں ظالم خود وہی شخص ہے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کو اپنے اختیار اور ارادے سے برباد کرتا ہے، اس لیے بعض جگہ صاف طور پر اس کے اس ظلم اور بربادی کی نسبت اس کی بداعمالیوں کی طرف کی جاتی ہے کہ اس کی بداعمالیوں ہی نے اسے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے محروم کر دیا ہے۔ کبھی اس کی بداعمالیوں یا نیک عمل پر جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف اس لیے کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے تحت یہ نتیجہ نکل آیا مثلاً ایک آدمی زہرِ قاتل کھالیتا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ مر جاتا ہے تو مرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مرا کیونکہ زہر میں ہلاکت کی خاصیت اسی نے پیدا کی ہے لیکن ہلاکت کا سبب اس شخص کا اپنا ہی عمل ہے اس طرح بیمار کی نسبت کا حال ہے اور اسی طرح آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے لکڑی کو راکھ بنا دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی چیزوں میں خاصیتیں رکھنے والے اور قانون بنانے والے ہیں۔

تو بعض جگہ ضلالت اور مہر کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کر کے یہ بتلا دیا کہ جب ان لوگوں نے اپنی صلاحیتوں کو اپنے اختیار سے برباد کیا تو سنتِ الٰہی اور قانونِ الٰہی کے تحت ان کے دل وحواس پر مہر لگ گئی، اسی حقیقت کو (کہ ہدایت اور گمراہی کے اسباب کو انسان خود ہی اختیار کر لیتا ہے اور اس پر ہدایت یا گمراہی کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے) اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس قدر واضح فرما دیا ہے جس کے بعد کسی قسم کی غلط فہمی کی گنجائش باقی نہیں رہتی مثلاً قرآن مجید کی وہ آیت جو پہلے گذر گئی ہے: خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ۔۔۔ یعنی "اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے" تو اس میں نتیجہ کا سبب بھی پہلے ہی بیان کیا گیا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یعنی "بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر (اور انکار کی راہ) اختیار کی۔" یعنی جب انہوں نے کفر اور ہٹ دھرمی کی راہ اختیار کی تو قانونِ الٰہی کے تحت

ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی، اس طرح وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ .... (نحل:۹۳)

اس سے پہلے اس کے سبب کو بیان کر دیا گیا ہے وہ یہ کہ ان لوگوں کے دل ایسے خراب ہو چکے ہیں کہ ان کو اپنے برے اعمال خوش نما نظر آرہے ہیں اور اس آیت کے آخر میں یہ بھی ہے :اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ" بے شک اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو (کچھ مظالم اور بدکاریاں) وہ کر رہے ہیں۔"

اسی طرح وہ آیت جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ رب العالمین چاہے۔" (تکویر:۲۹)

اس آیتِ کریمہ میں انسان سے اختیار کی نفی مراد نہیں، بلکہ اس میں مشرکینِ قریش کی کج روی پر تنبیہ ہے اور اس آیت میں جس چیز، جس چاہت کی نفی ان مشرکین سے کی گئی ہے وہ ہدایتِ حق کی طلب ہے۔

اس آیت سے پہلے کی چند آیتوں کے ترجمے کو پڑھ لیجیے تو اس آیت کا یہی مطلب خود بخود صاف ہو جائے گا "اور تمہارا ساتھی (یعنی محمد رسول اللہ ﷺ) کوئی دیوانہ اور خبطی نہیں اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے اور وہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں تو تم (اس کو چھوڑ کر) کدھر جا رہے ہو یہ تو بس عالم والوں کے لیے ایک نصیحت ہے (یہ) اس کے لیے (نفع بخش اور مفید ہے) جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے اور تم نہیں چاہو گے مگر یہ کہ اللہ رب العالمین (خود) چاہے۔ (التکویر)

اس کلام میں غور کیجیے! تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطاب کفار و مشرکین کے لیڈروں اور سرداروں سے ہے۔ اور ان کے ان جھوٹے پروپیگنڈوں کا جواب بھی ہے جو وہ قرآن اور پیغمبرِ قرآن کے خلاف کرتے تھے کہ یہ شیطانی یا جناتی کلام ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید جس عظیم دن سے تم کو خبردار کر رہا ہے تم اس کو سمجھو اور اس کے لیے تیاری کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ وہ کلام ہے جو اس نے اپنے سب سے مُقرّب، امانت دار فرشتے کے ذریعے سے اپنے پیغمبر پر اتارا ہے اور تمہارا یہ ساتھی نبی کریم ﷺ کوئی خبطی اور دیوانہ نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے۔ وہ جس فرشتے سے اپنی ملاقات کا دعویٰ کر رہا ہے یہ کوئی وہم نہیں، بلکہ بیان حقیقت ہے، اس نے فرشتہ (یعنی جبریل امین) کو کھلے افق میں دیکھا ہے، اس کو جو غیب کی خبریں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی جاتی ہیں وہ ان میں بخل نہیں کر سکتا، بلکہ فراخ دلی سے بلا کم و کاست دوسروں

تک پہنچاتا ہے، یہ کسی جن یا شیطان مردود کا کلام نہیں اور نہ یہ کہانت اور کاہنوں کا کلام ہے اور نہ یہ شاعروں کی شاعری ہے۔ اس میں تو سراسر توحید اور اخلاقِ حسنہ کی تاکید ہے۔ نیکی اور پرہیز گاری کی تعلیم ہے۔ اس کلام میں تو سراسر انسان کا فائدہ اور فلاح ہے تو یہ شیطانی کلام کس طرح ہو سکتا ہے؟

جب یہ حقیقت ہے تو کہاں یہ قرآن اور کہاں تمہارے کاہنوں اور شیطانوں کی خرافات دونوں میں کیا نسبت ہے؟ آخر تم ضد اور ہٹ دھرمی میں کدھر اور کہاں سے کہاں نکلے جا رہے ہو؟ یہ قرآن مجید عالَم دنیا کے لیے ایک نصیحت اور یاددہانی ہے اور رسول کا کام اس یاددہانی اور نصیحت کو لوگوں تک پہنچا دینا ہے۔ اس کے بعد ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے اس سے وہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو راہ راست پر چلنا چاہیں یعنی اس پر ایمان لانے کی توفیق انہی کو حاصل ہوگی جو حق وہدایت کے قدر دان اور طالب ہوں۔

اس تفصیل کے بعد اب ظاہر ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ کا مطلب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ فوراً خود اپنے کلام میں تضاد اور اختلاف پیدا کر کے یوں فرمائیں کہ لیکن کیا کیا جائے تم مجبور محض ہو اس لیے تم ہرگز ہدایت اور حق کو نہیں چاہ سکتے اور ہدایت کے طالب نہیں بن سکتے جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے۔ یہ کس قدر بے جوڑ بات ہوگی کہ پہلے تو یہ بتلایا گیا کہ تم میں سے جو سیدھی راہ چلنا چاہے اور اس کا طالب بنے یہ قرآن اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوگا، یہ اس کے لیے ایک یاددہانی ثابت ہوگی پھر فوراً خود ان کی چاہت اور طلب کی کلی طور پر نفی کرے، لہٰذا اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اب تمہاری حالت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ تم سیدھی راہ (اور حق) کو نہیں چاہو گے اِلا یہ کہ اللہ رب العالمین خود چاہے اور تم سے ارادے اور اختیار کی قوت کو سلب کر کے زبردستی مسلمان بنا دے۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور طلب کے بغیر زبردستی کسی کے دل میں ہدایت اتار دے۔

یا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہدایت اور راہِ راست پر چلنا تمہاری چاہت کے مطابق نہیں ہوتا، بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہت سے ہوتا ہے، ایسی صورت میں یہ اللہ تعالیٰ کی اس سنت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہدایت وضلالت کا باب ٹھہرایا ہے جیسا کہ اس کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ ہدایت اس کو ملتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ چاہے مگر اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مشیت سراسر اس کے رحم وعدل اور حکمت پر مبنی ہوتی ہے اور اللہ ہدایت اس کو بخشتا ہے جو حق وہدایت کا طالب ہو، ہدایت اور حق کی قدر کرنے والا ہو، اپنی خداداد سماعت وبصارت اور دل ودماغ کی صلاحیتوں سے کام لے اور ہر اس بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے اپنے کان کھلے رکھے جو معقول ہو اگرچہ وہ اس کے نفس کی

خواہشات کی کتنی ہی خلاف ہو اور جو لوگ اس کی قدر نہیں کرتے اور اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں تو ان سے اللہ تعالیٰ کے قانونِ مشیت کے مطابق بالآخر توفیقِ ہدایت سلب ہو جاتی ہے۔

ان دونوں معنوں کا مفہوم قریب قریب ہے اگر اس کا مطلب وہ لیا جائے جو بعض مفسرین نے لیا ہے تو ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان کی مشیت و اختیار اللہ تعالیٰ کی مشیت و اختیار سے متعلق اور اس کا محتاج ہے، جیسا کہ اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

تو یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے ارادے اور کسب و عمل میں مجبور نہیں بنایا ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کسی کو بلا وجہ حق و ہدایت کی توفیق سے محروم کر دیتے ہیں جیسا کہ خود قرآن مجید نے اس کی وضاحت بہت سے مقامات میں فرمائی ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَ كُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ قَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

”پھر (ان کو جو سزا ملی وہ) ان کی عہد شکنی کی وجہ سے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے (تھی) کہ انہوں نے یہ بات کہی کہ ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہیں (یوں نہیں)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر و انکار کی وجہ سے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے پس (اسی وجہ سے) وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم۔“ (نساء:۱۵۵)

اس آیتِ کریمہ میں ان کے مسلسل کفر اور انکارِ حق کو مہر قلوب کا سبب بتایا۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۷۴﴾

”پھر ہم نے نوح (علیہ السلام) کے بعد (متعدد) پیغمبروں کو ان کی قوموں کی طرف بھیجا تو وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے پھر بھی وہ ایسے نہ تھے کہ وہ اس بات پر ایمان لے آتے جسے وہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس طرح ہم (سرکشی اور فساد میں) حد سے گزرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔“ (یونس:۷۴)

اس آیتِ کریمہ میں دلوں پر مہر کی وجہ حد سے گذر جانے والی سرکشی کو قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک جگہ قرآن میں ارشاد ہے:

الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿۳۵﴾

"جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی دلیل آئی ہو یہ بات اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کے نزدیک سخت مبغوض ہے اس طرح اللہ تعالیٰ ہر متکبر سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے"۔ (مؤمن:۳۵)

اس آیتِ کریمہ میں تکبر و سرکشی کرنے کو دلوں پر مہر لگائے جانے کا سبب بتایا۔

نیز قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾

"پھر جب انہوں نے کج روی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔" (صف:۵)

اس آیتِ کریمہ نے اس بات کی وضاحت کی کہ جب کوئی بار بار تنبیہ و تذکیر کے بعد بھی اپنے دل کے رخ کو سیدھا نہیں کرتا تو وہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی زد میں آجاتا ہے اور ان کے دل قانون الٰہی کے مطابق ٹیڑھے ہو جاتے ہیں اور آخر میں فرمایا:

وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دستور یہ نہیں کہ کوئی پسند تو غدر اور ضلالت کرے، لیکن وہ اس کے اندر زبردستی ہدایت ٹھونسے، بلکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور جان بوجھ کر غلط راستوں کو اختیار کر لیتے ہیں تو ایسے لوگ ہدایت اور منزل مقصود تک پہنچنے سے محروم ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نیز ہدایت کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ﴿۱۳﴾

"اللہ تعالیٰ جسے چاہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جو (اللہ تعالیٰ کی طرف) رجوع کرتا ہے اسے (اللہ) ہدایت دیتا ہے"۔ (شوریٰ:۱۳)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف آنے اور ہدایت کے لیے چن لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا چاہنا اس کی حکمت، سنت اور دستور کے تحت ہوتا ہے۔ وہ اپنی رہنمائی اور ہدایت انہی لوگوں کو کرتا ہے جو خود بھی اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو اس کے طالب نہیں بنتے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے وہ توفیقِ ہدایت سے

محروم رہ جاتے ہیں۔ نیز اللہ تعالیٰ ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

قُلْ اِنَّ اللّٰهَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾

”(اے پیغمبر!) کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور اپنی طرف سے رہنمائی ان لوگوں کو فرماتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں (اور متوجہ ہوتے) ہیں۔“ (رعد:۲۷)

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ چاہنا کوئی اتفاقی چیز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ حکیم ذات ہے، اس کی ہر مشیت اس کے عدل و حکمت پر مبنی ہوتی ہے اور اس بات میں اللہ تعالیٰ کی مشیت اور قانون یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان لوگوں کو رہنمائی اور ہدایت کرتا ہے جو حق کے طالب بنیں اور جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو جذبات اور خواہشات کے اندھے ہوتے ہیں، عقل کی بجائے خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ، اس کی ہدایت اور حق کے طالب نہیں ہوتے اور اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تو وہ لوگ توفیقِ ہدایت سے محروم ہوتے ہیں اور گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

فَیُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ یَّشَآءُ وَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۴﴾

”پس اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے“۔ (ابراہیم:۴)

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ عزیز حکیم (زبردست حکمت والا) ہے۔ اس کی ہر مشیت اس کی حکمت پر مبنی ہوتی ہے لہٰذا جو لوگ اس کی حکمت کے تحت ہدایت پانے کے مستحق ٹھہریں گے وہ ہدایت پائیں گے اور جو لوگ اس کے حق دار نہیں ٹھہریں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ وَ یَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

”اللہ تعالیٰ اس (تمثیل) سے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے اور وہ (کسی کو بھی) گمراہ

نہیں کرتا مگر انہیں لوگوں کو جو نافرمانی کرنے والے (اور غدّار) ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے عہد کو اس کے پختہ باندھنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو توڑتے ہیں اور زمین میں فساد مچاتے ہیں یہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔" (بقرہ:۲۷-۲۶)

ان آیتوں میں اس بات کی پوری وضاحت کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مبارک سنت یہ ہے کہ وہ کسی کو بلاوجہ گمراہ نہیں کرتا، بلکہ صرف ان لوگوں پر گمراہی کی مہر لگا دیتا ہے جو ہدایت کی تمام حدود توڑ کر فسق اور نافرمانی کی راہ کو اختیار کرتے ہیں۔ بہت سی آیتوں میں سے صرف چند آیتوں کو بطورِ نمونہ نقل کیا گیا، ان سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و فہم اور غور و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور اس کے ساتھ پیغمبروں کے ذریعہ ہدایت اور گمراہی، نیکی اور بدی دونوں راہیں بتلائی ہیں اور اس میں قبول حق کی استعداد رکھ دی ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی فکر و عقل کی آزادی دے دی کہ وہ جس عقیدہ اور جس عمل کو اختیار کر لیں خواہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور نیکی کے لیے استعمال کریں یا گمراہی میں استعمال کریں، اللہ تعالیٰ کسی کو نہ ہدایت پر مجبور کرتا ہے اور نہ گمراہی پر۔

قرآن مجید ہر قسم کے جبر کی پوری سختی کے ساتھ تردید کرتا ہے جیسا کہ اس کے متعلق کافی شافی بیان گزر چکا۔ یہاں ان آیتوں میں سے صرف ایک آیت کو پیش کرتے ہیں جن سے انسان کی کلی مجبوریت کا وہم ہوتا ہے، حالانکہ انہیں آیتوں میں اگر غور و فکر کیا جائے تو وہ صاف صاف بتا رہی ہیں کہ انسان اپنے عمل و کسب میں آزاد اور با اختیار ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝۹۹

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۰

"اور اگر آپ کا رب چاہتا تو زمین پر جتنے لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے حتیٰ کہ وہ مؤمن بن جائیں حالانکہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر ایمان لا سکے اور (سنت الٰہی یہ ہے کہ) وہ (گمراہی کی) گندگی ان لوگوں پر ڈال دیتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے"۔ (یونس:۹۹-۱۰۰)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اگر یہ منظور ہوتا کہ مجبور کر کے کسی کو ہدایت دے دے تو پھر پیغمبروں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، یہ کام وہ جب بھی چاہے کر سکتا ہے، اگر تیرا رب چاہتا تو سب سے اختیار چھین کر تمام

کے تمام کو مؤمن بنا دیتا، لیکن اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی کو راہِ حق کے اختیار کرنے پر مجبور نہ کیا جائے، بلکہ یہ آزادی دی جائے کہ انسان دونوں راہوں میں سے کسی ایک راہ کو اختیار کرے اس لیے دنیا میں انسانوں کے راستے مختلف ہیں کوئی گمراہی سے چمٹ جاتا ہے کوئی ہدایت کی راہ کو اپنالیتا ہے۔

آگے بھی یہ بتلادیا کہ کوئی نفس حکمِ الٰہی کے بغیر مؤمن نہیں ہو سکتا اور پھر حکمِ الٰہی کے متعلق یہ بھی وضاحت کی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو بلاوجہ نعمتِ ایمان سے محروم نہیں کرتے اور نہ ان پر کفر و گمراہی کو ٹھونستے ہیں، بلکہ صرف انہی لوگوں پر گمراہی کی گندگی اور آلودگیاں ڈالتے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیت اور عقل سے کام نہیں لیتے اور حق و باطل کی تمیز کے لیے عقل استعمال نہیں کرتے۔ اس حقیقت کی وضاحت بھی قرآن مجید میں جگہ جگہ موجود ہے مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۙ﴿۴۸﴾

”اگر چاہتا اللہ تعالیٰ تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن وہ تمہیں اس چیز میں آزمانا چاہتا ہے جو اس نے تمہیں دے دی ہے، لہٰذا نیکیوں میں بڑھنے کی کوشش کرو تم سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لوٹ کر آنا ہے پھر وہ تمہیں اس سے آگاہ کرے گا جس میں تم لوگ جھگڑتے ہو۔“ (مائدہ:۴۸)

یہ آیت صاف صاف بتلارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ جبراً کسی پر ہدایت اور گمراہی نہیں تھوپتے، اگر وہ جبراً کسی کے اسلام لانے کے حق میں ہوتا تو اپنی چاہت سے ہر ایک کو اسلام کا پابند بنا دیتا اور اس طرح سب لوگ ایک ہی امت بن جاتے، لیکن یوں اس لیے نہیں کیا گیا تاکہ لوگوں کی آزمائش ہو کہ وہ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں اور مال کو حق کے لیے استعمال کرتے ہیں یا باطل کے لیے۔“

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو کسی عمل پر مجبور نہیں کرتے، بلکہ بندہ نیکی اور بدی کے کام کرنے میں تو آزاد ہے لیکن اس کے اختیاری افعال پر جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے اس میں وہ آزاد نہیں، اس کو یہ آزادی تو حاصل ہے کہ چاہے آگ کو صحیح طور پر استعمال کرے یا اس کا استعمال غلط طریقے پر کرے، لیکن اس کو یہ آزادی نہیں کہ غلط استعمال سے اس کے برے نتائج سے وہ بچ سکے۔ اس کو یہ آزادی تو ہے کہ زہر قاتل کھائے یا صحت بخش دوا لیکن زہر کھانے کے بعد یا صحت بخش دوا کھانے کے بعد جو نتیجہ مرتب ہوگا وہ اس کے ہاتھ میں نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے مطابق مرتّب ہوتا ہے، لہٰذا نیکی اور بدی بندوں کی اپنی کمائی ہے جس کا بدلہ

انہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ رحم وعدل والی ذات ہے وہ کسی پر ذرہ برابر ظلم گوارا نہیں کرتا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾

”جو نیک عمل کرے گا تو اس کا فائدہ اس کے لیے اور جو بدی کرے گا اس کا وبال اسی پر ہوگا تمہارا پروردگار اپنے بندوں کے حق میں (ذرہ برابر بھی) ظلم کرنے والا نہیں ہے۔“ (حم السجدہ:۴۶)

اور ایک جگہ کفار ومشرکین کے متعلق ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَ كَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

”اگر ہم ان کی طرف فرشتے بھی اتار دیں اور مردے (قبروں سے اٹھ کر) ان سے باتیں بھی کرنے لگیں اور ہر چیز کو ان کے روبرو جمع کر دیں تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے (کہ بس وہ ایمان لے آئیں پھر تو لے آئیں گے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے) لیکن اکثر ان میں سے جاہل ہیں“۔

(انعام:۱۱۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان سرکش اور متعصب کفار ومشرکین کی حالت اس قدر بگڑ گئی ہے کہ اگر ان پر فرشتے اتار دیے جائیں اور ان سے مردے باتیں کرنے لگیں اور دنیا کی ایک ایک چیز جمع ہو کر ان کے سامنے کی جائے تب بھی یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں، البتہ ان کے ایمان لانے کی ایک صورت ہے وہ یہ کہ ان کو دوسری مخلوق کی طرح اختیار اور انتخاب کی قوت سے محروم کر دیا جائے اور اس طرح ان کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے پھر تو یہ ایمان لے آئیں گے، لیکن زبردستی کسی کو مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کی سنت اور قانون کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتے ہیں کہ انسان کو اپنی رائے اور عمل میں آزادی دی جائے تا کہ لوگوں کا امتحان ہو سکے لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے جاہل ہے۔

انسان کا اختیار اللہ تعالیٰ کی توجہ کا محتاج اور اس کے تابع ہے

یہاں تک صرف عقل ومشاہدہ ہی سے نہیں، بلکہ قرآن مجید اور اسلامی تعلیم سے بھی یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ انسان اپنی رائے وعمل میں آزاد ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتِ اختیار کے ذریعے سے اپنے لیے کسی عمل وعقیدہ کو اختیار کر لیتا ہے لیکن انسان اپنے ارادے اور اپنی صلاحیتوں کا نہ خود خالق ہے اور نہ اس کا ارادہ بالکل ایسا ہے کہ جس کی باگیں کسی کے ہاتھ میں نہ ہوں یا وہ جو چاہے وہ پورا ہو جائے یہ بھی عقل اور مشاہدہ دونوں کے

خلاف ہے نہ تو انسان اپنے ارادے اور اختیار کا خالق ہے اور نہ اس کا ارادہ واختیار بالکل مطلق العنان اور آزاد ہے نیز یہ کہ اگر اس دنیا میں ہر انسان کو یہ اختیار حاصل ہو جائے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہے وہ ہو تا جائے اور اس کو اعمال کی آزادی کے ساتھ نتائج کی آزادی بھی ہوتی کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج بھی خود مرتب کرے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو تا اور یہ مشاہدہ ہے کہ انسان بہت سی چیزوں اور کاموں کا ارادہ کرتا ہے لیکن اس کے ارادے میں رکاوٹیں اس کے ارادے کو ناکام بنادیتی ہیں۔ انسان کی اسی مجبوری کو بھی قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں تا کہ مسئلہ کی پوری وضاحت ہو جائے۔

تمام مخلوق پیدائش اور بقا میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کے التفات کی محتاج ہے

یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ جس طرح تمام مخلوقات صرف پیدائش میں ہی اللہ تعالیٰ کی محتاج نہیں، بلکہ بقاو نشوونما میں بھی ہر لمحہ ہر لحظہ اللہ تعالیٰ کے مسلسل عملِ تخلیق کی محتاج ہے، اسی طرح انسان بھی اپنی ذات وصفات اور صلاحیتوں وغیرہ میں بغیر کسی انقطاع کے اپنے خالق اللہ رب العالمین کے عملِ تخلیق کا محتاج ہے، ایسی صورت میں جہاں دوسری صفات وکمالات مثلاً سننے اور دیکھنے وغیرہ کی صفات اللہ تعالیٰ کے مسلسل عملِ تخلیق سے اور تجلی سے آدمی میں پیدا ہو رہی ہیں تو یہی حال انسان کی صفتِ اختیار کا بھی ہے، تو انسان میں یقیناً اختیار پیدا ہوتا ہے، لیکن اسی اختیار کے وجود وبقا کا سلسلہ ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے ساتھ وابستہ ہے تو جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے اور جس طرح چاہے وہ اپنے اس فیض کو روک سکتا ہے اور روک لیتا ہے جیسا کہ یہی حال انسان کی دوسری صفات (بینائی اور شنوائی وغیرہ) کا بھی ہے۔

مثلاً انسان آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے لیکن ہر چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے دیکھنے کی بھی حدود اور شرائط ہیں اسی طرح انسان کے اختیار واقتدار کی بھی خاص حدود ہیں جن سے باہر وہ قدم نہیں رکھ سکتا، بلکہ یہ تو تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ جن امور میں وہ اپنے کو با اختیار بھی پاتا ہے بالکل انہی امور میں وہ بسا اوقات بے اختیار ہو جاتا ہے، پھر جس طرح خود بندہ کا وجود اور اس کی دیگر صفات کمزور اور ضعیف ہیں اسی طرح اس کی یہ صفتِ قدرت واختیار بھی ضعیف ہے، لیکن اس سے اس کے اختیار کی نفی نہیں ہو سکتی، جیسا کہ انسان میں دیکھنے کی صلاحیت ہے اور درخت وغیرہ میں نہیں ہے لیکن ہر چیز کو دیکھ نہیں سکتا، بلکہ بعض رکاوٹیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ اپنی حدود میں بھی بسا اوقات دیکھنے سے عاجز ہوتا ہے مثلاً اس کی آنکھوں کے سامنے کوئی رکاوٹ کھڑی کی جائے تو ایسی صورت میں دیکھنے کی صلاحیت ہونے کے باوجود وہ نہیں دیکھ سکتا، ظاہر ہے کہ اس وقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس

میں دیکھنے کی صلاحیت اور قوت نہیں، بلکہ یہی کہا جاتا ہے کہ انسان میں دیکھنے کی صلاحیت اور قدرت ہے، لیکن اس کی خاص حدود اور شرائط ہیں اس لیے وہ اپنی حدود کے باہر اور شرائط کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔

یا مثلاً ریل گاڑی میں چلنے کی صلاحیت ہے اب اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں چلنے کی صلاحیت ہے، مگر اس کا چلنا اس کے انجن کی قوتِ برداشت کے مطابق ہوگا، اس سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عام سڑکوں پر چل سکے گی وہ تو صرف اپنی ریل پٹڑی پر ہی چل سکتی ہے پھر اگر اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ آجائے جس سے وہ آگے چل نہ سکے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں چلنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح انسان کو زندگی میں ایسے کئی عوارض لاحق ہوجاتے ہیں جو اس کی قوت ارادہ و اختیار کو اپنی ہی حدود میں بھی معطّل کردیتے ہیں یا ایسی رکاوٹیں پیش آجاتی ہیں جو اس کے ارادہ اور اختیار کو دوسری طرف موڑ دیتی ہیں۔ [1]

یا ایسے موانع اثر انداز ہوتے ہیں جن کو دور کرنا اس کے بس میں نہیں ہوتا لیکن ایسی صورت میں اس کا یہ معنی تو ہرگز نہیں ہوسکتا کہ انسان میں ارادہ واختیار کی قوت نہیں ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ انسان ہے، وہ اپنی حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنی اس قوّتِ اختیار کو استعمال کرسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں پیدا ہوتی رہتی ہے، وہ خدا نہیں کہ جو چاہے کرسکے یا اپنے اختیار کا خود خالق ہوجائے کہ اپنے اندر اختیار کی قوت کو پیدا کرسکے، بلکہ اس کا اختیار بھی اس کی دوسری صفات کی طرح اللہ تعالیٰ کی توجہ والتفات کا محتاج ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ انسان میں ارادۂ قدرت واختیار کی صفت بھی ہے اور اس کے افعال میں اس کے اختیار وقدرت کی تاثیر بھی ہے اور اس کے اختیار اور ارادہ پر کوئی جبر بھی نہیں، اس کے لیے ہدایت اور گمراہی نیکی اور بدی محنت اور سستی وغیرہ کے ہر طرف سے راستے کھلے رکھے گئے ہیں، جس طرح بھی وہ چاہے اپنی صفت اختیار کو استعمال کرسکتا ہے، اپنی قوّتِ اختیار کے استعمال میں اس پر کوئی جبر نہیں البتہ اس کا اختیار اپنے وجود وبقا، تاثیر ونتیجہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ساتھ وابستہ ہے اور اس کی توجہ والتفات کا محتاج ہے جس وقت اللہ تعالیٰ چاہے اور جس قدر چاہے اس کو اپنے بخشے ہوئے اختیار سے محروم کرسکتا ہے اور کرتا رہتا ہے، بس انسان نہ تو دوسری مخلوقات کی طرح بالکل مجبور ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرح مختار مطلق ہے کہ اس کا اختیار نہ کسی کے اختیار کے ساتھ وابستہ ہے اور نہ اس سے اس اختیار کو کوئی سلب کرسکتا ہے، بلکہ بندہ کا اختیار اپنے وجود وبقاء میں ہر لمحہ اس کی

---

[1] مثلاً آپ مدرسہ جارہے ہیں یا دکان کھولنے کا ارادہ کرکے گھر سے نکلے لیکن پیچھے سے پیغام آیا کہ آپ کا بیٹا سخت بیمار ہے یا آپ خود سخت بیمار ہوگئے تو آپ کا ارادہ وہیں پر مڑ کر ہسپتال جانے کا ہوا۔ مختار

دوسری صفات کی طرح اللہ تعالیٰ کا محتاج بھی ہے اور پھر محدود اور ضعیف بھی ہے، انسان کو ایک خاص دائرہ میں ایک حد تک آزادی حاصل ہے، اس دائرہ سے باہر جا کر اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے تمام افعال اور ان کے تمام نتائج اللہ تعالیٰ کی قدرت ومشیت کے تابع اور ماتحت ہو کر رہ جاتے ہیں، یہی قرآن مجید کی تعلیم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقُولَنَّ لِشَيْءٍ إِنِّي فَاعِلٌ ذَٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾

"کسی چیز کے بارے میں ہر گز نہ کہا کرو کہ میں کل یہ کام کرنے والا ہوں مگر (یوں ساتھ کہا کرو) اگر اللہ تعالیٰ چاہے"۔ (کہف:۲۳)

جبر واختیار کے متعلق اہل سنت والجماعت کا یہی عقیدہ ہے (جس کا مفصل بیان اوپر گزر چکا) جس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے ارادے وقدرت کا مقام جبر واختیار کے درمیان ہے یعنی نہ انسان بالکل مجبور ہے کہ اس کے اختیار اور اعمال پر جبر ہو اور نہ اس کا اختیار وقدرت بالکل مطلق العنان ہے کہ جب چاہے جو چاہے وہ کر سکے، بلکہ وہ اپنے دائرہ اور حدود میں صاحب اختیار ہونے کے باوجود اس کا اختیار اللہ تعالیٰ کی توجہ والتفات کا محتاج ہے، وہ جب بھی چاہے اور جس قدر چاہے اس کے اس اختیار کو چھین سکتا ہے۔

انسان اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے........ تقدیر کے متعلق ایک اور سوال اور اس کا جواب

مسئلہ تقدیر کے متعلق جو یہ غلط فہمی اور سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ بھلا یا برا ہو رہا ہے، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو پھر اعمال کی ذمہ داری کیوں ڈال دی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں ثواب یا عذاب کیوں دیا جاتا ہے؟

اس کا کافی وشافی جواب مذکورہ بالا بحث میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے اور اس کو دوسری قوتوں، اور صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ قدرت واختیار کی صفت سے بھی نوازا ہے۔ اگر وہ اپنی قدرت واختیار کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اس کی روحانی قوتوں کی نشوونما ہوتی رہتی ہے اور اس کی دنیا وآخرت کی زندگی بہتر سے بہتر بنتی چلی جاتی ہے اور اگر وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو ناکارہ بنا کر تباہ وبرباد کر دیتا ہے تو اسی قدر وہ دنیا وآخرت کے لحاظ سے ناکام ونامراد ہو کر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اگر کہا جائے کہ آخر اس کی یہ تقدیر تو پہلے سے بنائی گئی تھی پھر تو اس کے مطابق چلنے پر وہ مجبور تھا تو اس کا

جواب بھی مذکورہ بالا بحث میں موجود ہے، البتہ اس کے ساتھ اتنی بات اور سمجھ لی جائے کہ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے بے انتہا علم و صحیح اندازے کا کمال ہے کہ جس شخص کے لیے جو اندازہ لگایا تھا ہو بہو اسی کے مطابق اس کی زندگی اچھے یا برے اعمال میں گزر گئی، گزر رہی ہے اور گزر جائے گی۔

پوری کائنات میں جو کچھ جس طرح، جس صفت کے ساتھ، جس سلسلہ اور اسباب سے ہو رہا ہے وہ بالکل اسی طرح اور اسی صفت وغیرہ کے ساتھ ہر لحاظ سے اس کے علم ازلی میں تھا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کو مقدر فرمایا ہے مثلاً جو اپنے اعمال و افعال میں غور کرے گا تو وہ بغیر کسی شک وشبہ کے اس حقیقت کو محسوس کرے گا کہ اس دنیا میں جو بھی اچھا یا برا یا احتیاط و بے احتیاطی یا علاج کرنا اور نہ کرنا وغیرہ وغیرہ جو کچھ وہ اپنے اختیار سے کرتا رہتا ہے، اور ہر کام کرنے یا نہ کرنے کے وقت ہم پورے یقین کے ساتھ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ ہمیں یہ قدرت اللہ تعالیٰ نے دی ہے کہ خواہ ہم اس کام کو کریں خواہ نہ کریں اور اسی خداداد قدرت واختیار کی بنا پر پھر کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر اسی فیصلہ کے مطابق ہمارا عمل ہوتا رہتا ہے، لہٰذا اس عالم میں جس طرح ہم اپنے ارادہ واختیار سے اپنے تمام کام کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کو ازل سے اسی طرح ان کا علم تھا کہ فلاں شخص اپنے خداداد اختیار و قدرت کی بنا پر فلاں کام کرے گا اور اپنے اختیار سے وہ فلاں فلاں بات کو بروئے کار لائے گا اور پھر اسی سے فلاں فلاں نتائج نکل آئیں گے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے کہ کسی شخص کے متعلق کوئی ڈاکٹر یہ خبر دے دے کہ اس شخص کو ایک ماہ کے اندر اندر کینسر کا مرض لگ جائے گا، پھر ڈاکٹر کی اس خبر کے مطابق اگر اس شخص کو کینسر کا مرض لگ جائے تو اس صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اس شخص کو کینسر لگ جائے گا اس لیے اس کو کینسر کی بیماری لگ گئی اور اب اس کی اس بیماری کا ذمہ دار خود یہی ڈاکٹر ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ ڈاکٹر بڑا تجربہ کار اور لائق ہے جس نے اس شخص کو دیکھ کر پہلے سے یہ اندازہ کرلیا تھا۔ اس طرح تقدیر میں کسی کے دوزخی لکھے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کا دوزخی ہونا لکھ کر اس سے نیکی کرنے کا اختیار چھین لیا ہے اور اب وہ مجبور ہے کہ برائی ہی کرے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اندازہ اور علم بڑا صحیح اور درست ہے کہ اس نے قبل از وقت معلوم کرلیا کہ یہ بندہ نیکی کرنے کی قوت واختیار رکھنے کے باوجود اس قوت اور اختیار کو غلط استعمال کرکے اپنے آپ کو جہنمی بنالے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اسی علم کے مطابق ہر شخص کے لیے وہ مقدر فرمایا جو کچھ اس نے اپنے اختیار وقدرت سے کرنا تھا۔

مسئلہ تقدیر کے متعلق یہ سوال کہ جب سب کچھ مقدر ہے تو پھر دنیاوآخرت کے مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کیوں؟

اور اس بحث سے وہ سوال بھی حل ہوا جو بعض لوگ تقدیر کے متعلق کرتے ہیں کہ جب سب کچھ مقدر ہے؟ تو پھر کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنے یا نہ کرنے کی ضرورت ہی کیا؟ کیونکہ نتائج اور مقاصد کے حصول کی طرح ان کے اسباب وذرائع، ان کے لیے جدوجہد اور محنت وغیرہ سب کچھ نوشتۂ تقدیر میں آچکا ہے کہ فلاں اپنے اختیار سے فلاں اسباب اختیار کرے گا، محنت اور جدوجہد کرے گا اور اس سے فلاں فلاں نتائج نکلیں گے وغیر ذلک۔ تو پھر یہ سوال اور یہ خیال ہی فضول اور باطل ہے کہ کوئی ہاتھ، پاؤں باندھ کر عقیدۂ تقدیر کے بہانے اپنے کو نکما اور ناکارہ بنائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مرتبہ تقریباً اس قسم کا سوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا تھا کہ یارسول اللہ کیا ہم نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کرکے عمل کرنا چھوڑ دیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ اَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ السَّعَادَةِ فَسَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ اَهْلِ السَّعَادَةِ وَاَمَّا مَنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الشَّقَاءِ فَيُيَسَّرُ لِعَمَلِ اَهْلِ الشَّقَاوَةِ ثُمَّ قَرَءَ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى

"(نہیں بلکہ) عمل کرو کیونکہ ہر ایک کو اس کی توفیق ملتی ہے جس کے لیے وہ (اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق) پیدا ہو چکا لہٰذا جو کوئی نیک بختی کے اہل میں سے ہوتا ہے تو اس کو سعادت اور نیک بختی کے کاموں کی توفیق ملتی ہے اور جو کوئی بدبختی کا اہل ہوتا ہے اس کو بدبختی اور بداعمال کی توفیق ملتی ہے، اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی: فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى (جو اوپر حدیث میں مذکور ہے یعنی) جس نے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں) دیا اور تقویٰ اختیار کیا اور اچھی بات (یعنی اسلام قبول کرکے کلمہ طیبہ) کی تصدیق (یعنی سچ کرکے ثابت) کی تو ہم اس کو چین اور راحت کی زندگی (جنت) حاصل کرنے کی توفیق دیں گے اور جس نے بخل سے کام لیا اور بے پرواہ رہا اور اچھی بات (اسلام وکلمہ طیبہ) کو جھٹلایا تو اس کے واسطے ہم تکلیف اور دشواری کی زندگی (جہنم) کی طرف چلنا آسان کر دیں گے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

نیز جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عرض کیا کہ یارسول اللہ وہ عملیات جو ہم شفاء کے

لیے پڑھواتے ہیں (مثلاً سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرواتے ہیں) اور وہ دوائیں جن کو ہم صحت حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہ چیزیں جن سے ہم اپنی جان کی حفاظت کرتے ہیں (مثلاً ڈھال اور زرہ وغیرہ ان کے بارے میں بتلائیں کہ) کیا یہ سب چیزیں نوشتہ تقدیر پر کچھ اثر انداز ہو جاتی ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: هِيَ مِنْ قَدَرِ اللهِ "یہ چیزیں بھی نوشتۂ تقدیر ہی میں سے ہیں۔" (دیکھیے مشکوٰۃ: کتاب الایمان)

یعنی جس طرح بیماری وغیرہ تقدیرِ الٰہی میں سے ہے، اسی طرح ان کا علاج اور ان سے حفاظت کے اسباب بھی نوشتۂ تقدیر ہی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا سفر کیا تو مقامِ سرغ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہاں وبا کی نہایت شدت ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واپسی کا ارادہ کیا جس پر حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اَفِرَارًا مِنْ قَدَرِ اللهِ؟ "کیا قضائے الٰہی سے بھاگتے ہو؟" تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی نازک مسئلہ کو ان مختصر اور بلیغ الفاظ میں حل کرتے ہوئے فرمایا:

نَعَمْ نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللهِ اِلٰى قَدَرِ اللهِ

"ہاں ہم تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف بھاگتے ہیں۔" (دیکھیے صحیح مسلم باب القدر)

یہ سوال کہ کوئی نیک بخت اور کوئی بد بخت کیوں بنتا ہے؟

اب رہی یہ بات کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم قدیم وازلی کے مطابق ہر انسان کے لیے اس کی نیک بختی اور بد بختی کا فیصلہ جو کیا ہے اگرچہ وہ اپنی طے شدہ بد بختی یا نیک بختی کو اپنے اختیار اور اپنے اعمال کی وجہ سے کیوں نہ پہنچ جاتا ہو ایسا ہوا کیوں؟ کہ ازل سے کوئی بد بخت ہے اور کوئی نیک بخت؟ تو یہ اور اس طرح کے سوالات بے نتیجہ ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری عقل کے دائرہ سے باہر ہیں۔ ہم تو کائنات کی محسوس چیزوں کے ادراک کی پوری حقیقت سے بھی عاجز ہیں چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے علم مبارک تک رسائی یہ انسان کے لیے ممکن نہیں، البتہ ایسے خیالات کے وقت اتنی بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، وہی جانتا ہے کہ کوئی شخص نیک بخت اور بد بخت کیوں ٹھہرا، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کو تو خوب معلوم ہے، لیکن ہم اس دنیا میں اس حقیقت کو پانے سے قاصر ہیں، کیونکہ ہماری عقل ناقص وکمزور ہے، سونا تولنے والے ترازو میں پہاڑوں کو نہیں تولا جا سکتا اور نہ وہ اس کا متحمل ہے اللہ تعالیٰ کی ہر تقدیر اور ہر فیصلہ بالکل عدل وانصاف کے مطابق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت ورحمت کائنات کے ذرے ذرے کو محیط ہے اور اس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت لے گئی ہے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی اس مخلوق (یعنی انسان) کے ساتھ ذرہ برابر ظلم وزیادتی کا معاملہ کرے جس

کے لیے اس نے ساری کائنات کی چیزیں بنائی ہیں۔ اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ پوری وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٤٦﴾

”جس نے نیک عمل کیا تو اپنے ہی لیے کیا اور جس نے برا کام کیا تو اس نے بھی اپنے لیے کیا اور تیرا پروردگار بندوں پر (ذرہ برابر) ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔“ (حم سجدہ:۴۶)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـــًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٤٤﴾

”بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر کوئی ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ خود ہیں جو اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں“۔ (یونس:۴۴)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے پاک ہے۔

عقیدۂ تقدیر ایک غیبی حقیقت کا انکشاف ہے

پہلے بھی یہ گذر چکا کہ عقائد بنائے یا مقرر نہیں کیے جاتے، بلکہ یہ غیبی حقائق ہوتے ہیں اور جو کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں عقیدہ اس لیے بنایا گیا یا مقرر کیا گیا ہے تو وہ بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہے اور ایسے کہنے یا لکھنے کی وجہ سے لوگوں کے ایمان متزلزل کرتا ہے، ایسی صورت میں ان حقائق پر یقین وایمان ختم ہو جاتا ہے۔

کیونکہ ایسی صورت میں تو آدمی کا تصور یہی بن جاتا ہے کہ یہ عقائد کوئی حقیقت نہیں رکھتے، بلکہ صرف اس لیے ایجاد کر لیے گئے ہیں تاکہ لوگ سدھر جائیں۔ بلاشبہ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ عقائد محض غیبی حقائق ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ دنیا کو بتلاتے ہیں اور ان حقائق کو اس لیے لوگوں پر ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ وہ ان حقائق کو سامنے رکھ کر زندگی گزاریں مثلاً جنت ایک حقیقت ہے۔ دوزخ ایک حقیقت ہے، موجودہ نظامِ کائنات کا درہم برہم ہونا، قیامت اور محشر ایک حقیقت ہے، فرشتوں کا وجود ایک حقیقت ہے اسی طرح ”قضاوقدر“ ایک حقیقت ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں پر ظاہر کیا ہے۔

قضاوقدر لوگوں کو کیوں بتلایا گیا؟

اس حقیقت کو بندوں پر اس لیے ظاہر نہیں فرمایا کہ وہ بے عملی کے شکار ہوں اور اپنے ہاتھ پاؤں کو توڑ ڈالیں، بلکہ عقیدۂ تقدیر میں تو اسی بات کا بیان ہے کہ عالَم اسباب میں جو کچھ بھی نظر آرہا ہے (خواہ وہ اسباب ہوں یا

ان کے نتائج و ثمرات یہ)سب کچھ تقدیر کے وسیع احاطہ میں شامل ہیں، اگر تقدیر کے تحت صرف نتائج اور ثمرات ہوتے اسباب وذرائع اس سے خارج ہوتے تو پھر اسباب کے اختیار کرنے میں ضعف اور کمزوری کا امکان ہوتا اور ہر انسان یہ خیال کر سکتا تھا کہ جب نتائج طے ہو چکے ہیں تو اب اپنی کوشش و محنت کی کیا ضرورت ہے لیکن جب یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ نتائج اور ثمرات کی طرح اسباب ووسائل بھی تقدیر میں آ چکے ہیں تو اس عقیدہ کی وجہ سے بے عملی اور بے کارگی کا تصور تو باطل ہو جاتا ہے البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت سے لوگوں کو خبر دار کیوں کیا ہے؟..........اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں کہ اس عقیدہ کے بتلانے میں کیا کیا راز پوشیدہ ہیں، لیکن جہاں تک انسانی عقل کی دوڑ ہے اور جہاں تک قرآن مجید نے اس حقیقت کے بیان کا جو راز بتلایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کا حال یہ ہے کہ اپنے اچھے یا برے نتیجے کا سبب خود اپنی ذات ہی کو قرار دیتا ہے، چنانچہ اپنی ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے اور اپنی تھوڑی سی کوشش کی ذرا سی کامیابی یا کسی نعمت کے ملنے پر فخر وغرور کے نشہ میں پڑ جاتا ہے۔

یہ دو ایسی اخلاقی بیماریاں ہیں کہ جس کو لاحق ہو جاتی ہیں تو وہ اپنے کیے یا ملنے پر کبھی مغرور ہوتا ہے اور کبھی سخت غمگین اور ناامید۔ اور یہی دو بیماریاں انسان کی قناعت، سنجیدگی، صبر واستقلال اور شجاعت کے جوہر کو برباد کر دیتی ہیں۔ اس عقیدہ اور حقیقت کے بتلانے سے انسان پر ایک تو یہ واضح کیا گیا کہ دیکھو تم کو جو کچھ نعمت ملتی ہے یا جو کامیابی ہوتی ہے وہ تمہاری کوشش اور محنت کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہوتا ہے، اس پر غرور وفخر کے بجائے شکر و تواضع کی راہ اختیار کی جائے اور جب تمہیں کوئی مصیبت یا ناکامی پہنچتی ہے تو مایوس اور ناامید نہ ہو۔

کیونکہ تمہارے کام سے پہلے ہی تمہارے کاموں کے نتیجے اور ثمرات اللہ تعالیٰ رب العالمین نے مقرر فرمائے ہیں، اس لیے غمگین اور ناامید نہ ہونا چاہیے، بلکہ جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو کوشش اور محنت میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَ لَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ
يَسِيْرٌ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَ لَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴿۲۳﴾

"کوئی مصیبت نہ زمین پر آتی ہے اور نہ خود تمہاری جانوں پر مگر وہ (سب کچھ) ہم نے ان کی پیدائش سے پہلے ایک

کتاب (یعنی نوشتہ تقدیر) میں لکھ دی ہے، بے شک یہ بات اللہ تعالیٰ کے لیے بالکل آسان ہے (اور ہم نے تمہیں اس حقیقت سے اس لیے خبر دار کیا) تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے (یعنی جو نقصان تم کو پہنچ جائے یا جو چیز تمہیں نہ ملے) اس پر تم غمگین (اور شکستہ دل) نہ ہو اور جو چیز (یعنی نعمت و کامیابی) تمہیں ملے اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کسی مغرور اور شیخی باز (اپنی بڑائی جتانے والے) کو دوست نہیں رکھتا۔" (حدید:۲۲-۲۳)

تقدیر کے ثمرات و نتائج

بلاشبہ جس شخص پر تقدیر کا عقیدہ کھل گیا اور جس کو بھی اس حقیقت کا پورا پورا یقین ہو گیا تو ایسے شخص میں بہادری، جرأت مندی، توکل علی اللہ، سخاوت، قناعت اور صبر واستقلال وغیرہ جیسے عظیم جوہر نشوونما پاتے ہیں۔ ایسا شخص رزق حلال کے لیے کوشش کرتا ہے اور اس کوشش کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہو جاتا ہے اس کو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حقوق کو پورا کرتا رہتا ہے۔ ایسا شخص بخل کے مرض سے پاک اللہ تعالیٰ کے بخشے ہوئے رزق پر قانع اور صابر ہو جاتا ہے اور اپنے سے زیادہ دولت مند اور خوشحال و معزز لوگوں کی حالت پر جلتا نہیں۔ ہر مصیبت کے وقت وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ کسی اندھی بہری قوت کی طرف سے بے سوچے سمجھے واقع ہونے والی مصیبت نہیں، بلکہ وہ قضائے مُبرم اور نوشتۂ تقدیر ہے جو کسی کے ٹالنے سے نہیں ٹل سکتی اور اس قضا و فیصلہ کے پیچھے اس حکیم، قادر مطلق کا علم و ارادہ کار فرما ہے جو بندے کی طاقت اور ابتلا کی سختی و شدت کا خوب اندازہ رکھتا ہے جس کا ہر فیصلہ انتہائی عدل و انصاف اور کمال درجہ کی حکمت پر مبنی ہوتا ہے اور جس کی رحمت و شفقت اس کے قہر و غضب، اس کے مؤاخذہ واحتساب، بلکہ ہر چیز پر حاوی ہے۔ پھر وہ اپنے بندوں کے لیے ان کے والدین سے بھی بدرجہا زیادہ رحیم و شفیق ہے، اس لیے اگر اس کا کوئی فیصلہ بظاہر ہمیں اچھا نہ بھی لگے اور ظاہری صورت اس کا ضرر و نقصان ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ اس میں سے ہمارے لیے خیر کی صورت نکال دے گا:

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔـا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿١٩﴾

"پس ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اسی میں (تمہارے لیے) خیر کثیر رکھ دی ہو۔" (نساء:۱۹)

نیز اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو ارشاد فرمایا ہے:

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿٥١﴾

”آپ فرما دیجیے ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے وہ ہمارا مولیٰ (کارساز ہے اس کی میرے ساتھ محبت ہے وہ میرا خیر خواہ) ہے اور اللہ تعالیٰ ہی پر مسلمانوں کو اپنے کام رکھنے چاہئیں۔“ (توبہ:۵۱)

خلاصہ یہ کہ مؤمن پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ یہی کہہ اٹھتا ہے کہ یہ میرے مالک کی طرف سے مقدر تھی اور جس کی طرف سے یہ مصیبت پہنچی وہ ہمارا مولی یعنی دوست اور مددگار ہے۔ اس مصیبت میں یقیناً میرے لیے کوئی فائدہ ہوگا، اس لیے وہ مصائب سے گھبراتا نہیں، وہ سوچتا ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی معاملہ میرے لیے مقدر ہو شاید اس میں میرا فائدہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے جب مجھے اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو اللہ تعالیٰ تو مجھ سے بدرجہا زیادہ محبت کرتا ہے تو جب محبت بھی ہے اور میرے حالات کو بھی جانتا ہے اور ان حالات کو تبدیل کرنے پر پوری قدرت بھی رکھتے ہیں اس کے باوجود حالات نہیں بدل رہے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ضرور میرے لیے اس تکلیف و مصیبت میں سے خیر وخوبی کے راستوں کو کھول دے گا، البتہ یہ تصور اور یہ فکر وہ لوگ کرسکتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کی تعلیمات وہدایات پر بھروسہ اور یقین رکھتے ہیں اور ان کے مطابق اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے مؤمن لوگ اس حقیقت کو پوری طرح پالیتے ہیں کہ میرا کام اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کی تعلیمات وہدایات کی پیروی ہے اس کے نتیجے میں جو کچھ ملے گا، وہ خیر ہی ہوگا خواہ اس کی صورت جیسی کیسی بھی ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقدیر کی حقیقت کھل چکی تھی

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تقدیر کی حقیقت کھل چکی تھی، اس لیے وہ انتہائی بہادری، جرأت، سخاوت، شجاعت، قناعت اور صبر واستقلال کے پیکر بن چکے تھے، ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے اللہ تعالیٰ کی راہ میں قدم اٹھاتے تھے تلواروں اور تیروں کی بارش میں گھس کر بے جگری سے دشمن کا مقابلہ کرتے تھے، کیونکہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا، اس لیے ان کے دلوں میں جو عزم ہوتا تھا اس کے سامنے نہ پہاڑ رکاوٹ بن سکتے تھے، نہ سمندر کی تیز موجیں اور نہ ان کے عزم کو بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے جلاسکتے تھے اور نہ مصائب کا طوفان، وہ بظاہر سخت ناکامی کی حالت میں شکستہ دلی اور ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے، وہ کامیابی اور فتوحات کی حالت میں فخر وغرور کے مرض میں مبتلا نہ ہوتے تھے، بلکہ عین کامیابی اور فتح کی حالت میں ان کی گردنیں اللہ تعالیٰ کے آگے پہلے سے زیادہ جھک جاتی تھیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عمل و محنت سے جو بھی نتیجہ نکل کر سامنے آجاتا، وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے سمجھتے تھے، اس لیے وہ نہ کبھی اتراتے، نہ شکستہ دل اور گھبراتے اور نہ وہ کبھی ناامیدی کے شکار ہوتے۔

عقیدۂ تقدیر کے ثمرات و نتائج اس قدر خوشگوار ہوتے ہیں کہ نو مسلموں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں

بہر حال تقدیر کا راز بتلا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر انعام فرمایا کیونکہ اس حقیقت پر ایمان لانے کے جو نتائج اور ثمرات سامنے آتے ہیں وہ اس قدر خوشگوار ہوتے ہیں کہ مسلم معاشرہ میں رہنے والے بہت سے نو مسلموں نے بھی محسوس کیا، انہیں میں سے ایک مغربی اہل قلم "ف۔ س۔ لورڈلے" ہیں جن کے متعلق علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتاب "میں نے اللہ کی جنت میں زندگی بسر کی" کے زیر عنوان لکھتا ہے:

"۱۹۱۸ء میں، میں اپنے ماحول کو چھوڑ کر شمال مغربی افریقہ چلا گیا، وہاں میں نے بدوؤں کے درمیان صحرا میں سات برس گذارے، میں ان کی زبان سیکھتا، ان جیسا لباس زیب تن کرتا، ان کے ساتھ کھاتا پیتا اور ان کے سے ہی معمولات زندگی اختیار کرتا تھا، اس عرصے میں میں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور محمد ﷺ کے بارے میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام "الرسول" ہے وہ سال جو میں نے ان خانہ بدوش عربوں میں بسر کیے میری زندگی کے بہترین سال تھے اور امن و سکون اور لذتِ حیات سے بھرپور بھی۔

میں نے ان صحرا نشینوں میں رہ کر محسوس کیا کہ یہ لوگ انتہائی قلق و اضطراب میں بھی پر سکون رہتے ہیں، میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کا مضبوط اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ مقدر ہے ہو کر رہے گا اسے کوئی نہیں روک سکتا اور کسی شخص کو وہی دکھ پہنچتا ہے جو اس کے لیے لکھ دیا گیا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نزولِ بلا کے وقت ایک دوسرے پر تکیہ کر کے بیٹھ رہتے ہیں اور ہاتھ پاؤں باندھ کر مصیبت پر مصیبت سہتے چلے جاتے ہیں، نہیں! ہرگز نہیں۔ ایک واقعہ سنیے:

ایک دن جھلسا دینے والی تیز ہوا چلی، وہ اتنی شدید تھی کہ صحرا کی بے شمار ریت اٹھائے ہوئے بحر ابیض متوسط عبور کر گئی اور اسے فرانس کی وادی الرون میں جا پھینکا سخت گرمی کی وجہ سے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے سر کے بال جڑوں سے اکھاڑے جا رہے ہوں غرضیکہ یہ مصیبت میرے لیے اتنی ناقابل برداشت تھی کہ میں پاگل ہوا جا رہا تھا، لیکن عربوں کی زبان پر ایک حرف شکایت تک نہ آیا، زیادہ سے زیادہ انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہ تھا: "قَضَاءٌ مَّكْتُوبٌ" یعنی طے شدہ فیصلہ، وہ ایسے مواقع پر زیادہ سرگرمی سے کام کرتے، چنانچہ انہوں نے

مُہلک لو چلنے سے پہلے ہی اپنی بھیڑ بکریوں کے بچے ذبح کر دیے، پھر ڈھور ڈنگر لے کر جنوب کی طرف پانی کے کنارے چلے گئے اور کوچ کا یہ انتہائی تکلیف دہ کام انہوں نے کمال صبر وسکون اور خاموشی کے ساتھ انجام دیا، ان کے قبیلے کے سردار نے کہا کہ: "ہمارا کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا، ہم تو سب کچھ کھو کر بھی صبر کرنے کے عادی ہیں، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اب کے ہمارے مویشی تقریباً چالیس فی صد زندہ بچ رہے ہیں۔ انہیں سے ہم نئے سرے سے کام کا آغاز کر سکتے ہیں۔" (ایمان اور زندگی:۶۹-۷۰)

تقدیر کے اثرات کا خلاصہ

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ انسانی زندگی پر تقدیر کے جو اثرات پڑتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱.... تقدیر پر ایمان رکھنے والا ناکامیوں اور تنگیوں وغیرہ میں مایوسی کا شکار نہیں ہوتا اور نہ وہ بے ہمت ہوتا ہے، بلکہ اپنے ارادے اور عمل کی اصلاح کرتا رہتا ہے اور پوری ہمت سے کام لے کر اللہ تعالیٰ سے خیر وکامیابی کا امیدوار ہوتا ہے۔

۲.... وہ دولت وثروت، مال واولاد کی کثرت اور منصب وفتوحات پر اترانے والا، فخر کرنے والا، احسان جتانے والا اور بخل کرنے والا نہیں ہوتا۔

۳.... اس کا اعتماد اپنی تدبیر اور اسباب پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کا بھروسہ اللہ تعالیٰ اور اس کی ہدایات واحکامات کی تعمیل پر ہوتا ہے۔

۴.... عین مصیبت کے وقت بھی وہ اللہ تعالیٰ سے خیر کثیر کا امیدوار ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اسی مصیبت اور تکلیف کے اندر سے بہت زیادہ خیر ونفع کی صورتیں نکال دے۔

۵.... ایسا شخص قانع اور اپنی روزی پر مطمئن رہتا ہے۔ وہ کسی کی عزت اور کسی کے مال وثروت وغیرہ جیسی خوشحالیوں سے نہیں جلتا، بلکہ وہ ہمیشہ تقدیر پر راضی رہتا ہے جیسا کہ ہسپتال میں پڑے ہوئے مریض اپنی اپنی دوائیوں اور ڈاکٹر کی تجویز کردہ ہلکی پھلکی غذاؤں پر قانع رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے نہیں جلتے اور سب کے سب شفیق ڈاکٹر کے ساتھ محبت رکھتے ہیں اگرچہ وہ ان کو کڑوی دوا پلاتا ہے آپریشن کرتا ہے اور سخت پرہیز بتاتا ہے۔

۶.... تقدیر پر ایمان رکھنے والا مال ومنصب کے حصول کے لیے جائز اسباب اختیار کر لیتا ہے، کیونکہ اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ عزت وذلت، خوشحالی اور بدحالی سب مقدر ہیں پھر ان چیزوں کے لیے ناجائز اسباب کے اختیار

کرنے کی کیا ضرورت؟

۷.... وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں خطرناک سے خطرناک کام کے لیے قدم اٹھاتا ہے۔ پوری بہادری و شجاعت سے باطل کا مقابلہ کرتا ہے، کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ موت کا اپنے وقت پر آنا یقینی ہے اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ لہٰذا مجھے وہی کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، غرض یہ کہ جو کام کرنے کے ہیں یعنی حق ہیں اس کے دل میں ان پر جمے رہنے کا وہ عزم ہوتا ہے جن کو نہ پہاڑ روک سکتے ہیں اور نہ سمندر بہا کر لے جا سکتا ہے اور نہ حوادث و مصائب کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے ہیں۔

تقدیر کے بارے میں آخری گزارش

تقدیر کا تعلق عالَم غیب سے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت، قدرت اور اس کی صفات سے تعلق رکھتی ہے اس لیے بہت نازک اور مشکل مسئلہ ہے۔

اس کی اصل حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ انسان کا علم و عقل محدود اور اللہ تعالیٰ کی ہر صفت غیر محدود ہے تو غیر محدود کو محدود عقل سے تولنے کی مثال ایسی ہے جیسا کہ سنار کے ترازو میں پہاڑوں کا تولنا۔

تقدیر کے جس قدر ضروری گوشے ہیں جن کا تعلق انسان کی عملی زندگی سے ہے اور جن سے انسان کی زندگی سنور سکتی ہے ان ضروری گوشوں کو قرآن و حدیث نے کھول کر بیان کیا ہے اور ان کا ضروری بیان یہاں بھی آ چکا ہے۔ اس سے آگے اس مسئلہ پر زیادہ کاوش نہ کریں۔ یہ کاوش بے سود بھی ہے اور نقصان دہ بھی، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ایسی فضول کاوشوں سے سختی سے منع فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقدیر پر سچائی کے ساتھ ایمان نصیب کرے اور اس کے نیک نتائج اور ثمرات سے بھرپور حصہ اٹھا لینے کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین ثم آمین یارب العالمین)

باب..... مؤمن ومسلم

مؤمن کیا ہوتا ہے اور مسلم کیا؟ جو شخص اللہ تعالیٰ، اس کی صفاتِ کمال، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے پیغمبروں، آخرت اور تقدیر پر ایمان رکھتا ہے اور ان چھ حقائق پر محکم یقین واعتماد رکھتا ہے اس کو مؤمن کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ان حقائق کو پالے گا اور ان حقائق پر یقین کرے گا وہ اپنے آپ کو صرف ایک اللہ رب العالمین کا محتاج پائے گا، اس کے خوف وامید اور تمام حوائج ومشکلات کے حل کا مرکز ومرجع، ماوی وملجاء ایک اللہ تعالیٰ ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اپنی پوری عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات کے سامنے جھکے گا، وہ صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات وہدایات کے حوالے اور سپرد ہو جائے گا، اس کامل سپردگی کا اعلان واقرار اور عہد وپیاں ان الفاظ میں کرے گا لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ، اس طرح کامل حوالگی اور سپردگی کا نام اسلام ہے اور جو شخص اسی طرح کامل طور پر اپنے آپ کو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون وہدایت کے حوالے اور سپرد کر دے اس کو مُسلم یا مسلمان کہا جاتا ہے۔ یہی وہ مؤمن اور مسلم ہے جس پر تمام امور میں اعتماد وبھروسہ کیا جاتا ہے، لوگ اس کے قول وفعل اور کردار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ وہ ہر ذی حق کا حق دیتا اور دلوانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ وہ گھر، معاشرہ ملک اور پوری دنیا میں حسب استطاعت امن وسلامتی قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور لوگوں کو عدل وقسط پر لانے کے لیے دوڑ دھوپ کرتا رہتا ہے۔ [1]

عقائد کی اس تفصیل کے بعد اب ایمان کے خلاصہ کو لکھ دیا جاتا ہے جس کے اندر یہ سارے عقائد سمٹ کر آجائیں گے۔

عقیدہ اور ایمان کا خلاصہ

عربی میں کسی چیز کے دل سے سچ ماننے کو ایمان کہتے ہیں جس میں کامل بھروسہ کا مفہوم بھی شامل ہے، اور شریعت کی خاص اصطلاح میں ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اللہ کا رسول مانا جائے اور ان پر اتری ہوئی یقینی طور پر ثابت شدہ تمام تعلیمات وہدایات کو حق اور سچ مان کر ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا جائے (یعنی رسول کی اطاعت واتباع کو اپنے اوپر لازم کیا جائے)، ایمان کی یہ سیدھی سادی تعریف اور تعبیر ایسی ہے جو مختصر

---

[1] لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید)

ہونے کے ساتھ جامع بھی ہے اور ایمانی سرحدوں کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

کیا ایمان صرف جاننے اور یقین کا نام ہے؟

چنانچہ ایمان جو تصدیق کو بھی شامل ہے صرف یہ نہیں کہ کسی چیز کا یقینی علم و معرفت حاصل کی جائے، بلکہ شرط یہ ہے کہ جان لینے اور پہچان لینے کے بعد دل سے اس کو قبول بھی کر لیا جائے۔ خود قرآن مجید ایسے بہت سے لوگوں کے بارے میں خبر دے رہا ہے جن کو رسول کی صداقت و حقانیت اور رسول کی رسالت کا پورا علم اور یقین حاصل تھا اور ان کے سامنے روزِ روشن کی طرح ایسے دلائل اور مشاہدات آئے تھے جن کے بعد معرفت و یقین کے بغیر کوئی چارہ ہی نہ تھا جیسا کہ ایک بینا شخص کے لیے دوپہر کے وقت سورج کا علم۔ مگر وہ اپنے قصد و اختیار کے ساتھ پیغمبر کی طرف صدق کی نسبت نہیں کرتے تھے، محض ضد و عناد اور تکبر کی وجہ سے انکار کرتے تھے اس لیے وہ علم و معرفت کے باوجود بے ایمان اور سخت ترین کافر قرار دیے گئے۔

چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے فرمایا: لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ ”اے فرعون! تو خوب جان چکا ہے کہ ان (نشانیوں اور معجزات) کو بصیرتیں بنا کر آسمانوں اور زمین کے رب کے سوا اور کسی نے نہیں نازل کیا۔ (اسراء:۱۰۲)

اگر فرعون کا جان پہچان نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کیوں کہتے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا درست نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کے اس جملہ کو اللہ تعالیٰ کیوں نقل فرماتے۔ اس سے بڑھ کر دوسری جگہ فرعون اور اس کے پیروکاروں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا

”انہوں نے محض ظلم و تکبر کی بنا پر ان آیات کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان (کی صداقت) کا یقین کر چکے تھے۔“ (النمل:۱۴)

مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ اور اس طرح دوسری آیتوں اور حدیثوں سے یہ ثابت ہے کہ محض علم و معرفت کو ایمان نہیں کہا جا سکتا، بلکہ جاننے پہچاننے کے ساتھ دل سے ماننے اور قبول کرنے کو ایمان کہا جاتا ہے ورنہ جہاں تک جاننے پہچاننے کا تعلق ہے تو وہ ابلیس اور بہت سے کفار کو بھی حاصل تھا، ان کو یقین تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول ہیں لیکن ضد و عناد اور تکبر کی وجہ سے جاننے کے باوجود نہ ماننے کی وجہ سے خود قرآن مجید نے انہیں بدترین کافر قرار دیا ہے۔

علم و معرفت کے ساتھ اگر محبت بھی ہو لیکن جب تک اطاعت کی رسی گلے میں نہ ڈالے اس وقت تک کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا

مذکورہ بالا تعریف کی رو سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ رسول ﷺ کی حقانیت کو جاننے پہچاننے کے ساتھ اگر کوئی ان کی خدمت بھی کرتا ہو اور ان کے ساتھ محبت بھی کرتا ہو لیکن جب تک وہ آپ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کو دل سے قبول نہ کر لے اس وقت تک وہ مسلم اور مؤمن نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ ایک طویل واقعہ میں ہے کہ روم کے بادشاہ ہرقل کو دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا مبارک خط دے دیا۔ پھر اس کے بعد اس نے ابوسفیان سے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں سوالات کیے اور ابوسفیان نے جوابات دیے۔ ان کو غور سے سن کر ہرقل نے ہر سوال و جواب کو خود بھی دہرایا کہ:

"میں نے تم سے ان کا نسب پوچھا تم نے کہا کہ وہ ہم میں اعلیٰ شریف خاندان کے ہیں اور پیغمبر ہمیشہ اپنی قوم کے شریف ترین خاندان میں بھیجے جاتے ہیں۔

اور میں نے تم سے یہ پوچھا کہ ان کی قوم میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟ تم نے کہا، نہیں! اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر اس سے پہلے کسی نے بھی یہ بات کہی ہوتی تو میں یہ کہتا کہ یہ شخص (قوم کے) پہلے کسی نبوت کے مدعی کی نقل اتارتا ہے۔

اور میں نے تجھ سے جو یہ پوچھا کہ اس کے باپ دادوں میں کوئی بادشاہ گذرا ہے (جس کی حکومت آپ لوگوں نے ان سے چھین لی ہو) تم نے کہا، نہیں! اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ اگر ان کے آباواجداد میں کوئی بادشاہ گذرا ہے تو یہ سمجھ لوں کہ وہ شخص (پیغمبری کا بہانا کر کے) اپنی بادشاہت واپس لینا چاہتا ہے۔

اور میں نے پوچھا کہ اس بات کے کہنے (یعنی نبوت کا دعویٰ کرنے) سے پہلے کبھی اس کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے تم نے کہا نہیں۔

تو اب میں نے سمجھ لیا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ وہ لوگوں کے بارے میں تو جھوٹ سے پرہیز کریں اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے۔[1]

اور میں نے تجھ سے پوچھا کیا اس کے ماننے والوں میں اکثریت امیروں کی ہے یا غریبوں کی؟ تم نے کہا کہ

---

[1] یعنی جو انسان پوری زندگی میں کسی قسم کا جھوٹ نہ بولے وہ دفعتہً غلط دعوی نبوت کس طرح کر سکتا ہے، جو مخلوق کے معاملے میں اس قدر محتاط ہو وہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں اس قسم کی بے باکی اور بے احتیاطی پر کیسے اتر سکتا ہے؟ (مختار)

غریب لوگوں کی۔ اور پیغمبروں کے تابعدار (اکثر) غریب ہی ہوتے ہیں۔

اور میں نے تجھ سے پوچھا کہ وہ بڑھ رہے ہیں یا گھٹ رہے ہیں؟ تم نے کہا کہ بڑھ رہے ہیں (یعنی ان کے ماننے والوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے) اور ایمان کا یہ معاملہ رہتا ہے یہاں تک کہ پایہ تکمیل تک پہنچ جائے۔

اور میں نے تجھ سے پوچھا کہ کوئی اس کے دین میں آکر پھر اس کو برا سمجھ کر پھر جاتا ہے؟ تو نے کہا نہیں اور ایمان کی بشاشت اور حلاوت ہی ایسی چیز ہے کہ ایمان جب رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے [1] اور جب دل میں اتر جائے (تو پھر نکلتا نہیں)۔

میں نے تجھ سے پوچھا کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ تم نے کہا نہیں اور پیغمبر ایسے ہی ہوتے ہیں وہ عہد نہیں توڑتے۔

میں نے تجھ سے پوچھا کہ وہ کیا حکم دیتے ہیں؟ تم نے کہا کہ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانو اس کی عبادت کرو اور اس کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور بت پرستی سے منع کرتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ نماز، امانت، سچائی، پاکدامنی کو اختیار کرو اور حرام کاری سے بچے رہنے کو اپنا شعار بناؤ۔

اس تبصرے کے بعد ہرقل نے ابوسفیان سے کہہ دیا:

فإن كان ماتقول حقًا فسيملك موضع قدمي هاتين وقد كنت أعلم أنه خارج لم أكن أظنُّ أنَّه منكم فلو أَنِّي أعلم أني أخلص إليه لتجشمت لقاءَهُ ولو كنتُ عنده لغسلت عن قدميه

”جو کچھ تم نے بیان کیا اگر واقعی صحیح ہے تو (وہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا رسول ہے اور) وہ عنقریب میرے قدموں کی جگہ کا مالک ہو گا (یعنی وہ وقت دور نہیں کہ ان کی حکومت یہاں تک پہنچ جائے گی) اور مجھے معلوم تھا یہ پیغمبر تشریف لانے والے ہیں (اور اسی کے ہم منتظر تھے کیونکہ ہماری مذہبی کتابوں میں ان کی کھلی نشانیاں موجود ہیں) [2] لیکن میرا گمان نہیں تھا کہ وہ تم میں سے مبعوث ہوں گے اور اگر مجھے یہ علم ہو جائے کہ میں ان تک پہنچ جاؤں گا تو ان سے ملنے کی ضرور کوشش کروں گا اور اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پاؤں کو دھوتا (یعنی ان کی خدمت کرتا)۔ (صحیح بخاری)

---

[1] علماء امت فرماتے ہیں کہ ارتداد کا شکار وہی ہوتا ہے جس کے دل میں ایمان نہ اترا ہو اور جس کے دل میں ایمان اتر جائے تو اس کا دل سے نکلنا بہت دشوار ہے۔ (مختار)

[2] بہت کچھ تحریف اور رد و بدل کے باوجود آج کے بائبل میں بھی آپ ﷺ کی کھلی نشانیاں موجود ہیں۔ (دیکھیے ”دہریت سے اسلام تک“ باب حقانیت اسلام) (مختار)

پھر اس کے بعد شاہِ روم ہر قل نے آپ ﷺ کا خط منگوایا جو آپ نے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ بھیجا تھا اور اس خط کو مجمع عام میں پڑھوایا گیا۔ جب درباریوں نے دیکھا کہ ہر قل آپ ﷺ کی طرف مائل ہیں تو وہاں شور مچایا اور ابوسفیان وغیرہ سب وہاں سے نکال دیے گئے۔ ابوسفیان نے بھی اس بات کا اقرار کیا کہ آپ ﷺ کا معاملہ تو بہت بڑھ گیا، بہت ترقی کرلی کہ قیصر روم ہر قل جیسی شخصیت بھی ان سے خائف ہے۔

اس کے بعد ہر قل نے اس خط کو مع اس کے پورے پس منظر کے رومیہ (جس کو آج کل رومۃ الکبریٰ کہا جاتا ہے) کے بہت بڑے ظغاطر نامی پادری کے پاس بھیج دیا۔ یہ پادری علم میں ہر قل کا نظیر اور جوڑ تھا، اس نے بھی ہر قل کی رائے کی موافقت اور تصدیق کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی سچے نبی ہیں جن کے ہم منتظر تھے۔

جب ہر قل کو پادری کا جواب آیا تو اس وقت وہ حمص شہر میں جاکر ٹھہرا تھا۔ ہر قل کی جب اس بڑے پادری (جس کو سب نصاریٰ مانتے ہیں) نے بھی موافقت کی تو اب اس کو امید ہوئی کہ شاید اب ہماری قوم مان جائے گی اور آپ ﷺ کی رسالت کو مان جائیں گے کیونکہ دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ بھی کہہ رہا ہے اور دین کا سب سے بڑا عالم بھی، چنانچہ اس امید پر روم کے بڑے بڑے لوگوں کو بلایا مگر چونکہ ایک بار ہر قل اپنی رائے سے ان لوگوں کی نفرت دیکھ چکا تھا، اس لیے اس بار یہ طریقہ اختیار کیا کہ سب کو اپنے محل میں بلا کر چاروں طرف سے باہر نکلنے کے سب دروازے بند کر دیے اور خود ایک بالاخانے کے اوپر بیٹھ کر تقریر کی تاکہ اچانک کوئی اس پر دست اندازی نہ کرسکے (اور اگر وہ نہ مانے تو پھر ان کے جوش و خروش کو بھی بآسانی ختم کیا جاسکے) یہ بندوبست کر کے اس نے بالا خانہ کے اوپر سے جھانک کر یہ تقریر کی:

یامعشر الرّوم هل لکم فی الفلاح والرّشد وان یّثبت ملککم فتبایعوا هذا النبی

"اے روم کے لوگو! کیا تم اپنی کامیابی و بھلائی اور اپنی بادشاہت پر قائم رہنا چاہتے ہو، اگر ایسا ہے تو اس پیغمبر سے بیعت کرلو۔"

یہ سنتے ہی لوگ جنگلی گدھوں کی طرح دروازوں کی طرف لپکے، دیکھا تو وہ بند ہیں۔ جب ہر قل نے قوم کی یہ نفرت اور ایمان سے یہ وحشت دیکھی تو اپنی اس تقریر کی یہ وجہ بیان کی کہ میں نے جو بات اب تک تم سے بیان کی ہے اس کا مطلب صرف آپ کا امتحان لینا تھا کہ دیکھوں کہ تم اپنے دین پر کس مضبوطی سے قائم ہو اور امتحان میں کرچکا (اور مجھے مسرت ہوئی)۔" (دیکھیے صحیح بخاری وغیرہ)

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ہر قل کو آپ ﷺ کی رسالت و صداقت پر کس قدر یقین تھا۔ بعض روایتوں

میں یہ بھی ہے کہ اس نے آپ ﷺ کے خط کو بہت ہی احترام کے ساتھ ریشمی کپڑے میں لپیٹ کر بہت حفاظت سے رکھ دیا اور کہا کہ "جب تک یہ خط میرے پاس رہے گا ایک بہت بڑی خیر کی چیز رہے گی۔"

اس واقعہ سے یہ بھی پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ ہرقل کا انکار تعصب اور حسد کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ اس نے تو آپ ﷺ کے خط مبارک سے اس قدر اثر قبول کیا کہ آپ ﷺ کی قدم بوسی کا متمنی تھا اور چاہتا تھا کہ اس کی ساری قوم بھی اسلام میں داخل ہو جائے مگر شوق اور جاننے سے کیا ہوتا ہے جب کہ وہ رعایا اور درباریوں کے خوف سے اور تخت و تاج کی محبت کی وجہ سے آپ ﷺ کی اطاعت کی رسی گلے میں نہ ڈال سکا اور ایمان و دینِ اسلام سے محروم ہو کر دنیا سے چلا گیا۔

غرض یہ کہ صرف یقین (بلکہ اس کے ساتھ خدمت اور محبت کو بھی اگر ملا لیا جائے تو اس) سے کوئی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ آپ ﷺ کی پوری تعلیمات کی اتباع و اطاعت کو قبول نہ کیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ بہت سے عرب اور اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے رسول ہیں اور جو دینِ شریعت پیش کرتے ہیں وہ سراسر حق و سچ ہے مگر ان میں سے بہت سے لوگ بغض و عناد اور تکبر کی وجہ سے اور بعض دنیاوی مفادات فوت ہونے کے خدشہ سے ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے دل و دماغ میں ایمان کا نور داخل نہ ہو سکا اور کافر ہی کافر رہے اور ان حقائق کا جاننا ان کے کوئی کام نہ آیا۔

البتہ کفر کے مختلف درجات ہونے کی حیثیت سے کسی ایک کا کفر کسی دوسرے کی بنسبت ہلکا ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے ہر ایک کو اپنے اپنے کفر کے مطابق دائمی سزا ملتی رہے گی۔ واللہ اعلم۔

کیا ایمان کو چھپایا جا سکتا ہے؟

جن حقائق کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے ان کا زبان سے اقرار اگرچہ ایمان کے لیے ضروری ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہے جس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو دل سے مان لیا ہے اور ان کی اطاعت کا التزام اپنے اوپر کر چکا ہے لیکن کسی سخت مجبوری کی وجہ سے وہ اس کو چھپاتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کر سکتا تو ایسا شخص مؤمن ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں اللہ تعالیٰ ایک مؤمن کے متعلق فرماتے ہیں:

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ

"اور (اس موقع پر) آل فرعون میں سے ایک مؤمن شخص جس نے اپنا ایمان چھپائے رکھا تھا آکر

کہا۔۔۔" (مؤمن:۲۸)

اس طرح نجاشی نے بھی اپنی رعایا کے خوف سے عام طور پر ایمان کا اعلان نہیں کیا تھا اور اپنے ایمان کو اپنی قوم سے چھپاتا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے مؤمن ہونے کی اطلاع رسول اللہ ﷺ نے فرمائی اور اس کی نماز جنازہ پڑھائی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نجاشی نے ایمان کا عام اظہار نہ کرنے کے باوجود دل سے رسول اللہ ﷺ کو مان لیا تھا۔ اس کے برعکس ہرقل اگرچہ رسول اللہ ﷺ کو پہچان گیا تھا کہ یہی وہ آخری نبی برحق پیغمبر ہیں جن کی نشان دہی آسمانی کتابوں نے کی تھی، لیکن اس نے رعایا کے خوف اور بادشاہت کی محبت کی وجہ سے التزامِ اطاعت اور اتباع کو اختیار نہیں کیا جس کی وجہ سے وہ دولت ایمان سے محروم رہا۔

مذکورہ بالا مثالوں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ اگر کوئی شخص لوگوں کے سامنے کسی مجبوری کی وجہ سے ایمان کا اظہار نہ کرے اور دل سے پختہ اعتقاد رکھے تو وہ مؤمن ہے، البتہ جب تک مسلمانوں کو اس کے ایمان کا علم نہ ہو اور اس پر کوئی شہادت موجود نہ ہو تو وہ اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ نہ کر سکیں گے البتہ جو شخص بلا کسی عذر کے اقرار نہ کرنے پر اصرار کرتا رہے اور اپنے ایمان اور اسلام کا اظہار نہ کرے یا مطالبہ پر بھی بلا کسی عذر کے اقرار نہ کرے تو وہ بالاتفاق کافر ہے۔

ایمان کی اہمیت

دینِ اسلام میں ایمان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ایمان انسان کے اعمال کی روح اور جڑ ہے، اس کے بغیر اعمال کی نہ کوئی عمارت کھڑی ہو سکتی ہے اور نہ اس کے بغیر کوئی عمل قبول ہوتا ہے، بلکہ خدانخواستہ اگر ایمان جاتا رہا تو حالتِ ایمان میں کیے ہوئے اعمال بھی بے روح اور بے بنیاد ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں، اسی حقیقت کو قرآن نے جگہ جگہ بیان فرمایا ہے چنانچہ ایک جگہ منافق لوگوں کے متعلق ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ لَمْ يُؤْمِنُوا فَأَحْبَطَ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ

"یہ لوگ ایمان ہی نہیں لے آئے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو ضائع و برباد کر دیا۔" (احزاب:۱۹)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَمَن يَكْفُرْ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ۝

"اور (یاد رکھو) جس نے ایمان کی باتوں سے انکار کیا تو اس کا کیا ہوا (ہر نیک) عمل ضائع اور برباد ہو جائے

گا"۔(مائدہ:۵)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے مقامات پر مختلف انداز سے اسی بات کی اللہ تعالیٰ نے وضاحت کی ہے کہ اگر ایمان نہیں ہے یا ایمان کے بعد کسی نے کفر اور شرک کی راہ اختیار کر لی تو ایسے شخص کے اعمال کا کوئی وزن نہیں رہتا اور اس کے تمام نیک اعمال ضائع اور برباد ہو جاتے ہیں۔

جس کو اسلام اور ایمان پر موت آئی وہ ایک نہ ایک دن جنت میں داخل ہو گا

غرض ایمان ہی ایسا جوہر ہے جو دینِ اسلام کی جڑ یا روح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر اعمال کی کوئی قیمت نہیں لگتی۔ ایمان ہی وہ نعمتِ عظمٰی ہے کہ اگر کوئی اس کو بچا کر اپنے ساتھ آخرت تک لے گیا تو ایک نہ ایک دن ضرور جنت میں داخل ہو گا ایمان اور عقیدے کی اس اہمیت کو بیان کر کے اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ

"بے شک اللہ تعالیٰ شرک ہی کو معاف نہیں کرتا البتہ اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔"(نساء:۴۸)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ایمان کے جوہر عقیدہ توحید سے محروم ہے یا خدانخواستہ کوئی ایمان کے بعد عقیدہ توحید سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اسی پر اس کو موت [1] آ گئی تو ایسا شخص دائمی جہنم کا مستحق ہو گا، اس کے اس بے ایمانی کو کبھی بھی نہیں بخشا جائے گا۔

البتہ شرک اور بے ایمانی کے سوا دوسرے جو گناہ ہیں ان کے ہوتے ہوئے اگر کوئی توبہ کیے بغیر دنیا سے چلا گیا تو اللہ تعالیٰ چاہے کسی کے کوئی گناہ یا سب گناہ بغیر سزا کے معاف کر دے اور اسے پاک اور صاف کر دے یا جہنم کی بھٹی میں گناہوں کی آلودگیوں سے پاک و صاف کر کے اس کو بخش دے اور جنت میں داخل کر دے۔ ایمان اور عقیدہ کی اسی خاصیت کو حدیثوں میں زیادہ تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جن میں چند حدیثوں کو یہاں بطورِ نمونہ پیش کیا جاتا ہے:

۱.... عَنْ عُبَادَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قال مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَاَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَالنَّارُ

[1] یعنی اگر موت سے پہلے پہلے شرک سے توبہ کر کے توحید کو دل و جان سے تسلیم کر کے اپنے ایمان کو بحال کر دے تو اس کی توبہ قبول کی جائے گی۔ (مختار)

حَقٌّ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ

"حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص یہ شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قابل عبادت نہیں، وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور یہ کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ شہادت دے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول اور کلمۃ اللہ ہیں جو اس نے حضرت مریم علیہا السلام کی طرف القا فرمایا اور وہ روح ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور یہ شہادت دے کہ جنت ودوزخ برحق (اور واقعی چیزیں) ہیں تو ایسے شخص کے اعمال کیسے بھی ہوں اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۲.... اور حضرت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک طویل روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ

"جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہتا ہے اور اس کا اس کلمہ سے مقصود اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ہی ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ کی آگ حرام کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

۳.... عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَعَلَيْهِ ثَوْبٌ اَبْيَضُ وَهُوَ نَائِمٌ ثُمَّ اَتَيْتُهُ وَقَدِ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ قُلْتُ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ؟ قَالَ وَاِنْ زَنٰى وَاِنْ سَرَقَ عَلٰى رَغْمِ اَنْفِ اَبِيْ ذَرٍّ

"حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں (ایک دن) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت سفید کپڑا اوڑھے سو رہے تھے (تو اس وقت تو میں واپس چلا آیا)۔ پھر دوبارہ میں حاضر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہو چکے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی بندہ لا الہ الا اللہ کہے اور پھر اسی (عقیدے) پر اس کو موت آجائے تو وہ ضرور جنت میں جائے گا (ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا اگرچہ اس نے زنا اور چوری (جیسے بڑے گناہ) کا ارتکاب کیا ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (ہاں) اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو (ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) میں نے (پھر تعجب سے) عرض کیا اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور اگرچہ اس نے چوری کی ہو (پھر بھی وہ ضرور جنت جائے گا)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا (ہاں) اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو۔ (ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ) میں نے (پھر تیسری بار بہت حیرت سے) عرض کیا اگرچہ اس نے زنا اور چوری

کے جرم کا ارتکاب کیا ہو آپ ﷺ نے پھر فرمایا (ہاں) ابوذر کے عَلَی رَغم ①(وہ ضرور جنت میں جائے گا) اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اگرچہ اس نے چوری کی ہو۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

مذکورہ بالا حدیثوں میں سے بعض میں جہنم کی آگ سے بچنے اور جنت جانے کا ذریعہ صرف کلمہ لا الہ الا اللہ کو بتلایا گیا ہے اور بعض میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپ ﷺ کی رسالت کی شہادت ادا کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ کا بندہ ہونے اور اس کے رسول ہونے کی شہادت اور جنت ودوزخ کی شہادت کو بھی ملا کر ان سب کے ماننے کو دخولِ جنت کا سبب قرار دیا گیا۔

اور مذکورہ حدیثوں کے علاوہ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن میں شرک سے بچنے اور صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کو نجات اور دخولِ جنت کا سبب بتلادیا گیا ہے۔

نجات اور دخول جنت کا دارومدار کس چیز پر ہے؟

درحقیقت یہ سب رسول اللہ کی دعوت ایمان کو قبول کرلینے اور اسلام کو اپنا دین بنالینے کے مشہور ومعروف عنوانات ہیں جن میں کہیں اجمال ہے اور کہیں قدرے تفصیل۔ جن کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص لا الہ الا اللہ اور محمد رسول اللہ کی شہادت دل اور زبان سے ادا کرکے دعوت ایمان کو قبول کرلے اور دینِ توحید یعنی دین اسلام کو اپنا دین اختیار کرلے اور اس بارے میں وہ مخلص اور صاحبِ یقین بھی ہو تو ایسا شخص اگر اسی عقیدۂ اسلام پر انتقال کرگیا تو وہ جنت ضرور بضرور جائے گا۔

لہٰذا اگر کوئی صرف لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کرے اور اسلام کو اپنا دین نہ بنائے، بلکہ کسی اور دین ومذہب پر قائم رہے یا توحید ورسالت کے علاوہ دوسرے ایمانیات اور ضروریاتِ دین سے انکار کرے مثلاً ختمِ نبوت کا انکار کیا یا قیامت کو نہ مانے تو وہ ہرگز اس بشارت کا مستحق نہ ہوگا، بلکہ وہ اس کے برعکس ایمان کے فقدان کی وجہ سے دائمی جہنم کا مستحق ہوگا۔

احادیث سے یہ ثابت ہے کہ ایمان والے ضرور جنت میں جائیں گے لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ قرآن وحدیث میں خاص خاص اعمال پر جہنم کی وعیدیں سنائی گئی ہیں؟

مذکورہ بالا احادیث اور اسی طرح دوسری حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس بندہ کو ایمان واسلام پر

① عربی زبان کا یہ خاص محاورہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ کام تمہیں ناگوار بھی ہو اور تم اس کا واقع نہ ہونا بھی چاہتے ہو جب بھی وہ ہو کر رہے گا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوذر کو کتنا ہی ناگوار گزرے پھر بھی ایمان پر انتقال ہوا آدمی ضرور بضرور ایک دن جنت میں جائے گا۔

موت آگئی اگرچہ وہ بڑے گناہوں کا مرتکب بھی رہا ہو تو بھی وہ ضرور بضرور جنت جائے گا اور احادیث میں یہ بھی آیا ہے کہ جس نے کلمۂ اسلام کہہ دیا یعنی دینِ توحید اور دینِ اسلام کو اپنا دین بنالیا تو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے، لیکن اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو قرآن مجید اور احادیث میں زنا، چوری، شراب، جھوٹ، سود، جھوٹی قسم وغیرہ گناہوں پر مختلف قسم کے سخت عذاب اور دوزخ کی آگ میں ڈالے جانے کی خبر دی گئی ہے، پہلے یہاں نمونہ کے طور پر چند احادیث کو پیش کیا جاتا ہے:

۱.... عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِيَمِيْنِهٖ فَقَدْ اَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهٗ رَجُلٌ وَاِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيْرًا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَاِنْ قَضِيْبًا مِّنْ اَرَاكٍ

”حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق ناجائز طور پر مار لیا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے شخص کے لیے دوزخ کی آگ واجب کر دی اور جنت کو اس پر حرام کر دیا ہے (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے) ایک آدمی نے عرض کیا کہ یارسول اللہ اگرچہ وہ معمولی ہی چیز ہو (یعنی اگر کسی کی بہت معمولی سی چیز پر قسم کھا کر ناجائز طور سے لے لیا تو کیا اس صورت میں بھی دوزخ اس کے لیے واجب اور جنت اس پر حرام ہو گی؟) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں اگرچہ (جنگلی درخت) پیلو کی ٹہنی ہی ہو۔“ (صحیح مسلم)

۲.... عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلٰثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَفِیْ رِوَايَةٍ ”وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ“ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ شَيْخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا اور نہ ان کا تزکیہ کرے گا اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی طرف نگاہ بھی نہیں کرے گا اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے (وہ تین شخص یہ ہیں) ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا حکمران، تیسرا غریب متکبر۔“ (صحیح مسلم)

۳.... عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَاقٌّ وَلَا قَمَّارٌ وَلَا مَنَّانٌ وَلَا مُدْمِنُ خَمْرٍ

”حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت میں نہ وہ شخص داخل ہو گا جو اپنے ماں باپ کی (بلاوجہ شرعی) نافرمانی کرتا ہے اور نہ جوا کھیلنے والا داخل ہو گا اور نہ وہ شخص داخل ہو گا جو صدقہ دے

کر احسان جتاتا ہے اور نہ وہ شخص داخل ہو گا جو ہمیشہ شراب پیتا ہے۔" (مشکوٰۃ)

۴.... اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نشہ پینے والے کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ عَلَى اللهِ عَهْداً لِمَنْ يَّشْرَبُ الْمُسْكِرَ اَنْ يُّسْقِيَهٗ مِنْ طِيْنَةِ الْخَبَالِ قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللهِ وَمَا طِيْنَةُ الْخَبَالِ قَالَ عَرَقُ اَهْلِ النَّارِ اَوْ عُصَارَةُ اَهْلِ النَّارِ

"بلا شبہ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد ہے کہ جو شخص نشہ لانے والی کوئی چیز پیے گا وہ اس کو طینۃ الخبال سے پلائے گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ! طینۃ الخبال کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ دوزخیوں کا پسینہ ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا کہ دوزخیوں سے بہنے والی پیپ اور لہو۔" (مسلم)

مذکورہ احادیث اور اس طرح سینکڑوں احادیث اور قرآن مجید کی آیتوں میں بداعمالیوں کی وجہ سے طرح طرح کے عذابوں اور سزاؤں کا ذکر موجود ہے اور یہ سب کچھ بظاہر ان بشارتی حدیثوں سے متصادم نظر آتا ہے جن میں توحید ورسالت کی شہادت ادا کرنے اور دینِ توحید یعنی دینِ اسلام پر مرنے کے بعد ضرور بالضرور جنت میں داخل ہونے اور جہنم کی آگ سے بچنے کی بشارت دی گئی ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حدیثوں کا صحیح مفہوم اور مدعا معلوم کیا جائے اور ہر ایک بشارت یا وعید کو اپنی اپنی جگہ رکھ دیا جائے۔

قرآن وحدیث میں اکثر وبیشتر کسی عمل اور عقیدے کی ذاتی خاصیت اور طبعی اثر بیان ہوتا ہے قیامت میں فیصلہ مرکبات پر ہو گا

چنانچہ ایسی بشارتوں یا وعیدوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح مادی اشیاء آگ، پانی، ہوا وغیرہ میں الگ الگ اثرات اور خصوصیات رکھی ہیں، اسی طرح اعمال میں بھی خواہ وہ اچھے ہوں یا برے الگ الگ اثرات اور خصوصیات رکھی ہیں، اس قسم کی بشارتوں اور وعیدوں میں متکلم کا مقصد اور مطمع نظر کسی عمل کی ذاتی خاصیت اور طبعی اثر بتلانا ہوتا ہے، وہ اس وقت اس سے بحث نہیں کرتا کہ اگر دوسرے اعمال کا تقاضا اس کے خلاف ہو تو پھر انجام کیا ہو گا۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ جیسے طب کی کتابوں میں مفردات جڑی بوٹیوں اور دواؤں کے خواص بیان کیے جاتے ہیں کہ زعفران کی فلاں خاصیت ہے اور مشک کی فلاں اسی طرح ہریڑ، سناء مکی اور اجوائن وغیرہ ہر ایک کی الگ الگ طبعی اثرات اور خاصیت بیان کی جاتی ہے، لیکن یہ تو ظاہر بات ہے کہ ان چیزوں کی یہ خاصیت جب ہے کہ جب یہ تنہا ہوں اگر ان کے ساتھ کوئی اور چیز ملالی جائے تو اس کا اثر کچھ اور ہو جائے گا مثلاً اگر کوئی شخص مسہل

چیز کے ساتھ قبض پیدا کرنے والی چیز کو بھی ملالے تو اس کا اثر کچھ اور ہو جائے گا۔

نیز دواؤں کے ساتھ پرہیز کی بھی ضرورت پڑتی ہے ورنہ بد پرہیزی کی صورت میں بعض دوائیں تو بالکل بے اثر ہو جاتی ہیں اور بعض دواؤں کا فائدہ بہت دیر کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ انبیا علیہم السلام روحانی اطبا ہوتے ہیں، وہ اعمال کی تاثیرات اور خاصیتیں بیان کرتے ہیں اور اعمال ہی روح پر اثر انداز ہوتے ہیں، اعمالِ صالحہ روحانی امراض کی ادویہ ہیں اور برے اعمال روحانی امراض پیدا کر دیتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر اب توحید پر آنے والی بشارتی حدیثوں کا مطلب خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ ایمان، شراب پینا اور زنا وغیرہ ہر ایک عمل کی علیحدہ علیحدہ تاثیر ہے اور یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ توحید اور ایمان کی یہ تاثیر بیان فرمائی کہ اس پر دوزخ کی آگ حرام ہے اور دوسری جگہ جھوٹی قسم کھا کر کسی کا مال ناجائز طور پر مارنے اور ماں باپ کی نافرمانی وغیرہ کی تاثیر یہ بتلائی کہ ان گناہوں کا مرتکب ہرگز جنت میں داخل نہ ہوگا، گویا ایک دوا قابض ہے اور ایک مسہل مگر یہ تاثیرات ان کی جب ہیں جب ہر ایک دوا کو علیحدہ علیحدہ فی حد ذاتہ دیکھا جائے اور جب دونوں کو ملا کر مرکب بنالیا جائے تو اس وقت دوا اسی طرح اپنی تاثیر و مزاج پر قائم نہیں رہ سکتی، بلکہ مرکب کا کچھ اور ہی مزاج ہوگا جو مفردات کے مزاج سے الگ ہو سکتا ہے، لہٰذا اگر ایک شخص میں ایمان بھی ہے اور وہ ماں باپ کا نافرمان بھی ہے یہ تو مرکب ہو گیا اب اس مرکب کا تاثیر و مزاج کیا ہوگا؟ اس کے متعلق یہ حدیثیں خاموش ہیں۔

باقی رہی وہ بشارتی حدیثیں جن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ جو کلمہ توحید پر انتقال کر گیا وہ لازماً جنت میں جائے گا اگرچہ اس نے چوری اور زنا جیسی بدکاریوں کا ارتکاب کیا ہو ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ ایمان و اسلام پر مرنے کی تاثیر اور خاصیت یہی ہے کہ مؤمن و مسلم لازماً جنت میں جائیں گے اس کی یہ خاصیت بد اعمالیوں کی وجہ سے دب تو سکتی ہے لیکن اس کی تاثیر نہ تو ختم ہو سکتی ہے اور نہ اس میں تغیُّر و تبدُّل ممکن ہے ایمان کے ساتھ بد پرہیزی اور بد اعمالیاں مل کر اس کی یہ خاصیت مغلوب اور مستور تو ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے جنت جانے میں بہت دیر بھی لگ سکتی ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہ کر جنت سے بالکل محروم ہو جائے۔

ایمان کو بچا کر آخرت میں لے جانے والے کا نورِ ایمان گناہوں سے مغلوب ہو کر سزا تو پا سکتا ہے لیکن گناہوں کے دھلنے کے بعد پھر وہ اپنا ذاتی اثر دکھادے گا

ایمان کو بچا کر آخرت میں لے جانے والے کا نورِ ایمان گناہوں سے مغلوب ہونے کی وجہ سے وہ مجرم مؤمن سزا تو پا سکتا ہے لیکن گناہوں کے دھلنے کے بعد پھر وہ ایمان اپنا ذاتی اثر دکھادے گا کیوں کہ بچا یا گیا۔ ایمان

ہی ایسی چیز ہے کہ اگر اس پر گناہوں اور بداعمالیوں کا اثر زیادہ بھی ہوا اور یہ دب کر مغلوب ہو گیا جس کی وجہ سے جرائم اپنا اثر دکھلا کر یہ جہنم چلا گیا تو بھی یہ جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا، بلکہ جرائم کے میل کچیل سے پاک صاف ہو کر ایمان اپنی خاصیت دکھلا کر جنت میں پہنچ جائے گا۔

قیامت میں مرکبات پر فیصلہ ہونے کی پوری تفصیلات اور معلومات تو قیامت ہی میں حاصل ہوں گی، البتہ مذکورہ بالا بحث کی تائید میں قرآن وحدیث سے بطورِ نمونہ کچھ پیش کرتے ہیں۔

خیر اور کسی بھی اچھے عمل کو چھوٹا سمجھ کر نہ چھوڑیں اور نہ کسی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر اس کا ارتکاب کریں قیامت میں ذرے ذرے کا حساب ہو گا

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸

”جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہو گی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہو گی وہ بھی اس کو دیکھ لے گا۔“ (زلزال:۷-۸)

ایمان کے بغیر عمل قبول نہیں بے ایمانی کی وجہ سے انسان نجس ہو کر ہمیشہ کے لیے جہنم میں ہو گا

مذکورہ آیت میں خیر سے وہ بھلائی مراد ہے جو ایمان کے ساتھ ہو بغیر ایمان کے تو کوئی بھلائی نیک عمل نہیں، آخرت میں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا، آخرت میں کسی بھلائی کے لیے اس کی روح ایمانی کی ضرورت ہے اگر وہ نہیں تو ایسی بھلائی کا کوئی نام ونشان دفترِ اعمال میں نہ ہو گا اور ایسے شخص کے لیے دائمی جہنم ہو گی کیونکہ توحید وایمان کے بغیر انسان کی روح و جسم پر صرف گناہوں کی گندگی نہیں لگتی تاکہ اس کو جہنم کی آگ سے صاف کیا جاسکے اور اس کے بعد وہ جنت کا قابل بن جائے، بلکہ اس کی روح و جسم از خود نجس بن جاتا ہے جس کے پاک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مثلاً اگر پیشاب پاخانہ کپڑے پر لگ گیا تو اس کو پانی سے صاف کیا جاسکتا ہے یا سونے پر زنگ لگ جائے تو اس کو آگ سے صاف کیا جاسکتا ہے لیکن خود پاخانہ، پیشاب کو تو پانی سے پاک نہیں کیا جاسکتا اور نہ خود زنگ کو آگ میں ڈال کر اس سے چمکتا ہوا سونا بنایا جاسکتا ہے، لیکن انسان ایسی چیز ہے کہ جس کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اس کا ختم ہونا ناممکن ہے، وہ تو آخرت میں بہر حال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے گا خواہ جنت میں ہو یا دوزخ میں۔

اس آیتِ کریمہ میں بدی سے بھی وہ بدی مراد ہے جو دفترِ اعمال میں باقی رہ گئی ہو، ورنہ اگر توبہ کی وجہ سے

معافی ہو گئی ہو یا وہ چھوٹے چھوٹے گناہ جو نیکیوں یا مصیبتوں کے سیلاب میں بہہ کر معاف ہو چکے ہوں ان کا نام ونشان بھی دفتر اعمال میں نہ ہو گا، البتہ اگر بد اعمالیاں زیادہ ہو گئیں اور اسلام وایمان بچا کر لے جانے والا شخص جہنم میں بھی چلا گیا تو وہ ذرہ برابر ایمان لے جانے باوجود کسی نہ کسی وقت جہنم سے نکل کر اپنے ایمان (جو بہت بڑی نیکی ہے) کی وجہ سے بالآخر جنت میں داخل ہو جائے گا۔

چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جہنم میں سے وہ سب لوگ نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور ان کے دل میں جَو کے دانے کے برابر بھی خیر تھی، پھر وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور ان کے دل میں گیہوں کے دانے کے برابر بھی خیر تھی اور اس کے بعد وہ لوگ بھی نکال لیے جائیں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کہا ہو اور ان کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر تھی۔

(صحیح بخاری و مسلم)

اس حدیث میں تین جگہ لا الہ الا اللہ اور تین جگہ خیر کا لفظ آیا ہے اور اس کی ایک دوسری روایت میں خیر کے بجائے ایمان کا لفظ بھی آیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں بھی خیر سے مراد نور ایمان ہے۔ اس مضمون کی حدیثیں متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہیں، ان میں سے بعض حدیثیں اس کتاب کے "باب الآخرت" میں پڑھی جا سکتی ہیں۔

جو کچھ بیان کیا گیا اس سے ایمان کی اہمیت اور اس کی افضلیت اچھی طرح سامنے آگئی کہ ایمان ہی ایک ایسی چیز ہے جو دینِ اسلام کے لیے تخم، جڑ یا روح کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بغیر کوئی بھی عمل اور بھلائی آخرت میں جہنم کی آگ سے نجات نہیں دلا سکتی، لیکن اگر ایمان ہے (اگرچہ بہت کمزور ہی کیوں نہ ہو خواہ کتنی ہی زیادہ مدت گناہوں کی بدولت وہ جہنم میں رہے) تو بالآخر ایک نہ ایک دن ضرور بضرور پاک وصاف ہو کر چمکتا ہوا اپنے ٹھکانے اور جنت میں چلا جائے گا۔

اعمالِ صالحہ کسے کہتے ہیں؟

عملِ صالح اس عمل کو کہتے ہیں جو مادۂ ایمان واخلاص سے پھوٹا ہو جس میں ایمان واخلاص کی روح دوڑ رہی ہو، نیز وہ عمل درست اور شریعتِ مطہّرہ کی ہدایت کے مطابق بھی ہو نہ کہ اس کا مخالف، مختصر یہ کہ ایمان کے مطابق زندگی کو عملِ صالح کہا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی بھلائی بغیر ایمان واخلاص کے ہے تو ایسا عمل اگرچہ بظاہر عملِ صالح نظر آئے، لیکن وہ صرف نیک عمل کا ڈھانچہ ہے جو شریعتِ مطہّرہ میں مقبول نہیں، اگر ایمان واخلاص

موجود ہے لیکن وہ عمل قرآن مجید اور شریعت کی ہدایت سے متصادم ہے تو بھی عمل صالح نہیں مثلاً کوئی مسلمان ناسمجھی سے چوری کا عمل اس نیت سے کرتا ہے کہ اس سے حاصل شدہ مال اپنے اوپر نہیں، بلکہ فقیروں، مسکینوں اور مساجد پر صرف کرے تو یہ بھی عمل صالح نہیں، بلکہ ایک جرم ہے، بلکہ جرم پر جرم ہے کہ جرم کو جائز سمجھا۔

اعمالِ صالحہ کی اہمیت وضرورت اور نافرمانیوں وجرائم کا وبال

ایمان اگرچہ بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ وہ دینِ اسلام کا تخم، جڑ اور روح کی حیثیت رکھتا ہے کوئی بچا کر اس کو اپنے ساتھ لے گیا تو ایک نہ ایک دن ضرور جنت میں داخل ہو گا، لیکن ایمان یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے ماننے اور توحید والتزامِ طاعت کے ساتھ ایمان وتوحید کو عملی جامہ پہنانے سے تعمیلِ حکم کا دور شروع ہوتا ہے، اب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول ﷺ جو حکم دیں اس کی دل وجان سے تعمیل کریں اور جس چیز سے منع کریں اس سے اپنے آپ کو روک دیا کریں۔ ایمان کا تقاضا تو یہی ہے کہ مؤمن اپنی تمام محبتوں پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور حکم کو مقدم کرے اور اپنی تمام خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلے میں روند کر اس میں خوشی، لذت اور بشاشت بھی محسوس کرے۔

ایمان کے بعد عمل اور حکم بجالانے میں اگر کوئی کوتاہی کرتا ہے تو اس کے اس طرزِ زندگی سے بظاہر یہی معلوم ہو گا کہ اس شخص کا نورِ ایمان بہت ہی کم ہے اور اس کا ایمان بہت ہی ضعیف ہے جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر اپنی خواہشات پورا کرنے کا اہتمام کرتا رہتا ہے، بلکہ بے عملی اور بد عملی پر دوام سے تو اس کے ایمان کے بارے میں شک ہونے لگتا ہے کہ تخمِ ایمان دل میں پڑنے کے بعد آیا وہ خواہشات کے انبار میں دب کر رہ گیا ہے یا خدانخواستہ بذاتِ خود اصل ایمان ہی کو شک وارتیاب کے کیڑے نے کاٹ کر ختم کر دیا ہے کیونکہ تخم پڑنے کے بعد کسی وقت تو اس کا پودا اور درخت نظر آنا چاہیے تھا۔

ایمان کے ساتھ اعمالِ صالحہ ہی دنیا وآخرت میں نجات اور کامیابی کا ذریعہ ہیں اور ایمان میں سراسر خیر ہے

نیز اعمال صالحہ ہی ایسی چیز ہے جن سے انسان کی دنیا وآخرت کی زندگی بن جاتی ہے انہی میں سراسر خیر ہے ،یہی اعمال نورِ ایمان کو بڑھاتے ہیں، ان کی وجہ سے انسان کی روحانی قوت بڑھتی ہے، ان کی وجہ سے انسان کامل فلاح پاسکتا ہے، ان کی وجہ سے انسان دنیا میں اچھی زندگی پاسکتا ہے، ان سے اس کی قبر اچھی ہو جاتی ہے اور ان کی وجہ سے وہ آخرت کی گھاٹیوں محشر، حساب وکتاب، پل صراط اور دوزخ کی مصیبتوں اور عذاب سے بچ جاتا ہے یہی

وجہ ہے کہ قرآن مجید میں عموماً ہر جگہ ایمان کے بعد اعمالِ صالحہ کا ذکر کر کے نجات اور دنیاوآخرت کی کامیابی کا دار ومدار ایمان کے ساتھ اعمال کو بیان فرمایا ہے اور یہی اعمالِ صالحہ ہی ایمان کی علامت اور اس کی عملی شکلیں وصورتیں ہیں۔

بطورِ نمونہ یہاں قرآن مجید سے چند آیتوں کو پیش کر دیتا ہوں:

۱.... وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

”(اے پیغمبر) آپ خوشخبری سنا دیجیے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کہ یقیناً ان کے لیے (جنت کے) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔“ (بقرہ:۲۵)

۲.... وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾

”اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنت کے اہل ہیں وہ ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔ (بقرہ:۸۲)

۳.... مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

”جو کوئی بھی نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ صاحبِ ایمان بھی ہو تو ہم ضرور اس کو (دنیا میں) پاکیزہ (اور پرسکون) زندگی عطا فرمائیں گے اور (آخرت میں بھی) ان کو بہترین اعمال کے مطابق اجر دے دیں گے۔“ (نحل:۹۷)

۳.... وَالْعَصْرِ ﴿۱﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ﴿۲﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴿۳﴾

”زمانے کی قسم (اپنا اصل سرمایہ یعنی اپنے عمر ضائع کرنے کی وجہ سے انسان) بڑے خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے نیز ایک دوسرے کو حق پر قائم رہنے کی نصیحت اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔“ (عصر)

مذکورہ بالا آیتوں اور اسی طرح بہت سی دوسری آیتوں میں انسان کے فلاح ونجات اور خسارے سے بچنے کے لیے ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی بھی قید لگائی گئی ہے اور یہ حقیقت بتلائی گئی ہے کہ پوری کامیابی اور جنت کی ابدی نعمتوں کا حقیقی مستحق وہ ہے جو ایمان اور عملِ صالح دونوں سے متصف ہو اگرچہ صرف ایمان بھی دائمی جہنم سے بچانے کا سبب ہے اور مسلمان کتنا ہی گناہ گار ہو کسی نہ کسی وقت وہ ضرور بضرور جہنم سے نکالا جائے گا اور جنت

میں ضرور پہنچے گا مگر دنیا کی اچھی اور پُر لطف زندگی قبر و محشر، میزان، حساب و کتاب اور پلِ صراط کی مصیبتوں اور عذاب جہنم سے بالکل نجات کا بغیر اعمالِ صالحہ کے کوئی مستحق نہیں ہوتا، بلکہ بے عملی اور بعض بد اعمالیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی وجہ سے بعض اوقات ایمان کی چنگاری بجھ کر بالآخر انسان دنیا سے بے ایمان ہو کر چلا جاتا ہے اور وہ بھی دوسرے کافروں کی طرح ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہنے کا مستحق بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔

برے اعمال کے برے اثرات اور سزا و عذاب

جس طرح اچھے اعمال دنیا و آخرت میں فلاح و نجات کا سبب ہیں، اسی طرح برے اعمال کے روح پر بہت برے اثرات پڑتے ہیں۔ ان کے نتائج بھی دنیا و آخرت میں سنگین نکلتے ہیں۔ ان کی وجہ سے نورِ ایمان دب جاتا ہے اور ایمان کمزور ہو جاتا ہے جیسا کہ اس کے متعلق کچھ حدیثیں پہلے بھی ذکر کی گئیں اور کچھ آیتیں اور حدیثیں خاص خاص جرائم کے تحت ان شاء اللہ پڑھ لیں گے۔ یہاں بھی بطورِ نمونہ چند آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۱.... مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

”جو (صاحبِ ایمان) کوئی نیکی لے آئے گا اس کے لیے (کم از کم) دس گنا اجر ہو گا اور جو کوئی برائی لائے گا تو اس کو (صرف) اسی (ایک برائی) کے برابر بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔“ (الانعام:۱۶۰)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ مؤمنوں اور مسلمانوں ہی کو مخاطب ہو کر ارشاد فرماتے ہیں کہ:

۲.... يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾

”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ البتہ (اس صورت میں کھا سکتے ہو کہ) کوئی تجارت باہمی رضامندی سے طے پائی ہو اور نہ اپنے آپ کو (خودکشی یا کسی دوسرے کو قتل کرنے کی وجہ سے) ہلاک کرو یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بڑا مہربان ہے اور (یاد رکھو) جو کوئی ظلم و زیادتی سے ایسا کرے گا تو اس کو ہم (دوزخ کی) آگ میں ڈال دیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے۔ اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرو گے جن

سے تمہیں منع کیا جارہا ہے تو ہم تمہارے (نامۂ اعمال سے) لغزشیں (یعنی چھوٹی چھوٹی برائیاں) محو کر دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔" (نساء:۲۹-۳۱)

قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیتوں میں گناہ، بلکہ بڑے بڑے گناہ جیسے ناحق مال کھانے والے وغیرہ کو بھی مؤمن کہا گیا ہے۔ یہ آیتیں جس طرح ان لوگوں کے باطل عقیدہ کی تردید کرتی ہیں جو مسلمانوں کو گناہوں کی وجہ سے ایمان واسلام سے نکال دیتے ہیں، اسی طرح یہ ان لوگوں کے گمراہ کن عقائد کی بھی تردید کرتی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان کے بعد بد اعمالیوں کی وجہ سے کوئی مسلمان جہنم کی سزا نہ پاسکے گا۔

یارب تو کریمی و رسول تو کریم　　صد شکر ہستیم کہ من در میان دو کریم

بعض گناہوں سے نورِ ایمان دب کر رہ جاتا ہے اور وہ انسان کی ایمانی کیفیت پر اثر انداز ہوتے ہیں

۳.... عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لَا يَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَشْرَبُ الْخَمْرَ حِيْنَ يَشْرَبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَنْتَهِبُ نُهْبَةً يَرْفَعُ النَّاسُ اِلَيْهِ فِيْهَا اَبْصَارَهُمْ حِيْنَ يَنْتَهِبُهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا يَغُلُّ حِيْنَ يَغُلُّ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاِيَّاكُمْ وَاِيَّاكُمْ

"حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زنا کرنے والا جب زنا کرتا ہے تو اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا۔ چوری کرنے والا جب چوری کرتا ہے تو اس وقت مؤمن نہیں ہوتا۔ شراب پینے والا جب شراب پیتا ہے تو اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا۔ مال لوٹنے والا جب مال لوٹتا ہے اور لوگ اس کی طرف نظر اٹھا اٹھا کر اس کی لوٹ مار کو دیکھتے ہوں (لیکن خوف ودہشت کی وجہ سے بے بس ہوتے ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے) تو اس وقت وہ (لوٹنے والا) مؤمن نہیں رہتا اور خیانت کرنے والا جب خیانت کرتا ہے تو اس وقت وہ مومن نہیں ہوتا پس (اے مؤمنو تم ان جیسے ایمان سوز حرکات سے) اپنے آپ کو بچاؤ بچاؤ۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اس حدیث کو بخاری و مسلم دونوں میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کیا گیا ہے اور اس میں زنا، چوری، شراب نوشی، لوٹ مار اور خیانت کے علاوہ قتل ناحق کا بھی ذکر ہے کہ قتل کرنے والا جب ناحق قتل کرتا ہے تو اس وقت وہ مؤمن نہیں ہوتا۔

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ یہ جرائم ایمان کے قطعاً منافی ہیں۔ یہ وہ بدترین گناہ ہیں جن کا تحمّل نورِ ایمان کسی حالت میں نہیں کر سکتا، جس وقت کوئی شخص یہ حرکتیں کرتا ہے اس وقت اس کا ایمان اس کی خواہشاتِ

نفس میں دب کر رہ جاتا ہے اور اس کے دل میں نورِ ایمان نہیں رہتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ دائرۂ اسلام سے بالکل نکل جاتا ہے اور اس پر کافروں جیسے احکام جاری کیے جائیں گے، بلکہ ایسی صورت میں بھی وہ مسلمان ہی ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جائے گا جیسا کہ اس کی وضاحت پہلے ہو گئی ہے، نیز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں تو اس بات کی تصریح موجود تھی کہ کوئی مؤمن جرمِ زنا کی وجہ سے دائمی جہنم کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ مؤمن ہے بالآخر جنت میں جائے گا، نیز اسی حدیث کی تشریح ایک دوسری حدیث میں یوں آئی ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا زَنَى الْعَبْدُ خَرَجَ مِنْهُ الْاِيْمَانُ فَكَانَ فَوْقَ رَأْسِهٖ كَالظُّلَّةِ فَاِذَا خَرَجَ مِنْ ذٰلِكَ الْعَمَلِ عَادَ اِلَيْهِ الْاِيْمَانُ

"جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سائبان کی طرح معلق ہو جاتا ہے پھر جب وہ اس معصیت سے نکل جاتا ہے تو ایمان (دوبارہ) اس کی طرف لوٹ کر آجاتا ہے۔" (ترمذی وابوداؤد)

یعنی اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہوتا، بلکہ ایسے جرائم کے وقت اس کا نورِ ایمان خواہشات اور گناہ کی تاریکی میں ایسا مدہم پڑ جاتا ہے کہ اس وقت اس کو اللہ تعالیٰ کے حکم کا کوئی احساس باقی نہیں ہوتا یا اگر ہوتا بھی ہے تو اس وقت وہ اس قدر اپنی خواہشات سے مغلوب ہو جاتا ہے کہ اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر مقدم کر دیتا ہے اور نورِ ایمان دب جانے کی وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ کی بڑائی اور آخرت کا وہ احساس نہیں رہتا جو ہونا چاہیے جس کی وجہ سے وہ معصیت اور جرم کا ارتکاب کر جاتا ہے اور اپنے نورِ ایمان کو گنوا دیتا ہے، پھر جب تک اس گناہ پر نادم و شرمندہ ہو کر خلوصِ دل سے توبہ نہیں کر لیتا ایمان کی وہ نورانی کیفیت جو ارتکابِ گناہ سے پہلے اس کو حاصل تھی اس کے دل میں واپس نہیں آتی، لیکن جب بندہ صدقِ دل سے توبہ کر کے اس گناہ سے نکل جاتا ہے تو بہیمیت اور خواہشات کا حجاب چاک ہو جاتا ہے اور نورِ ایمان پھر جگمگانے لگتا ہے۔

اعمال کے متعلق اِفراط و تفریط کا عقیدہ رکھنے والے دونوں فرقے گمراہ ہیں

ایمان کی مذکورہ بالا پوری بحث اور اس طرح کی دوسری قرآنی آیتوں اور حدیثوں سے ایسے لوگوں کی گمراہی کھل کر سامنے آجاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان واسلام کے بعد کوئی بھی گناہوں کی وجہ سے جہنم میں داخل نہیں ہو سکتا۔ نیز اس سے ان لوگوں کی گمراہی کا راز بھی فاش ہو جاتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ نافرمانی اور گناہ کے ارتکاب سے انسان ایمان واسلام سے نکل جاتا ہے۔ یہ دونوں فرقے افراط و تفریط کا شکار ہو کر راہ حق سے بھٹک کر راہِ حق

سے ہٹ گئے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات یہ نہیں کہ ایمان کے بعد کسی نافرمانی اور جرم کا وبال ہی نہیں، بلکہ اس کی تعلیم تو یہ ہے کہ مادی چیزوں کی طرح انسان کے ہر عقیدے، ہر ارادے، نیت اور ہر قول و فعل کا ایک اثر ہے جس سے اس کی روح متاثر ہو سکتی ہے اور ہر ایک کو اپنے اعمال کے مطابق بدلہ دیا جائے گا، لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کوئی مؤمن بس جرم کر کے اسلام و ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ انسان کمزور ہے کبھی اس پر خواہشات کا دباؤ بڑھ جاتا ہے اور نورِ ایمان کی کمی یا کسی اور وجہ سے وہ غلطی کا ارتکاب کر جاتا ہے لیکن خواہش کا طوفان کم ہونے کے ساتھ اپنے رب کی طرف پلٹ کر آجاتا ہے اور سچی توبہ کر لیتا ہے قرآن مجید نے سچے مؤمن کی صفات میں اس کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ۚ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣٥﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾

”اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی فحش کام کریں یا (کسی گناہ کا ارتکاب کر کے) اپنے اوپر ظلم کریں تو (فوراً) انہیں اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتے ہیں اور واقعی اللہ تعالیٰ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور جو کچھ (برا کام) ان سے سرزد ہو چکا ہے اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے عفو، بخشش کا اجر ہے اور ان کے لیے ایسے (جنتی) باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے کیا ہی اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لیے“۔ (آل عمران:۱۳۵-۱۳۶)

بہت سے جرائم ایسے ہیں جن کے مرتکب کو اس کا ایمان بھی جہنم جانے سے نہیں بچا سکے گا

بہر حال قرآنی آیتوں اور حدیثوں سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ بہت سے جرائم ایسے ہیں جن کا مرتکب دنیا و آخرت کی کامیابی نہیں پا سکتا اور ایسے مجرموں کو ان کا ایمان و اسلام بھی جہنم سے نہیں بچا سکے گا جیسا کہ اس کا بیان خاص خاص جرائم کے متعلق وعیدوں میں اس کتاب میں بھی پڑھا جا سکتا ہے، لیکن دوسری طرف قرآن و حدیث سے یہ بھی اچھی طرح معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور محمد ﷺ کو سچا رسول مانتے ہیں اور آپ ﷺ کی اطاعت کو قبول کر چکے ہیں وہ گناہوں کی وجہ سے مجرم تو ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے مگر باغی نہیں، یہ لوگ ضعیف الایمان تو ہیں مگر کافر اور منافق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور ان کے بعد جمہور مسلمین بھی کسی مؤمن کو گناہ کی وجہ سے

کافر نہیں کہتے تھے، بلکہ اس پر تمام احکام مسلمانوں ہی کے جاری رکھتے تھے مثلاً مرنے کے بعد اس پر نماز جنازہ پڑھتے تھے، اس کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفناتے تھے، اسی طرح تمام امور میں اس کے ساتھ دوسرے مسلمانوں جیسا معاملہ کرتے تھے۔

جو عمل اور قول تصدیق فوت ہونے اور اسلام سے بغاوت پر دلالت کرتا ہے اس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے

البتہ اگر کوئی عمل اور جرم ایسا ہو جو اسلام و ایمان سے فرار اور بغاوت کرنے پر دلالت کرے جیسے بتوں (1) کو سجدہ کرنا یا نبی کریم ﷺ کو گالی بکنا یا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور ختمِ نبوت وغیرہ جیسے یقینی احکامات سے انکار کرنا۔ اسی طرح وہ تمام اعمال جو تصدیق کے فوت ہونے اور ایمان و اسلام سے بغاوت ہونے پر دلالت کرتے ہوں تو ان کا ارتکاب کرنے والا شخص بالاتفاق کافر ہے، اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا کیونکہ وجداناً و عرفاً اس قسم کے اعمال ایمان و تصدیق نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

نفسِ تصدیق والتزام میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں

نفسِ تصدیق اور التزامِ طاعت کے لحاظ سے ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی، جو کوئی بھی ایمان واسلام میں داخل ہو گا تصدیق والتزام کی راہ سے داخل ہو گا۔ اگر کوئی اس کی اصل ہی میں نقصان کرتا ہے تو اس کا مطلب یا تو یہ ہو گا کہ وہ دینِ اسلام کے بعض احکامات کو مانتا ہے اور بعض سے انکار کرتا ہے ایسی صورت میں تو ایمان ہرگز قبول نہیں چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کے اس طرزِ عمل کی مذمت کرکے فرماتا ہے:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ

"کیا تم بعض کتاب پر ایمان لاتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو" (بقرہ:۸۵)

یا پھر اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کو تو مانتا ہے لیکن اس کے رسول کو نہیں مانتا یا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے انبیا علیہم السلام بھیجے ہیں ان میں سے وہ کسی کی نبوت ورسالت کو مانتا ہے اور کسی کی نہیں۔ غرض نفس تصدیق واقرار میں کمی بیشی کرنے والوں کے متعلق قرآن مجید کا فیصلہ یہ ہے کہ سرے سے ان کا ایمان ہی قبول

(1) کفار و مشرکین کی عادت یہ ہے کہ وہ بتوں کو سجدہ کرتے ہیں اس لیے بتوں کو سجدہ کرنے والا تو بالاتفاق مشرک اور باغی ہے خواہ کسی نیت سے سجدہ کیا ہو اس پر کفر و شرک کے احکام جاری ہوں گے البتہ اگر کوئی انسان کو سجدہ کرے تو اس کے متعلق علما میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اس سے مشرک ہو جاتا ہے یا کہ نہیں؟ لیکن اس پر اتفاق ہے کہ ایسا کرنے والا مجرم اور حرام کا مرتکب ہے۔

نہیں اور وہ پکے کافر ہیں چنانچہ ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿١٥١﴾

”بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ (تصدیق کے لحاظ سے) اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے درمیان فرق کریں اور (اپنے اس عقیدے کا زبان سے اقرار کر کے) کہتے ہیں کہ (پیغمبروں میں سے) بعض پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہی لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔“(نساء:۱۵۰-۱۵۱)

غرض نفس تصدیق و اقرار میں تو کمی بیشی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، نیز تصدیق و التزامِ طاعت یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ جن چیزوں پر ایمان لانے اور ماننے پر آدمی اسلام و ایمان میں داخل ہو جاتا ہے ان میں تو تمام مسلمان برابر ہیں۔ جو کوئی اسلام و ایمان کو قبول کرے تو جب تک وہ اس پر قائم رہے اس کو وہی حقوق ملتے رہیں گے جو دوسرے مسلمانوں کو ملیں گے اور جس طرح دوسرے مسلمان دینِ اسلام کی ہدایات و احکامات کے پابند ہوں گے اسی طرح یہ بھی پابند ہو گا۔ اس اعتبار اور حیثیت سے اس میں کوئی فرق نہیں، حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے جو یہ منقول ہے: الإيمان لا يزيد ولا ينقص اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ نفسِ تصدیق و اقرار میں تو کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی، اس میں تو ہر مؤمن شریک ہے خواہ وہ انبیا ہوں یا اولیا یا عام مسلمان ان میں نفسِ ایمان و تصدیق کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں سب کے ایمان لانے کا دار و مدار ایک ہی قسم کی تصدیق پر ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ کر کے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: إيماني كَإِيمَانِ جِبْرَائِيل ”میرا ایمان جبرائیل علیہ السلام کے ایمان جیسا ہے“۔

اور جب ان سے سوال کیا گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہمارا ایمان جبرائیل جیسے برگزیدہ فرشتے جیسا ہو اور ان جیسی ایمانی کیفیت ہم کو بھی حاصل ہو تو اس کے جواب میں حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ايماني كَإِيمَانِ جِبْرَائِيل وَلَا أَقول مِثْل ايمان جبرئيل ”میرا ایمان جبرائیل کے ایمان جیسا ہے“۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میرا ایمان (کیفیت میں اور قوت کے لحاظ سے) جبرائیل کے ایمان کے برابر ہے۔ اس قول میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں نے كَإِيمَانِ جِبْرَائِيل کہا ہے کاف تشبیہ کے لیے آتا ہے اور تشبیہ میں

یہ ضروری نہیں ہوتا کہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں ہر لحاظ سے یکساں حیثیت رکھتے ہوں، بلکہ کسی ایک درجہ کی مشابہت کافی ہوتی ہے جیسا کہ کوئی کہتا ہے: زید کالأسد "زید شیر جیسا ہے" تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ زید تمام صفات میں شیر جیسا ہے، بلکہ مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ شجاعت اور بہادری میں شیر کی طرح ہے تو میرا مطلب بھی یہی ہے کہ میں اپنے ایمان کے بارے میں تمام اعتبارات اور حیثیتوں سے ایمان جبرائیل علیہ السلام کی برابری کا مدعی تو نہیں بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ (نفس تصدیق کے لحاظ سے) میرا ایمان جبرائیل علیہ السلام کے ایمان جیسا ہے یعنی جن چیزوں پر جبرائیل امین علیہ السلام کا ایمان ہے یا جن چیزوں کی تصدیق سے جبرائیل امین علیہ السلام مؤمن ہیں انہیں چیزوں پر ایمان لانے اور انہی چیزوں کی تصدیق سے میں بھی مؤمن ہوں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل خود ان کے ایک قول میں بھی موجود ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں: أکرہ أنْ یقول الرجلُ إیمانی کإیمان جبرائیل ولکن یقول اٰمنتُ بما اٰمَنَ بِہٖ جبرئیل یعنی "میں اس بات کو برا جانتا ہوں کہ کوئی یہ کہہ دے کہ میرا ایمان (ہر لحاظ سے) ایمان جبرائیل جیسا ہے، بلکہ یوں کہہ دے کہ میں اس چیز پر ایمان لایا جس پر جبرائیل ایمان لائے۔"

نفسِ تصدیق واقرار میں تمام مؤمنین برابر ہیں

یہ تو ظاہر ہے کہ جن چیزوں پر ایمان لانا اور جن چیزوں کو ماننا مؤمن کے لیے ضروری ہے ان پر ایمان لانے میں سب برابر ہیں۔ اس لحاظ سے تو پیغمبر اور امتی میں بھی کوئی فرق نہیں، اس پر قرآن مجید بھی شاہد ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَؕ

"رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کی گئی ہے اور جو لوگ (دعوت حق پر) ایمان لائے وہ بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔" (بقرہ:۲۸۵)

یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہدایات پر جس طرح اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایمان رکھتے ہیں، اسی طرح عام مؤمنین بھی انہی ہدایات پر ایمان لاتے ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے نفسِ تصدیق وایمان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور عام مؤمنین کو برابر کر دیا یعنی جن چیزوں کی تصدیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہیں ان کی تصدیق وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو اللہ کے رسول کے ماننے والے اور مسلمان ہیں۔

ایمان میں قوت وضعف اور نور و کیفیت کے لحاظ سے کمی بیشی ہوا کرتی ہے

لیکن قوت اور نورِ ایمان کے اعتبار سے درجات میں بہت بڑا فرق ہوا کرتا ہے مثلاً کہاں رسول اللہ ﷺ کا ایمان اور کہاں ہمارا ایمان؟ آپ ﷺ کے ایمان کے ساتھ تو ہمارے ایمان کی وہ نسبت بھی نہیں ہو سکتی جو قطرے کو سمندر سے ہے قرآن مجید میں جہاں جہاں ایمان میں زیادتی کا بیان ہے اور جس جس مقام سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے اس سے نفس ایمان اور تصدیق میں کمی بیشی مراد نہیں، بلکہ اس سے مراد قوت، کیفیت اور نور ایمان میں ترقی و کمی ہوا کرتی ہے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ

"(وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے) جس دن آپ مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو دیکھیں گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا۔" (الحدید:۱۲)

یعنی قیامت کے دن مؤمن کو اس کے ایمان کے بقدر نور ملے گا اور ہر مؤمن کا نور اس کی قوتِ ایمانی اور اعمالِ صالحہ کے مطابق ہو گا، کسی کا نور بہت زیادہ اور تیز ہو گا، کسی کا بہت کم حتیٰ کہ بعض کا نور اس قدر کم ہو گا کہ نہ ہونے کے برابر ہو گا قوت اور نور ایمان کی زیادتی پر تصریح کرتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا

"مؤمن تو وہ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔" (انفال:۲)

دوسری جگہ اس حقیقت کی تصریح ان الفاظ سے کی ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا مَّعَ اِيْمَانِهِمْ

"وہی (اللہ) تو ہے جس نے مؤمنوں کے دلوں میں سکینہ نازل فرمایا تا کہ (پہلے) ایمان کے ساتھ وہ اپنا ایمان اور بڑھالیں۔" (الفتح:۴)

قرآن مجید کی متعدد آیتوں اور حدیثوں سے قوت و کیفیت اور نورِ ایمان ویقین میں کمی و بیشی ثابت ہے اور ایمان کے اس اعتبار وحیثیت سے لوگوں میں بہت بڑا فرق ہوا کرتا ہے، بعضوں کی قوتِ ایمان اور نورِ ایمان قربانیوں اور اعمالِ صالحہ کی وجہ سے پہاڑوں سے بھی زیادہ مضبوط اور سورج سے زیادہ روشن ہوا کرتا ہے اور بعض

کی قوتِ ایمان اور نورِ ایمان اس قدر کم ہوتا ہے کہ اگر اس سے تھوڑا بھی نیچے آجائے تو وہ مسلمان ہونے کے بجائے منافق ہو جائے گا، اسی لحاظ اور حیثیت سے ایمان میں کمی بیشی کو ہمارے اسلاف اور محدثین حضرات نے یوں تعبیر کیا ہے:

الإیمان معرفۃٌ بالقلبِ وَإقرَارٌ بِاللِّسَانِ وَعَمَلٌ بالأرْ کَانِ یَزِیْدُ بالطَّاعَۃِ وَیَنْقُصُ بالمِعْصِیَّۃِ

"ایمان معرفتِ قلبی اور اقرار باللسان اور عمل بالارکان کا نام ہے جو اطاعت (اور عملِ صالح) سے بڑھتا ہے اور معصیت ونافرمانی سے گھٹتا ہے۔"

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردوں نے اس کی تفصیل کی ہے اور اس کو کھول کر یوں بیان فرمایا ہے:

الإیمان اقرارٌ باللسان وتصدیق بالجِنَانِ وجمیع ما صحَّ عن رسول اللہ ﷺ من الشرع والبیان کلّہ حق والإیمان واحد وأھلہ فی أصلہ سواء والتفاضل بینھم بالخشیۃ والتُقٰی ومخالفۃ الھوٰی وملازمۃ الاَوْلٰی

"ایمان زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق اور ان تمام احکام کو جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہیں شریعت اور بیان وغیرہ میں سے انہیں حق ماننے کو (ایمان) کہتے ہیں اور ایمان واحد ہے اور سب ایمان دار اصل میں برابر ہیں، البتہ ان میں خشیتِ الٰہی و تقویٰ اور خواہشات کی مخالفت اور افضل و بہتر باتوں کا التزام اختیار کرنے کے اعتبار سے فرق ہوا کرتا ہے۔" (عقیدہ الطحاویہ)

یعنی دل وزبان سے ان امور کے صحیح اور حق ہونے کو تسلیم کرے جو رسول اللہ ﷺ سے صحیح طور پر ثابت ہیں۔ اس اصل ایمان والتزام میں تو سب اہلِ ایمان برابر ہیں، اس میں تو کمی بیشی نہیں ہو سکتی البتہ مراتب کا فرق اور ایمان میں کمی بیشی اور باہمی تفاضل اعمال کے اعتبار سے ان کی وجہ سے نورِ ایمان، قوتِ ایمانی اور ایمان کی کیفیت بڑھتی اور گھٹتی ہے۔

طاعات، قربانیوں اور اعمالِ صالحہ سے نورِ ایمان ترقی کرتا رہتا ہے

بلاشبہ اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ہدایات پر چلنے اور استقامت سے قوتِ ایمانی اور یقین بڑھتا رہتا ہے۔ یہ تو مشاہدہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی رائے و نظریات اور اپنی خواہشات و مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ کے حکم کو مان لیتا ہے اور اپنی جان ومال، خواہشات اور ذاتی مفادات کی قربانی کی راہ اختیار کر لیتا ہے اور اپنی زندگی کی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو ملحوظ رکھ کر اپنے ایک ایک لمحہ کی قدر کر لیتا

ہے تو اس کے ایمان ویقین میں ایسی ترقی ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی لذت اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور ان قربانیوں ومجاہدات کی وجہ سے ایسا شرح صدر ہو جاتا ہے کہ دینِ اسلام کی ہدایات وتعلیمات کے متعلق اس کے دل میں تذبذب اور شک شبہ باقی نہیں رہتا، ہر ہر عقیدہ اور ہر ہر حکم اس کے دل کی آواز بن جاتا ہے، طاعت اور اعمالِ صالحہ اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ کی معرفت کے فوارے اس پر کھل جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اس قدر بڑھ جاتی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بڑائی کے متعلق کیا ہوا ہر تصوّر اور کیے ہوئے نیک اعمال بھی خطا اور برائی نظر آتے ہیں جیسا کہ کوئی کسی اجنبی آدمی کو فقیر سمجھ کر کے اس کی کچھ معمولی عزت واکرام کرے اور اس کو معمولی کھانا کھلائے، لیکن بعد میں اس کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تو کوئی معزّز اور محترم شخصیت ہے تو پہلے والا وہی اکرام واعزاز اور کھانا جو اس کو بہت سمجھ رہا تھا اب اس کو بے اکرامی سمجھے گا اور معذرت کرے گا اور اس کا اور زیادہ اکرام کرے گا، پھر اگر اسی شخص کے متعلق اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ تمام مسلمانوں کا امام وامیر ہے تو اب وہی سب کچھ اعزاز واکرام اس کی نظروں میں ہیچ ہو جائے گا جس کو وہ چند لمحے قبل بہت زیادہ سمجھ رہا تھا اور پھر اس سے معذرت کرنے لگے گا کہ جناب میں تو آپ کا کوئی اکرام واعزاز نہ کر سکا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی عظمت وبڑائی تو لا محدود اور بے انتہا ہے، اس لیے اس مؤمن کا جتنا نور ایمان بڑھتا ہے اتنی ہی اس پر اللہ تعالیٰ کی عظمت کھلتی جائے گی اور اللہ تعالیٰ کی صفات کی پہچان حاصل ہوتی رہے گی اور ہر ہر لمحہ اپنے نیک عمل اور پہلے کیے ہوئے سے معذرت خواہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر اور اپنی کوتاہی پر استغفار کرتا ہے اور وہ اپنے اندر جو کچھ پاتا ہے اور اس پر جو علوم کھلتے ہیں اس کے بیان کرنے کے لیے اس کے پاس زبان نہیں ہوتی اور دل کی آنکھ ہر حال میں اپنے رب کی طرف دیکھتی رہتی ہے اور اس کے حکم کی منتظر رہتی ہے۔ وہ کسی بھی تردُّد اور وہم وخوف کا شکار نہیں ہوتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ہر تقدیر پر راضی رہتا ہے اور اس میں وہ خیر ہی خیر دیکھتا ہے۔

ایمان کی بڑھتی ہوئی کیفیت کے بارے میں کیا لکھا جائے وہ تو بڑھتی چلی جاتی ہے، البتہ اس کے متعلق اتنا کہوں گا کہ قوتِ ایمان اور نورِ ایمان بڑھ کر نور ویقین کے اس سیلاب میں ڈوب جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفاتِ عالیہ، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات واطاعت میں کامیابی اور طاعت کی کوتاہی میں ناکامی اس قدر دل کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس کو اس قدر یقین حاصل ہوتا ہے کہ اتنا احساس ویقین ایک بینا شخص کو

دوپہر کے چڑھتے ہوئے سورج کے بارے میں نہیں ہوتا۔

نافرمانیاں اور بداعمالیاں قوت کو نقصان پہنچاتی ہیں

اس کے برعکس جو مسلمان اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات کو مقدّم کرکے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و احکامات میں نقصان کرتا رہتا ہے اور قربانیوں کے بجائے اپنی خواہشات کے راستوں پر چل پڑتا ہے، خلوص وطاعت میں کمی کرتا رہتا ہے تو ایسا شخص نورِ ایمان اور قوت ایمان کی آخری سرحد پر پہنچ جاتا ہے جس سے اگر اور بھی کم ہو جائے تو ایمان کا کوئی درجہ نہ رہ کر تصدیق و یقین کے بجائے شک و تذبذب اور اسلام کے بجائے نفاق کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے، بہر حال یہ بات تو کھل کر سامنے آگئی کہ قوت و ضعف کے لحاظ سے ایمان کے درجات مختلف ہوا کرتے ہیں، کسی کے پاس سرمایہ یقین و ایمان بہت زیادہ ہوتا ہے، کسی کے پاس بہت کم اور کسی کا ایمان اس قدر ضعیف ہوتا ہے کہ (ایمان کی اس کمزور چنگاری کے ہوتے ہوئے بھی) اس کو کالعدم قرار دیا جاسکتا ہے۔

کیا ایمان واسلام میں فرق ہے؟

کیا ایمان واسلام دو متقابل اور الگ الگ چیزیں ہیں یا دونوں ایک ہیں؟ اس کے بارے میں یہ تفصیل ہے کہ ایمان تصدیقِ قلبی کا نام ہے، یعنی دل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو سچا ماننا اور اسلام اعمال ظاہرہ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرنے کو کہا جاتا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ اسلام اور ایمان لغوی معنی کے اعتبار سے الگ الگ معنی رکھتے ہیں۔ ایمان کے معنی دل سے کسی بات کو مان لینے کے ہیں اور اسلام کے معنی اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض حدیثوں میں ایمان تصدیق قلبی کو بتلایا گیا ہے اور اسلام کو کلمۂ شہادت، نماز روزہ وغیرہ جیسے اعمال سے تعبیر کیا گیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ شریعتِ مطہّرہ میں اسلام اور ایمان دو الگ الگ چیزیں ہیں اور مؤمن و مسلم دو متقابل اصطلاحیں ہیں، بلکہ بعض جگہ صرف یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایک ایمان ہے جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے وہ دکھائی نہیں دیتا، البتہ وہ اپنی صورت یعنی اطاعت اور فرمانبرداری میں دکھائی دیتا ہے اور اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے جیسا کہ انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے اور اس کی روح اس کے ڈھانچے اور شکل وصورت میں دکھائی دیتی ہے لیکن یہاں بھی اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ کوئی بظاہر مطیع اور فرمانبردار ہو گا لیکن اس کی یہ فرمانبرداری ایمان کا نتیجہ اور تخم میں سے نہ ہوگی، بلکہ اس کا منبع دنیاوی مفاد اور نفاق ہو گا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر یہ ادب سکھلایا کہ کسی

کے ایمان (جیسی مخفی اور قلبی چیز) پر قسم کھا کر یقینی بات کہنا ایک جرأت مندانہ اقدام اور نامناسب حرکت ہے، البتہ اگر کسی کے متعلق یقینی حکم لگانا ہی ہے تو اس کے ایسے عمل پر لگائیں جو غیبی امور کے بجائے ظاہر میں دکھائی دے اور محسوس ہونے والا ہو۔ ایسے موقع پر اسلام اور ایمان میں فرق کرنا مقصود نہ تھا اور نہ شریعت کی اصطلاح میں اسلام کو ایمان سے جدا کیا جاتا ہے، کیونکہ کسی کو دل سے ماننے کے بعد ہی کوئی اپنے آپ کو اس کے سپرد کر سکتا ہے اور اس کی اطاعت کو اختیار کر لیتا ہے، شریعتِ مطہَّرہ میں بھی صرف اسی اطاعت کی قیمت لگتی ہے جس کا منشاء اور منبع ایمان ہو، ایمان کے بغیر ظاہری اطاعت نفاق بن جاتی ہے نہ کہ اسلام۔

دینِ اسلام کی روح ایمان قلبی ہے اور اعمالِ صالحہ اس کا جسم وڈھانچہ

گویا اسلام کی ایک صورت اور ایک روح ہے۔ روح اسلام ہی ایمان ہے اور مسلمان بھی اسے کہتے ہیں جس میں ایمان موجود ہو اور جس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے قانون واحکام پر یقین وبھروسہ کر کے اپنے آپ کو اللہ اور اس کے احکامات کے سپرد اور حوالے کر دیا ہو۔ ورنہ بغیر ایمان کے اپنے کو مسلمان باور کرانے والا تو منافق کہلاتا ہے نہ کہ مسلمان۔ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے احکامات کے حوالہ نہیں کر سکتا ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان فرمایا ہے یہاں صرف تین مقامات کو پیش کرتے ہیں۔

۱.... ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ

”ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی، بلکہ وہ (ہر باطل کی طرف سے کٹ جانے اور صرف اللہ تعالیٰ کی طرف) یکسو مسلم تھے۔“ (ال عمران:٦٧)

۲.... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہے:

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ

”(اے پیغمبر) فرمادیجیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔“ (انعام:١٤)

۳.... اور سورتِ انعام میں ایک جگہ ارشاد ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ

”اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔“ (انعام:١٢٥)

اسی طرح اور بھی بہت سی آیتوں سے یہ ثابت ہے کہ اسلام اپنی روح کے ساتھ سرِ تسلیم خم اور اپنے آپ کو اللہ

تعالیٰ اور اس کے قانون واحکامات کے کامل سپردگی اور حوالگی کو کہتے ہیں اور اس کی روح عین ایمان ہے۔

غرض اصطلاح شرع میں ایمان و اسلام اور ان کے صاحب مؤمن و مسلم دونوں لفظ یکساں مفہوم کے لیے استعمال ہوتے ہیں، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کی تصدیق کرنا، احکامِ شریعت کو قبول کرنا اور اقرار کرنا، اس سے انسان ایمان و اسلام میں داخل ہو جاتا ہے اور اسی کو مسلم و مؤمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ایمان کے مراتب و درجات اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایمانی قوت

پچھلے صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا اس سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوئی کہ ایمان کے درجات و مراتب قوت وضعف کے لحاظ سے بے شمار ہیں اور یہی نورِ ایمان ہے جو انسان کے اقرار اور اعمال میں دوڑتا پھرتا ہے اور وہ اس کی زبان اور اس کے دوسرے اعضا پر اپنا اثر ڈال دیتا ہے۔

ایمان اور اخلاص جتنا قوی اور زیادہ ہوگا اعمال اتنے اچھے، تروتازہ اور اسی قدر قوی ہوں گے اور ان کی قیمت اسی قدر زیادہ لگے گی مثلاً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ادنیٰ اور کم رتبے والے صحابی کا ایمان جس قدر مضبوط تھا اس کا اندازہ ایک حدیث سے لگایئے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

لَا تَسُبُّوا أَصْحَابِي فَلَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلَا نَصِيفَهُ

”میرے صحابہ کو برا نہ کہو کیونکہ تم میں سے اگر کوئی آدمی اُحد پہاڑ کے برابر سونا (بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں) خرچ کرے تو وہ کسی صحابی کے ایک مُد[1] یا آدھے مد خرچ کرنے کے برابر بھی نہیں ہو سکتا۔“ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے عام صحابی کے ایمان کا یہ حال ہے تو خاص صحابہ مثلاً ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہم کی ایمانی حالت کیا ہوگی اور اس سے بڑھ کر انبیا علیہم السلام کی ایمانی قوت کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ پھر تمام انبیا علیہم السلام کے سردار رحمۃ للعالمین جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے یہ گواہی دی کہ:

وَإِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

”اور بے شک آپ عظیم الشان اخلاق کے رتبہ پر فائز ہیں۔“ (القلم:۴)

---

[1] مُد اناج ناپنے کا ایک پیمانہ ہے جو وزن کے لحاظ سے تقریباً ایک سیر کا ہوتا ہے۔

"خلق عظیم" کسی معمولی ذات کی طرف سے نہیں کہا گیا ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ عظیم کا کلام ہے۔ ایک بھیک مانگنے والا نادار کسی کے بارے میں یہ کہہ دے کہ فلاں بڑا مال دار ہے تو اپنی حیثیت اور اپنے علم کے مطابق کہے گا، ایک لاکھ پتی کسی کے متعلق کہہ دے کہ فلاں بڑا مال دار ہے تو وہ اپنی شان اور اپنی حیثیت کے مطابق کہے گا، ایک بادشاہ کسی کے بارے میں کہہ دے کہ فلاں بہت دولت مند ہے تو وہ اپنے رتبے اور اپنی حیثیت کے لحاظ سے کہے گا۔ ظاہر ہے کہ فقیر، نادار کے نزدیک تو وہ شخص بھی بڑا مال دار ہے جس کے پس سو دو سو روپیہ ہوں لیکن لاکھ پتی کے نزیک بڑے مال دار کا پیمانہ اور ہو گا۔

اسی طرح جو جتنا زیادہ مال دار ہو گا اتنا وہ اپنے پیمانے سے ناپ کر ہی کسی کے متعلق کہے گا کہ فلاں بہت بڑا مالدار ہے تو جس مخلوق اور جس بندے کے متعلق خالق کائنات رب العالمین اور اللہ العظیم یہ فرمائے کہ "یقیناً تم اخلاق کے عظیم رتبے پر فائز ہو۔" (اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ اخلاق جس قدر اعلیٰ اور برتر ہوتے ہیں یہ اسی قدر ایمانی قوت کی دلیل اور علامت ہیں کیونکہ اخلاق تصرف ایمانی اور تعلق مع اللہ ہی سے پیدا ہوتے ہیں) تو ان کی ایمانی قوت کی کیا شان ہو گی اور مخلوق میں سے کون ایسا ہو سکتا ہے جو اس کو بیان کرے اور کون ہے جو اس کا اندازہ کر سکے۔ بلاشبہ کوئی بھی انسان جب ایسے عظیم انسان اور اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے کی خوبیوں، ان کے کمالات اور سیرت کے متعلق جو کچھ کہے گا یا لکھے گا تو اس نے خاتم الانبیا سید المرسلین محمد ﷺ کی عظیم سیرت اور ایمان کے متعلق جو کچھ اندازہ لگایا ہو گا تو وہ اندازہ سمندر میں سے ایک قطرہ نکالنے کے برابر ہو گا۔

قوت وضعف کے لحاظ سے کفر و شرک اور نفاق کے بھی بے شمار درجات ہیں

جس طرح ایمان میں قوت وضعف کے لحاظ سے بے شمار مراتب اور درجات ہو سکتے ہیں اسی طرح کفر و شرک اور نفاق (جو ایمان و توحید کی ضد ہیں، ان) کے بھی مختلف درجات اور مراتب ہو سکتے ہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ

"بلاشبہ وہ لوگ جنھوں نے ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کیا پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی اور یہی لوگ ہیں جو گمراہ ہیں۔" (آل عمران:۹۰)

ایک دوسری جگہ یہود کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتے ہیں:

وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا

"اور (تم دیکھو گے کہ) جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے وہ (بجائے اس کے کہ ان کے لیے ہدایت کا باعث بنے ان کی ضد و عناد کی وجہ سے) ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر میں زیادتی کا سبب بن جاتا ہے۔" (مائدہ:۶۴)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

اَلۡاَعۡرَابُ اَشَدُّ كُفۡرًا وَّ نِفَاقًا

"(منافقین میں سے) بدوی (اور دیہاتی) لوگ کفر اور نفاق میں زیادہ سخت ہیں"۔ (توبہ ۹۷)

ایک جگہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے متعلق فرماتے ہیں:

وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ فَزَادَتۡهُمۡ رِجۡسًا اِلٰی رِجۡسِهِمۡ وَ مَاتُوۡا وَ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

"جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) مرض ہے تو اس (صورت) نے ان کی (سابقہ) خباثت پر ایک اور خباثت بڑھایا اور وہ اس حال میں مر گئے کہ وہ کافر تھے۔" (توبہ:۱۲۵)

اسی طرح بہت سی قرآنی آیتوں اور احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ کفر اور نفاق وغیرہ کے مختلف درجات و مراتب ہیں کسی کا کفر بہت زیادہ ہوتا ہے اور کسی کا کم۔

کون سی بداعمالیاں ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتی ہیں؟

قرآنی آیات اور احادیثِ مبارکہ میں جہاں کہیں کسی معصیت اور گناہ پر نفی ایمان یا کفر و شرک یا نفاق کا اطلاق کیا گیا ہے وہاں اس سے مراد یہ ہے کہ یہ سب امور کفر، شرک یا نفاق کے ہیں، ان سے وہ اعمال مراد ہیں جو ایمان و توحید کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ شعبے اور شاخیں ہیں جو انسان کے عمل اور اس کے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں اور کمی زیادتی کے اعتبار سے ان کے احکام بھی مختلف ہوئے البتہ جب وہ ایک معروف اور معین حد پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر ان پر کفر، شرک اور نفاق کے احکام صادر ہوتے ہیں۔

انسان کے اعمال میں کفر و نفاق وغیرہ کے موجود ہونے کی ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھیے کہ پانی کے ایک گلاس میں اگر دانہ چینی ڈال دی جائے تو اس کے متعلق یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اس گلاس میں چینی ہے لیکن اس وقت تک اس کو شربت نہیں کہا جاتا جب تک وہ اس حد تک نہ پہنچے کہ جس کے بعد وہ پانی میٹھا ہو جائے، آلو میں چینی ہے، گندم میں چینی ہے، اسی طرح بہت سی چیزوں میں تھوڑی تھوڑی چینی موجود ہے جن کے متعلق یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ ان میں چینی موجود ہے لیکن ان کے بارے میں یہ نہیں

کہا جاسکتا کہ یہ چینی ہے، البتہ کبھی کبھی ان پر چینی کا اطلاق بھی عرف میں کیا جاتا ہے مثلاً جب چائے میں چینی زیادہ ہو جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ تو خالص چینی ہے، اسی طرح کفر، ظلم، شرک اور نفاق ہر ایک کے مختلف بے شمار مراتب ہیں جن کے اعتبار سے احکام بھی مختلف ہوا کرتے ہیں مثلاً شرک طمع میں موجود ہے کہ اس کے دل کی آنکھ دوسروں کی طرف جھانک رہی ہے، لیکن طمع کو شرک اور اس کے صاحب کو مشرک نہیں کہا جاتا، اسی طرح شرک کی اس سے باریک ترقسمیں بھی ہیں جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک موقع پر یہ ارشاد فرمایا:

هُوَ فِيْكُمْ اَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ وَسَأَدُلُّكَ عَلٰى شَيْءٍ اِذَا فَعَلْتَهٗ اَذْهَبَ عَنْكَ صِغَارَ الشِّرْكِ وَكِبَارَهٗ وَتَقُوْلُ "اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ" تَقُوْلُهَا ثَلَاثاً

"شرک تم میں چیونٹی کے رینگنے کی آواز سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہے اور میں تمہیں ایک دعا سکھاتا ہوں اگر تم وہ مانگو گے تو چھوٹا اور بڑا ہر قسم کا شرک تم سے جاتا رہے گا یہ دعا تین بار مانگتے رہو: اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَاَنَا اَعْلَمُ وَاسْتَغْفِرُكَ لِمَا لَا اَعْلَمُ "اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ جان کر دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت چاہتا ہوں اس شرک سے جس کو میں نہیں جانتا۔"

(دیکھیے تفسیر قرطبی آخری سورت کہف)

ظلم کسے کہتے ہیں؟

شرک کے بعد ظلم کو لیجیے! ظلم، عدل وانصاف کی ضد ہے جو بے عدلی، بے انصافی، کسی چیز کے غلط استعمال یا کسی چیز کو بے موقع یا بے محل رکھنے یا کسی چیز میں صحیح توازن اور تناسب کے نظر انداز کرنے اور نامناسب کام کرنے کو کہتے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ بے انصافی، حق تلفی، نامناسب کام اور غلط استعمال کے بے شمار مراتب ہیں جن میں خلافِ اولیٰ کام بھی آجاتے ہیں اور جو کسی کا حق مارنے، حد سے تجاوز کرنے، کسی کو ناحق لاٹھی مارنے اور ناحق جان سے مارنے، کفر وشرک اور نفاق سب کو شامل ہے، کوئی ظلم اس قدر چھوٹا ہو سکتا ہے کہ اس کو عرف عام میں ظلم بھی نہیں کہا جاسکتا اور نہ اس پر کوئی حکم لگ سکتا ہے اور کوئی ظلم اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے انسان کی دنیا وآخرت دونوں تباہ وبرباد ہو جاتے ہیں اور جہاں سے ظلم کی کوئی معروف حد (جو مثلاً خلافِ اولیٰ کی حد سے شروع ہو سکتی) ہے اس کے مختلف درجات ومراتب کا فرق قرآن مجید میں موجود ہے چنانچہ کفار کے متعلق اللہ تعالیٰ

ارشاد فرماتے ہیں:

وَالْكَافِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ

''اور جو لوگ کافر ہیں وہی ظالم ہیں۔''(بقرہ:۲۵۴)

حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو شرک کی مذمت یوں فرمائی:

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

''شرک یقیناً بہت بڑا ظلم ہے''۔(لقمان:۱۳)

اسی طرح کم از کم اور ایسا ظلم جس کے ناپنے کے لیے مخلوق کے پاس کوئی پیمانہ نہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات سے اس ظلم کی نفی کے لیے اور ہمارے ذہنوں کو قریب کرنے کے لیے یہ الفاظ استعمال فرمائے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا۔''(نساء:۴۰)

گناہ اور جرم کے چھوٹے بڑے ہونے کا دارومدار ظلم پر ہے

اسی طرح بہت سی آیتیں اور احادیث ایسی ملتی ہیں جن سے اچھی طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ظلم کم سے کم بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ بھی اور یہی مادہ ظلم ہے جو اگر کم ہے تو چھوٹے گناہوں اور خلافِ اولیٰ کاموں کی صورتوں میں ظاہر ہوا کرتا ہے اور جب زیادہ ہوتا ہے تو بڑے بڑے جرائم کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اگر کسی شخص کی سیرت میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ اس کو بد اخلاق، بد سیرت اور بد کردار بنا دیتا ہے اور یہی وہ ظلم و ناانصافی ہے کہ جب اعمال میں آ جاتی ہے تو وہ انسان کو فاسق بنا دیتے ہیں اور یہ ظلم ہی تو ہے جو اگر تھوڑا سا بھی انسان کی نیت اور اخلاص میں آ جاتا ہے تو وہ اس کے عمل میں باریک سے کفر یا کمزور نفاق یا معمولی سے شرک کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اگر عقیدہ سے صفتِ عدل اٹھ گئی اور اس کے بجائے ظلم آ گیا تو یہ ظلم کفر، شرک اور نفاق کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس کے بعد وہ اپنے صاحب کو ظلم عظیم کے رتبے پر پہنچا دیتا ہے، پھر اس پر بس نہیں، بلکہ جتنا جتنا یہ ظلم بڑھتا چلا جائے گا کفر، نفاق اور شرک میں اضافہ ہوتا رہے گا، جو کوئی جتنا جتنا راہِ اعتدال (دینِ اسلام) سے ہٹ کر ظلم اور ناانصافی کا مرتکب ہو جاتا ہے اس کو اسی انداز پر مصیبتوں اور عذاب کا سامنا ہو گا۔

مذکورہ بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آئی ہو گی کہ تمام جرائم، کفر، نفاق اور ناشکری کا منبع اور سرچشمہ

ظلم، بے اعتدالی اور ناانصافی ہے اور اسی ظلم کی کمی اور زیادتی کے اعتبار سے کفر، نفاق اور شرک میں سے ہر ایک کے بے شمار مختلف درجات اور مراتب ہوا کرتے ہیں، جن کے اعتبار سے احکام بھی مختلف ہوا کرتے ہیں بعض میں یہ چیزیں بہت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہیں اور بعض میں یہ چیزیں اعلیٰ پیمانے پر ہوتی ہیں اور اسی لحاظ سے لوگوں میں بہت تفاوت ہے۔

انسان پکا کافر پکا مشرک اور پکا منافق کب ہوتا ہے؟

لیکن شریعتِ مطہّرہ نے جس طرح دوسرے مواقع پر انسانیت کی پوری رہنمائی فرمائی ہے، اسی طرح اس نے یہاں بھی ایک امتیازی خط کھینچ لی کہ ظلم، کفر، نفاق اور شرک جب تک انسان کے عقیدے اور اصل ایمان میں داخل نہ ہوا ہو اس وقت تک وہ اپنے ظلم، بداعمالی اور بداخلاقی کے مطابق مجرم اور فاسق ہے لیکن اگر یہی کچھ کسی کے اصل ایمان اور عقیدے میں داخل ہو جائیں تو وہ شخص پکا کافر یا پکا مشرک یا پکا منافق بن جائے گا اب ان شاء اللہ تعالیٰ آگے صفحات میں اسی کفر و نفاق اور بے ایمانی کی انواع واقسام ذکر کی جائیں گی۔

کفر کیا ہے اور پکا کافر کون ہے؟

ایمان کے متعلق تو معلوم ہوا کہ ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو رسول مانا جائے اور ان پر اتری ہوئی تمام تعلیمات اور ہدایات کو حق اور سچ مان کر ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا جائے۔ اس سے کفر کی تعریف بھی خود بخود نکل آئی کیونکہ اصطلاح میں کفر ایمان کی ضد ہے۔ لہٰذا کفر یہ ہے کہ یا تو سرے سے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو اللہ کا برحق رسول نہ مانا جائے یا اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی لائی ہوئی ہدایات اور احکامات میں کسی ایک بھی تعلیم وہدایت اور حکم کا انکار کیا جائے۔

البتہ اس میں قدرے تفصیل ہے کہ جو شخص اللہ کے رسول ﷺ کی حیاتِ مقدّس میں براہِ راست ان کی زبان مبارک سے ان کی لائی ہوئی ہدایات اور احکامات کو سنیں اس کے لیے تو ہر اس بات کا ماننا اور قبول کرنا شرطِ ایمان ہے جو اللہ کا رسول اس کے سامنے بیان کرے۔

لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے رسول کی لائی ہوئی تعلیمات اور احکامات براہِ راست نہیں، بلکہ بالواسطہ پہنچے ہوں ان کے لیے صرف ان تعلیمات اور ہدایات کا ماننا اور قبول کرنا شرطِ ایمان ہے جو اللہ کے رسول سے ایسے یقینی طور [1] پر ثابت ہوں جن میں کسی شک وشبہ اور کسی تاویل کی بھی گنجائش نہ ہو تو ایسی تعلیمات اور ہدایات میں سے

---

[1] یقینی طور پر ثبوت کا بیان ان شاء اللہ تعالیٰ عقائد کے باب میں آئے گا۔

اگر کوئی کسی ہدایت کا بھی انکار کرے تو وہ مؤمن نہیں اور اگر وہ پہلے مسلمان تھا تو وہ ملتِ اسلام سے خارج ہو کر کفر کی سرحد میں داخل ہو جائے گا۔

کفر کی انواع واقسام اور اس کی صورتیں

جب کفر کی تعریف سامنے آئی تو اب تکذیب وانکار کی اقسام اور صورتوں کو پیش کرتے ہیں جن کی وجہ سے کفر کے انواع واقسام بھی سامنے آجائیں گے اور وہ اصولی باتیں بھی جن کو پڑھ کر آسانی سے یہ معلوم کیا جاسکے گا کہ کون کون سی چیزوں سے انسان کافر ہو کر دنیا وآخرت کو تباہ وبرباد کر دیتا ہے۔ وہ اقسام اور صورتیں یہ ہیں:

۱.... اللہ تعالیٰ یا اس کے رسول ﷺ کو دل سے حق نہ جانتا ہو، نہ مانتا ہو یا دل میں اللہ تعالیٰ کے وجود کے متعلق شک ہے یا رسول اللہ ﷺ کی رسالت میں شک ہے اور زبان سے بھی اس کا انکار کر رہا ہو۔ یہ کفرِ جہل ہے۔

۲.... دل میں رسول اللہ ﷺ کا یقین ہے اور خوب جانتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں یا یہ جو فرماتے ہیں وہ سراسر حق ہے، لیکن محض عناد یا ملک ودولت کی حرص یا کسی دوسری وجہ سے دل سے اپنے اوپر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اتباع کو لازم نہیں کرتا۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی حقانیت کو جانتا ہو لیکن مانتا نہ ہو اور زبان سے بھی آپ ﷺ کی رسالت کا انکار کرتا ہو۔ یہ کفرِ جحود اور عناد ہے، یہی لوگ ہوتے ہیں جو حق کی مخالفت جان بوجھ کر کرتے ہیں اور یہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں پر بالآخر ٹھپہ لگ جاتا ہے اور ان کے ضمیر مردہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

۳.... دل میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو حق نہیں سمجھتا ہے یا حق ہونے کے بارے میں شک اور تذبذب کا شکار ہے، اس لیے وہ دل سے تو رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو قبول نہیں کرتا، لیکن کسی وجہ سے زبان سے توحید ورسالت اور دینِ اسلام کا اقرار کرلیتا ہے اور اس کا عملی ثبوت بھی دے دیتا ہے۔ ایسے کفر کو کفرِ نفاق کہتے ہیں اور اس طرح کرنے والے کو منافق کہا جاتا ہے۔

۴.... رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو دل وزبان سے تسلیم کرنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی کسی ایک ایسی ہدایت اور حکم کو نہیں مانتا جو رسول اللہ ﷺ سے بدیہی اور یقینی طور پر ثابت ہو۔ مثلاً نماز، روزہ، حج اور جہاد وغیرہ جیسے یقینی فرائض ہیں ان میں سے کسی ایک فرض کے ماننے سے انکار کرتا ہے یا مثلاً صرف ختمِ نبوت کے عقیدہ کو نہ مانے یا دوزخ یا جنت کو نہ مانے یا زنا، سود، شراب، چوری، رشوت اور ڈاکہ وغیرہ جیسی یقینی حرام چیزوں میں سے کسی چیز کی حرمت کو نہ مانے۔

غرض جب کسی بھی ایسی ایک ہدایت اور حکم سے انکار کر دے جو رسول اللہ ﷺ سے بدیہی اور یقینی طور پر ثابت ہو۔ اگرچہ اس کے سوا وہ تمام ہدایات اور احکامات کو پوری طرح دل وزبان سے تسلیم کر کے ان پر سختی سے عمل کرتا رہتا ہو تو بھی یہ شخص کافر اور حق کا منکر ہے۔

۵.... رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام تعلیمات اور ہدایات کو تسلیم کرتا ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات وہدایات میں سے کسی یقینی تعلیم اور حکم میں معنوی تحریف کرتا ہے یعنی اس کا مفہوم ایسا بیان کرتا ہے جو قرآن وحدیث کی قطعی اور یقینی تصریحات کے خلاف ہے۔ یہ کفرِ تحریف اور کفرِ الحاد ہے مثلاً کوئی شخص اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مفہوم یوں بیان کرتا ہے کہ اس سے وہ معروف نماز پڑھنا مراد نہیں جو مسلمانوں میں رواج پا گیا ہے، بلکہ اس میں تو ایسی نماز کا حکم دیا گیا ہے جس کا مطلب معاشرہ کو خدا پرستی کی بنیادوں پر قائم کرنا ہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے اقامت صلوۃ کی یہ عملی تشریح خود اپنے اقوال وافعال سے فرمائی ہے، نمازوں کے اوقات اور پنجگانہ نمازوں کی رکعات کو واضح کر دیا ہے اور نماز کے ظاہری اور باطنی آداب بتلائے ہیں اور پھر امت رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانہ سے لے کر آج تک مسلسل متواتر اس فریضہ اور نماز کے اسی معروف طریقہ پر کاربند چلی آرہی ہے۔ غرض جو کوئی بھی رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی ہدایات کو تسلیم کرتا ہے اور قبول کرتا ہے، لیکن وہ ان میں معنوی تحریف کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ بھی کافر ہو جائے گا، البتہ اگر کوئی کسی تعلیم کی قطعی اور یقینی مراد کے اندر رہ کر اس کے مختلف گوشوں کو آشکارا کر دیتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں مثلاً کوئی شخص اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا یہی معروف اور مشہور معنی مراد لیتا ہے اور اس کے متعلق وہ کسی شک وشبہ میں مبتلا نہیں اور اس پر مزید یہ بتلائے کہ ایک شخص جس طرح نماز میں اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا مظاہرہ کرتا ہے اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا مظاہرہ اپنے گھر، بازار، دکان اور دوسرے معاملات میں بھی کرے یا مثلاً یوں کہہ دے کہ نماز وہ بنیادی عبادت ہے جس کی وجہ سے انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت بڑھ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی تمام زندگی خدا پرستی اور عدل وانصاف کی بنیادوں پر استوار ہو جاتی ہے۔

غرض جب کسی تعلیم وہدایت کی یقینی مراد کے اندر رہ کر اس پر مزید تحقیق یا اس کی تشریح کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے کسی یقینی طور پر ثابت شدہ تعلیم اور حکم کی قطعی اور یقینی مراد کے بجائے اس سے کوئی اور مراد لینا تحریف اور کفر ہے۔

۶.... وہ اعمال جو ایمان واسلام سے انکار اور بغاوت پر دال ہوں ان کی وجہ سے بھی انسان اسلام سے خارج ہو کر

کافر ہو جاتا ہے۔

یہ تو معلوم ہو گیا کہ عملی خرابیاں فسق وفجور کتنا ہی زیادہ ہو جائے ان کی وجہ سے کسی کو کافر نہیں کہا جائے گا البتہ اگر عمل ایسا ہو جو ایمان اور اسلام سے انکار پر دلالت کرتا ہو تو ایسے اعمال کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے مثلاً کوئی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نامناسب الفاظ اور گالی بکے یا قرآن مجید کو بطورِ اہانت نجاست میں پھینک دے یا بطورِ اہانت آگ میں ڈال دے یا نماز روزہ وغیرہ یا حدود و تعزیرات وغیرہ دینِ اسلام کے کسی حکم و قانون کا مذاق اڑائے یا بت کو سجدہ کرے، اسی طرح جو عمل بھی ایسا ہو جو ایمان اور اسلام سے بغاوت پر دال ہو تو اس کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ایک نام نہاد مسلمان حکمران جو باوجود طاقت کے اسلامی قانون کے مقابلے میں دوسرے قانون کو اختیار کرتا ہے یا خود ایسا قانون بناتا ہے جو قرآن مجید کے واضح اور یقینی قانون اور حکم کے خلاف ہو تو یہ حکمران بھی پکا کافر ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف دوسروں کے قانون کو ترجیح دے کر خلافِ شریعت قانون کے نفاذ سے مشرک اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اور خود اپنے اوپر سخت ظلم کرنے والا اور اللہ تعالیٰ اور اسلام کا غدار ہے۔

کفر کا حکم لگانے کی شرائط

۱.... عقل ہو۔ بچہ یا مجنون اور دیوانہ نہ ہو، نشہ اور بے ہوشی کی حالت میں نہ ہو۔

۲.... قصد وارادہ سے ہو یعنی غلطی اور سہو سے نہ ہو اور سبقت لسانی سے بھی نہ ہو یعنی اگر کسی کی زبان سے بلا ارادہ غلطی سے کوئی کفریہ کلمہ نکل گیا تو کافر نہ ہو گا مثلاً کوئی یہ کہنا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک اور بے مثل ہے اور اس نے ہر چیز کے دو جوڑے بنائے ہیں لیکن غلطی سے اس کی زبان سے اس کے برعکس الفاظ نکل گئے تو اس غلطی کی وجہ سے کافر نہ ہو گا۔

۳.... الفاظِ کفر بھی ایسے ہوں جن میں صحیح معنی کا احتمال باقی نہ رہے یعنی اگر کوئی ایسا کلمہ اور ایسے الفاظ قصداً کہہ دے جن میں کفر کا احتمال بھی ہے اور اس سے دوسرے معنی بھی لیے جاسکتے ہیں تو ایسے شخص پر بھی اُس وقت تک کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا جب تک کہ اس کے کلام سے خود اس بات کی وضاحت اور ثبوت نہ ملے کہ اس کی مراد اس کلمہ سے وہ معنی ہے جس کی وجہ سے کفر لازم ہو جاتا ہے۔

۴.... اپنے اختیار سے ہوں یعنی جبر واِکراہ کی صورت نہ ہو۔ جبکہ کوئی ظالم کسی کو جان سے مارنے کی دھمکی دے اور اس کو اس پر مجبور کرے کہ وہ کفریہ کلمات کہے یا کوئی کفریہ کام مثلاً بت کو سجدہ کرے تو وہ مجبوراً ایسے کلمات

کہہ دے یا کفریہ کام کرے اور دل سے ایمان واسلام اور اس کی تعلیمات پر مطمئن ہو اور جو کلمہ کفریہ کہہ دیتا ہے یا کفریہ کام کرتا ہے اس کے خلاف اس کے دل میں نفرت ہو تو کافر نہ ہوگا جیسا کہ اس کا بیان ان شاء اللہ جبر واکراہ کے باب میں آئے گا۔

۵.... علم اور واقفیت کا ہونا۔ اگر کوئی نو مسلم ہو اس کو ضروریات اور یقینی احکامِ اسلام سے واقفیت نہ ہو یا کوئی قدیم مسلم ہے لیکن وہ اسلام کا حکم ایسا ہے کہ اس کا درجہ وہ نہیں کہ جس کا علم عام مسلمانوں کو ہوگا تو ایسا شخص بھی ناواقفیت کی وجہ سے کافر نہیں۔ ایسے لوگوں کو سمجھایا جائے گا البتہ اگر قدیم مسلمان ایسے عقائد توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت اور قیامت کا انکار کر دیتا ہے جو تمام مسلمانوں کو معلوم ہیں تو اس کا جہل اور ناواقفیت عذر نہیں بن سکتی۔

نفاق کسے کہتے ہیں؟

نَفَقٌ سرنگ کو کہتے ہیں۔ اور النَّافِقَاءُ جنگلی چوہے کے بل کے متعدد سوراخوں میں سے اس سوراخ کو کہتے ہیں جس کے اوپر وہ مٹی کا باریک سا پردہ بنالیتا ہے تاکہ پتہ نہ چلے کہ یہاں کوئی سوراخ ہے جب اس کا دشمن اس کو اس کی ظاہری آمد و رفت کے سوراخ سے پکڑنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سر مار کر اس دوسرے راستے سے بھاگ جاتا ہے اس لیے اس شخص کو منافق کہا جاتا ہے جو کسی جماعت یا کسی دین وغیرہ میں داخل ہونے سے پہلے اس سے باہر نکلنے کا راستہ بھی بنا کر اس پر مکر و فریب کا پردہ ڈال دیتا ہے پھر جب کوئی آزمائش یا سختی آئے تو ایسی حالت میں وہ اس دین یا جماعت کو چھوڑ دیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ا۟طْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَ اِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۫ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾

”اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی بندگی ایک کنارے پر رہ کر کرتے ہیں پس اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچا تو اس کا دل اس پر مطمئن (اور جما ہوا) ہوتا ہے اور اگر کوئی آزمائش پیش آگئی تو الٹا پھر گیا اس نے دنیا بھی کھودی اور آخرت بھی، یہی کھلا ہوا خسارہ ہے۔“ (الحج:۱۱)

مطلب یہ ہے کہ سچا مؤمن تو وہ ہے جس کے دل و دماغ پر دین پوری طرح چھا گیا ہو اور وہ کسی تحفظ کے بغیر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے حوالے کر دیتا ہے اور دینِ اسلام کو پوری طرح اپنا لیتا ہے۔ بعض لوگ وہ ہیں جو حق و باطل دونوں سے تعلق باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ دین کو صرف ظاہری جذبہ کے ساتھ مانتے

ہیں، ان کی حقیقی دلچسپیاں اپنے دنیاوی مفادات سے وابستہ ہوتی ہیں، ان کی دین سے وابستگی صرف اس وقت تک کے لیے ہوتی ہے جب تک دین کو اختیار کرنے سے انہیں کوئی نقصان نہ ہو رہا ہو اور ان کے مفادات پر کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ یہ لوگ اس وقت تک اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے احکامات سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں جب تک وہ ان کے مفادات اور منشاء کے مطابق ہوں، لیکن جب کوئی آزمائش پیش آتی ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ دین اور ان کے دنیاوی مفادات دونوں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تو ایسی صورت میں وہ دین اور دین کے احکامات سے بھاگ جانے کا راستہ تلاش کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو منافق کہا جاتا ہے اور منافق کی دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جاتے ہیں، وہ نہ تو دنیا کی حقیقی کامیابی اور عزت کو پاسکتے ہیں اور نہ آخرت کی کامیابی ان کے ہاتھ آسکتی ہے، ان کی دنیا کی زندگی بھی بے چین اور بے اطمینان ہوتی ہے اور آخرت میں بھی دائمی طور پر سخت عذاب سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

بہر حال عربی زبان میں نفاق کا شمار مکر و فریب کے جنس میں ہوتا ہے یعنی ظاہر میں خیر کا اظہار اور باطن میں اس کے خلاف جذبات رکھنا۔

نفاق کی تعریف اور اس کا خلاصہ

نفاق کے اصل معنی ہیں ظاہر کا باطن سے مخالف ہونا یعنی ظاہر میں خیر و صلاح کا اظہار ہو اور باطن میں اس کے برعکس جذبات ہوں۔

اس کی تین قسمیں ہیں:

۱.... اس کی ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد بظاہر خوب روزوں، نمازوں، نوافل اور پارسائی کا اظہار ہو مگر وہ اپنے ان نیک اعمال و کردار میں ریاکاری کرتا ہو۔ اس کا نام نفاق فی العمل ہے یعنی عقیدہ میں نفاق نہیں، مگر عمل میں نفاق اور ریاکاری ہو اس کا مشہور اور معروف نام ریاکاری ہے۔

۲.... اعتقادی نفاق یعنی عقیدہ کی رو سے نفاق ہو یہی وہ حقیقی نفاق ہے جسے اصطلاح میں حقیقی نفاق کہتے ہیں کہ انسان زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور اس کا ظاہری عمل بھی اسلام کے مطابق ہو مگر دل سے اسلام کا انکار کرے اسلام کے بارے میں شک و تذبذب کا شکار ہو یعنی اس نے دل سے اسلام قبول نہ کیا ہو، لیکن کسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو مؤمن اور مسلم ظاہر کرتا ہو۔ ایسا شخص بدترین کافر ہوتا ہے ایسا شخص جہنم کے سب سے نچلے، سب سے زیادہ ہیبت ناک اور سب سے زیادہ المناک درجے میں ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ الْمُنَافِقِينَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ

"بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے (ڈالے جائیں گے)۔" (نساء۱۴۵)

۳.... عقیدہ صحیح ہو، دل سے اسلام کو قبول کر چکا ہو مگر اس کا کردار اسلام کے مطابق نہ ہو، اس کو خاص اصطلاح میں عملی نفاق کہا جاتا ہے یعنی کردار کی رو سے نفاق کا شکار ہوتا ہے، مثلاً جھوٹا طرزِ عمل اپناتا ہو۔ جو شخص ایسے طرزِ عمل کو اختیار کرتا ہے اس کو عملی منافق کہا جاتا ہے۔ یہ اگرچہ کفر نہیں مگر فسق ہے۔ ایسے شخص کو کافر نہیں، بلکہ فاسق کہا جاتا ہے۔ ایسا شخص قابل گرفت ہے، بلکہ بد اعمالیوں کی وجہ سے اس کے برے خاتمہ کا خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں دنیا سے کافر اور بے ایمان نہ چلا جائے۔

منافق کی نشانیاں

اب یہاں منافق کی چند نشانیوں کا ذکر کرتے ہیں جس سے منافقِ اعتقادی اور منافقِ عملی کے خدوخال سامنے آئیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اٰیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلٰثٌ اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ

"منافق کی نشانیاں تین ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔" (بخاری و مسلم)

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"علماء نے لکھا ہے کہ یہ حدیث "جوامع الکلِم" میں سے ہے۔ اعمال انسانی کے تین درجے قول و فعل و نیت اگر درست ہو جائیں تو پھر اب کیا باقی رہا، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان: اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ سے قول کے فساد پر دلالت ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ سے فسادِ فعل پر تنبیہ ہوتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ سے فسادِ نیت کی نشاندہی ہوتی ہے اس لیے وعدہ خلافی کی مذمت اس وقت نہیں کی جاسکتی جب تک کہ وعدہ کے ساتھ وعدہ خلافی کا عزم بھی نہ کیا گیا ہو"۔ (فضل الباری: ۱/ ۴۴۳)

حضرت مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"الغرض ایک نفاق تو ایمان اور عقیدے کا ہے جو کفر کی بدترین قسم ہے، لیکن اس کے علاوہ کسی شخص کی سیرت کا منافقوں والی سیرت ہونا بھی ایک قسم کا نفاق ہے مگر وہ عقیدہ کا نہیں، بلکہ سیرت اور کردار کا نفاق ہے اور ایک مسلمان کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ کفر و شرک اور اعتقادی نفاق کی نجاست سے بچے اسی طرح

یہ بھی ضروری ہے کہ منافقانہ سیرت اور منافقانہ اعمال واخلاق کی گندگی سے بھی اپنے کو محفوظ رکھے“۔

(معارف الحدیث:۱/۱۵۸-۱۵۷)

اعتقادی اور پکے منافق کی تفصیل

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ اعتقادی نفاق یہ ہے کہ ایمان واسلام کو صرف ظاہری طور پر دنیاوی مفادات کی حد تک قبول کیا جائے تو اب یہاں اس کی تفصیل بھی پڑھ لیجیے:

سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منافقوں کا حال یہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر توحید ورسالت اور قیامت کی شہادت بھی دیتے تھے، نماز، روزہ وغیرہ جیسے اسلامی فرائض بھی ادا کرتے تھے، لیکن اندر سے یا تو اسلام کے مخالف ہوتے یا دینِ اسلام اور رسالت کے بارے میں شک وتذبذب میں مبتلا تھے اور اسلام کو دنیاوی مفادات کی حد تک قبول کیے ہوئے تھے، دینِ اسلام کے لیے کسی قربانی کے لیے تیار نہ تھے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر منافقوں کے اس قلبی کفر اور ان کی شرارتوں کو بیان فرمایا ہے:

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۚ﴿۱﴾ اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾

”(اے پیغمبر!) جب یہ آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو اور اللہ تعالیٰ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین (اپنے اس دعویٰ میں) جھوٹے ہیں انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے پس وہ (اس طرزِ عمل سے خود اپنے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی) اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں بے شک نہایت ہی برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔“ (منافقون:۲-۱)

یہاں منافقین کی گواہی واقرار کو جھوٹا قرار دیا گیا اور بتایا گیا کہ منافقین قسمیں کھا کھا کر (نبی کریم ﷺ کو) اپنے مؤمن ومسلم ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کی شہادت کی محتاج نہیں اور اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ یہ گواہی بھی دیتا ہے کہ منافقین اپنی اس شہادت میں جھوٹے ہیں انہوں نے تمہاری گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے تاکہ ان کی آڑ میں وہ طرح طرح کے فوائد اور دنیاوی مفادات حاصل کریں اور ان کا یہی طرزِ عمل ایسا ہے جس کی وجہ سے وہ خود بھی اسلام کی نعمت سے محروم رہتے ہیں اور دوسرے لوگوں کے لیے بھی اس نعمتِ عُظمیٰ سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے بعد اعتقادی (پکے منافق) کو کیسے معلوم کیا جائے؟

جو شخص بظاہر ایمان واسلام کا دعویدار ہو اور اندر سے اسلام کا مخالف ومنکر ہو یا اس کے بارے میں شک وتذبذب کا شکار ہو اس کا اس دلی راز فاش کرنے کے دو طریقے ہوسکتے ہیں۔ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے رسول ﷺ کو وحی کے ذریعے بتلائیں کہ فلاں شخص ایمان اور اسلام کا جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس کے قول وفعل سے اسلام یا اسلام کے کسی عقیدے کی کوئی مخالفت وبغاوت ثابت ہو جائے۔رسول اللہ ﷺ کے بعد وحی کا سلسلہ قیامت تک منقطع ہو چکا ہے۔نبوت اور رسالت کی تکمیل کی وجہ سے اب قیامت تک کوئی نبی مبعوث نہیں کیا جائے گا اس لیے کسی شخص کے دل میں چھپے ہوئے کفر ونفاق کے معلوم ہونے کا ہمارے پاس کوئی یقینی ذریعہ موجود نہیں، البتہ کسی منافق کے نفاق کو معلوم کرنے کی دوسری صورت اب بھی موجود ہے وہ یہ کہ ایمان واسلام کا مدعی ہونے کے باوجود اس کے قول وفعل سے اسلام یا اسلام کے یقینی عقائد کی مخالفت یا ان کی تحریف یا ان پر استہزاء ثابت ہو جائے یہی وہ منافق ہے جن کو ملحد اور زندیق کے ناموں سے پکارا جاتا ہے اور یہ وہ نفاق ہے جس کو نفاق کے بجائے کفر وارتداد کہا جاتا ہے۔

چنانچہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

إنما كان النفاق على عهد النبی ﷺ فأما اليوم فإنّما هو الكُفرُ بَعْدَ الإيمان

”یعنی نفاق کا حکم نبی کریم ﷺ کے زمانے میں تھا اور اب وہ ایمان کے بعد کفر ہی ہے۔“(صحیح بخاری کتاب الفتن)

اور ایک روایت میں هو الكُفرُ بَعْدَ الايمان کے بجائے هو الكُفرُ أوِ الايمان بھی آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ”نفاق کا حکم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تھا اب تو کفر ہو گا یا ایمان۔“

حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو منافق تھا آج وہ زندیق ہے۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ دونوں کے قول کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں جس کی وجہ سے کسی پر یقینی طور پر نفاق کا حکم لگایا جائے اِلا یہ کہ اس سے کوئی ایسا قول وفعل سرزد ہو جائے جو اس کے باطنی کفر کی غمازی کرے مثلاً دعویٰ اسلام کے ساتھ کوئی کفریہ عقیدہ رکھنا یا کوئی دینِ اسلام کے اصول اور یقینی طور پر ثابت شدہ احکامات میں باطل تاویل کر کے اس کے اجماعی مفہوم میں تحریف کرے یا کوئی حکمران باوجود طاقت اور قدرت کے اسلام کے خلاف قوانین کو نافذ کرے تو ایسی صورت میں اس کا نفاق اور چھپا ہوا کفر کھل کر سامنے آئے گا اور جیسا کہ منافق دعویٰ اسلام کے باوجود کافر ہوتا

ہے، اسی طرح یہ شخص بھی مدعی اسلام ہونے کے باوجود کافر ہے جس کو اصطلاح میں ملحد اور زندیق کہا جاتا ہے اور اس پر کفر کے احکام نافذ کیے جائیں گے۔

بد عملی کی وجہ سے کسی پر منافق کا گمان نہ کرنا چاہیے

لیکن یاد رہے کہ جو شخص دینِ اسلام کو اپنائے اور وہ اس پر قائم رہے تو ایسے شخص کو مسلمان کہا جائے گا، کیونکہ دلوں کا علم اللہ تعالیٰ کو ہی ہو سکتا ہے، یہ درست نہیں ہے کہ ہم کسی آدمی کو اس کی کسی بد عملی کی وجہ سے معمولی ایمان والا سمجھیں یا اس پر بد گمانی کر کے اس کو منافق سمجھیں۔ شاید اس کے دل میں کسی خوبی کی وجہ سے ایمان کی ایسی چنگاری ہو جو کسی وقت بھڑک کر اس کے دل کے خاروزار کو ایک لمحہ میں خاکستر کر دے اور اس کے دل و نفس کو ایسا پاک و صاف کر دے کہ کل قیامت میں بڑے بڑے مؤمن بھی اس پر رشک کریں۔ لہٰذا جو شخص اسلام کو قبول کر لے اور وہ اس پر قائم رہے تو اس کی کسی ایسی بد عملی جو کفر کی واضح علامت نہ ہو پر بد گمان ہو کر اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَهَا فَقَدْ عَصَمَ مِنِّی مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَحِسَابُهٗ عَلَی اللّٰهِ

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ "لا الہ الا اللہ" کے قائل نہ ہو جائیں پس جو شخص اس کلمہ کا قائل ہو گیا اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا مگر اسلام کے حق سے (کہ وہ اب بھی باقی رہے گا) اور اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

جس طرح پہلے صفحات میں قرآن و حدیث کی رو سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ دل سے اسلام و ایمان کو قبول کرنے اور اس پر مرنے کا نتیجہ آخر کار جنت ہی ہے، اسی طرح اس حدیث میں اور اس طرح دوسری حدیثوں میں اسلام اور ایمان کے قبول کرنے کا ایک دنیوی اور قانونی نتیجہ یہ بتلایا گیا ہے کہ ایسا شخص مسلمان ہی سمجھا جائے گا، اس کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ کیا جائے گا، اس کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، البتہ اسلامی قانون اور ضابطہ کے تحت اس سے باز پرس ہو گی اگر اس نے کوئی جرم ایسا کیا کہ خود اسلامی قانون کا تقاضا اس کو جانی یا مالی سزا دینے کا ہو مثلاً ناحق قتل کیا تو اسلامی قانون کے مطابق اس کو سزا دی جائے گی اور آخر میں "وَحِسَابُهٗ عَلَی اللّٰهِ" فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کلمہ پڑھ کر اپنے کو مسلمان ہونا ظاہر کر دے تو اس کے خلاف جنگ بند کر دیں گے اور اس کے ساتھ اسلام اور ایمان ہی کا معاملہ کریں گے اور اس کی باطنی حالت کو اللہ کے سپرد کر دیں

گے، اگر اس کی نیت میں کوئی کھوٹ ہو اور اس نے اسلام کسی مال و جان کی حفاظت یا کسی اور مفاد کی خاطر قبول کیا ہو تو اس کا حساب آخرت میں اللہ تعالیٰ پر ہے وہ آخرت میں اس کو اس کفر و نفاق کی یقیناً سزا دے گا۔

جو کوئی لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرلے اس کو قتل نہیں کیا جائے گا اس کا مطلب کیا ہے؟

پہلے بھی یہ لکھا جا چکا ہے کہ لا الٰہ الا اللہ سے مراد ایمان و اسلام کی دعوت کو قبول کر لینا ہے۔ اس حقیقت کو مختلف عنوانات سے تعبیر کیا جاتا ہے کہیں اجمالی ہے اور کہیں کسی قدر تفصیل مثلاً حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں توحید و رسالت کی شہادت کے ساتھ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا ذکر بھی آیا ہے اور آخر میں ارشاد فرمایا:

فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَآئَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

"پس جب وہ یہ سب کچھ کرنے لگیں تو انہوں نے اپنی جان و مال کو محفوظ کر لیا مگر اسلام کے حق سے اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔" (صحیح مسلم، صحیح بخاری)

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں شہادتِ توحید کے ساتھ نماز پڑھنے، نماز میں قبلۂ اسلام کی طرف رخ کرنے اور اہلِ اسلام کا ذبیحہ کھانے کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں ایسے شخص کو مسلمان قرار دے کر اس کے خون اور مال کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اس طرح کم و بیش الفاظ ہیں کہیں اجمال اور کہیں تفصیل کے ساتھ جو کچھ ارشاد فرمایا گیا ہے اس کا مطلب اور مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ ہماری جنگ جس کسی سے بھی ہے صرف دین کی خاطر ہے اور لوگوں کو کفر و شرک، طاغوت اور ظلم سے نکال کر راہِ حق عدل و قسط پر لانے کے لیے ہے۔

پس جو لوگ کفر و ظلم کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ اختیار کریں اور دینِ اسلام کو قبول کر لیں ان کی جان و مال سے تعرض کرنا ہمارے لیے حرام ہے، ان کے ساتھ مسلمانوں و مؤمنوں کا ہی معاملہ کیا جائے گا اور چونکہ اس زمانہ اور ماحول میں ایمان و اسلام کے لیے عموماً مذکورہ عنوانات استعمال کیے جاتے تھے اور ایمان و اسلام کی ظاہری علامات بھی یہی تھیں کہ آدمی مسلمانوں کے طریقے پر نماز پڑھنے لگے، نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھائے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علامات کے طور پر ان چیزوں کا بھی ذکر کر دیا اور بتلا دیا کہ جس شخص میں اسلام قبول کرنے کے بعد ظاہری اور موٹی موٹی علامتیں پائی جائیں کہ وہ مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتا ہو اور نماز پڑھنے میں مسلمانوں کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہو اور مسلمانوں کے ذبح شدہ جانور کے

گوشت کو کھاتا ہو تو اس کو مسلمان ہی سمجھو، اس کے متعلق خواہ مخواہ اس قسم کی بدگمانی نہ کرنا کہ اس کے دل میں اسلام نہیں ہے، بلکہ اس نے صرف منافقانہ طور پر اسلام کے احکامات کو اختیار کرلیا ہے، البتہ اگر کوئی اسلام اختیار کرلینے کے بعد ایسا فعل کرے جو اس کی تصدیق فوت ہونے اور ایمان واسلام سے بغاوت کرنے پر دلالت کرے مثلاً کسی مدّعیٔ اسلام کے بارے میں یہ ثابت ہوجائے کہ نماز میں کعبہ کے بجائے یہود ونصاریٰ کے قبلہ کی طرف رخ کرتا ہے یا بت کو سجدہ کرتا ہے یا اسلام کے کسی عقیدے کا انکار کرتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی بکتا ہے یا اسلامی شعائر واحکامات کا مذاق اڑاتا ہے یا قدرت کے باوجود دینِ اسلام کے خلاف جاہلی قوانین نافذ کرتا ہے یا نماز، زکوٰۃ، روزہ ختمِ نبوت وغیرہ جیسے یقینی امور میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے یا ان میں تحریف کرتا ہے جیسا کہ اس کا بیان پہلے گذر چکا ہے تو ایسا شخص یقینی کافر ہے، ایسی صورت میں مسلمان اس کو مسلمان نہیں سمجھیں گے۔

نماز میں بیت اللہ کی طرف رخ کرنے والا ہر ایک شخص اہل قبلہ میں سے نہیں

جو لوگ اس طرح کی حدیثوں سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو شخص نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرتا ہو اور مسلمانوں کا ذبیحہ کھاتا ہو پھر خواہ وہ کیسے ہی خلافِ اسلام عقائد رکھے اور خواہ کیسے ہی کافرانہ ومشرکانہ اعمال کرے بہر حال وہ مسلمان ہی سمجھا جائے گا تو ایسے لوگ سخت جاہل اور گمراہ ہیں، بلکہ اگر باوجود سمجھنے کے ایسی گمراہی کی بات کرتے ہیں تو پھر یہ ایسے منافق ہیں جو چاہتے ہیں کہ دشمن اسلام مارِ آستین بن کر مسلمانوں میں پھلتا پھولتا رہے اور مسلمانوں کی جانوں اور ایمانوں پر حملے کرکے ان کو بے ایمان اور دشمنانِ اسلام کا غلام بنالے۔

قرآن وحدیث کی رو سے مؤمن کون ہے؟

قرآن وحدیث میں مؤمن اور مسلم جس کو کہا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اللہ تعالیٰ کا رسول مانے اور ان پر اتری ہوئی یقینی طور پر ثابت شدہ تمام تعلیمات وہدایات کو حق اور سچ مان کر ٹھنڈے دل سے قبول کرلے جیسا کہ اس کا بیان پہلے مفصل گزر چکا ہے، لیکن چونکہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور آج کل اس میں بہت اِفراط تفریط سے کام لیا جاتا ہے، کہیں تو بہت معمولی معمولی مسئلوں کو کھینچ تان کرکے اصول اور اہم بنادیا جاتا اور پھر اس کو بنیادی مسئلہ بناکر ایک دوسرے پر کفر اور شرک کے فتوے دیے جاتے ہیں اور کہیں اس قدر وسیع النظر اور جدت پسند بن جاتے ہیں کہ اسلام کے بنیادی امور سے انکار کرنے والوں کو بھی پکا اور سچا مؤمن قرار دیا جاتا ہے، اسی ضرورت کے پیشِ نظر اس مسئلہ کو یہاں بھی کسی قدر تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ

"رسول اس (ہدایت اور تعلیم) پر ایمان رکھتے ہیں جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل کی گئی ہے اور جو لوگ (دعوتِ حق پر) ایمان لائے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں۔" (البقرہ:۲۸۵)

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

"اے نبی آپ فرما دیجیے کہ ہم ایمان لائے اللہ تعالیٰ پر اور اس (تعلیم) پر جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب (میں سے جو نبی گزرے ہیں ان) پر نازل کیا گیا اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دیا گیا ہے اس سب پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں اور ہم ان پیغمبروں میں سے کسی ایک کو بھی دوسروں سے جدا نہیں کرتے (کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو اختیار کرنا چاہے تو وہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ تباہ کاروں میں سے ہوگا۔" (آل عمران:۸۵-۸۴)

اس طرح کم وبیش الفاظ کے ساتھ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ایمان کی یہی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ اس کے رسول پر اتر چکا ہے ان تمام تر ہدایات کو سچ اور حق مان کر ٹھنڈے دل سے قبول کیا جائے، حدیثوں میں بھی ایمان کی حقیقت یہی بیان کی گئی ہے۔

چنانچہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا اَلَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَيُؤْمِنُوْا بِيْ وَبِمَا جِئْتُ بِهٖ فَاِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَائَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے جنگ جاری رکھوں جب تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی شہادت نہ دیں اور جب وہ ایسا کر لیں تو انہوں نے اپنے مال اور اپنی جان کو محفوظ کر لیا مگر اسلام کے حق کے ساتھ (کہ وہ اب بھی باقی رہے گا) اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اس حدیث شریف میں ایمان کی حقیقت کو قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں توحید کی شہادت کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تمام تعلیمات و ہدایات پر

ایمان لانے کا ذکر بھی آیا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث میں بہت سی جگہ کتاب اللہ پر یا اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی تعلیم وہدایت پر یا رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی تعلیمات پر جو ایمان لانے کا ذکر ہے اور اس کے خلاف انکار کرنے والوں کو کافر کہا گیا ہے اس کا مطلب اور مقصد یہ ہے کہ ان تمام صداقتوں اور حکموں کو دل وجان سے قبول کر لیا جائے جو اللہ کا رسول لے کر آیا ہے اور قرآن مجید پر ایمان کے معنی بھی یہی ہیں کہ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی حق اور سچی کتاب مانا جائے اور قرآن مجید میں جو کچھ علمی، عملی، عقائد اور عبادات واحکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم وکاست ٹھنڈے دل سے قبول کر لیا جائے۔

اگر رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی تعلیمات کو نہ مانا جائے تو آخر ایمان بالرسول کا کیا مطلب ہوا؟

یہ آیاتِ کریمہ اور احادیثِ شریفہ جو بطورِ نمونہ پیش کی گئیں صرف اس لیے کہ کمزور ترین سمجھ والے بھی اس مسئلہ کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکیں، ورنہ اس بات کو تو ادنی سمجھ والا شخص بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس کا نام فلاں ہے، فلاں کے بیٹے ہیں، فلاں جگہ پیدا ہوئے ہیں اور اتنی عمر دنیا میں رہ کر دنیا سے تشریف لے گئے اور فلاں جگہ ان کی آخری آرام گاہ بنی، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہے اور وہ جو کچھ ہدایات واحکامات دے دیتے ہیں سب کی سب اللہ تعالیٰ کی ہدایات اور احکامات ہیں اور سب کے سب صحیح اور بالکل حق ہیں جن میں کسی شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور ان میں انسانیت کا نفع وخیر ہے اور ان کے خلاف سراسر نقصان ہے، اس لیے اس کے ہر حکم کو ماننا اور قبول کرنا ہی رسول کو اللہ تعالیٰ کا رسول ماننا ہے اور اس کے کسی حکم میں شک وشبہ کرنا اور اس سے انکار کرنا در حقیقت رسول کی رسالت کا انکار ہے۔

جب تک رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی تمام تعلیمات کو ٹھنڈے دل سے قبول نہ کیا جائے اس وقت تک کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا

لہٰذا کوئی شخص اس وقت تک مسلمان ہی نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بارے میں یہ فیصلہ نہ کرے کہ میں رسول اللہ ﷺ پر اتری ہوئی تمام تعلیمات کو حق مانتا ہوں اور جو کچھ آپ ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہو اور ان سے ٹکراتا ہو اس کو غلط سمجھتا ہوں، رسول اللہ ﷺ کی بتلائی ہوئی تمام ہدایات پر چلتا ہوں، لہٰذا جو شخص تمام احکامات کو یا دینِ اسلام کے کسی یقینی حکم کو ناحق اور ظلم سمجھتا ہو تو وہ شخص مسلمان نہیں، بلکہ پکا کافر ہے اگرچہ وہ بظاہر اسلام کا دعویدار ہو۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ مختلف انداز میں ایسے کافروں کی نشاندہی کی گئی ہے مثلاً کہیں

ارشاد فرمایا:

وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ

"اور ہماری آیتوں کا انکار صرف کفار ہی کرتے ہیں۔" (عنکبوت:۴۷)

اور کہیں اہل کتاب کے کفر کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ

"کیا تم بعض کتاب (اللہ تعالیٰ کی کچھ ہدایات) کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو۔" (بقرہ:۸۵)

اور کہیں ایسے لوگوں کی مذمت اس انداز میں کی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾

"بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں یہی لوگ یقیناً کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(نساء:۱۵۰-۱۵۱)

اور کہیں منافقین کی منافقانہ روش اور منافقوں کے کفر و نفاق کی نشاندہی کر کے پھر ارشاد فرمایا:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾

"(اے نبی) تمہارے رب کی قسم یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک تمام اختلافات میں آپ کو حاکم نہ بنائیں اور پھر جو فیصلہ آپ کریں اس کے خلاف اپنے دلوں میں کوئی تنگی (اور خلش) بھی محسوس نہ کریں اور اس (فیصلہ کو) پوری طرح تسلیم کریں۔ (نساء:۶۵)

یہاں اس بے ہودہ خیال کی تردید کی گئی ہے کہ کوئی صرف زبانی طور پر رسالت کا اقرار کرنے کے بعد اپنے آپ کو مؤمن اور مسلم قرار دے اور بتایا کہ اس وقت تک کوئی مؤمن اور مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے۔

اس حقیقت کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ

”تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش نفس اسی ہدایت و تعلیم کے تابع نہ بن جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔“

بلاشبہ جو کوئی دینِ اسلام کے احکامات یا کسی ایک حکم پر بھی راضی نہ ہو گا وہ ہر گز مؤمن نہیں ہو سکتا اور جو کوئی دینِ اسلام کے کسی ایک بھی یقینی حکم (جو کہ ضروریات دین میں سے ہو) سے انکار کرے گا تو وہ پکا کافر ہے اگرچہ وہ دین کے دوسرے تمام احکامات کو مانتا ہو، ان پر عمل بھی کرتا رہتا ہو اور مسلمانوں کی طرح نماز پڑھ کر بیت اللہ کی طرف اپنا رخ بھی کرتا ہو۔ اس پر پوری امت کا اجماع ہے۔

اصطلاح میں اہلِ قبلہ سے مراد کون سے لوگ ہیں

پوری امت نے اہلِ قبلہ بھی ان لوگوں کو قرار دیا ہے جو ضروریاتِ دین میں کسی چیز کے منکر نہ ہوں۔ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کرنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو کوئی ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک بھی چیز کا انکار یا اس میں تحریف نہ کرے تو ایسے شخص کی کبھی گناہ کی وجہ سے یا بلا کسی شہادت اور دلیل کے اس پر بدگمانی کر کے تکفیر نہیں کی جائے گی، اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ بس جو کوئی نماز میں کعبہ کی طرف منہ کرلے تو اس کو اہلِ قبلہ قرار دے کر اس کی تکفیر نہ کی جائے خواہ وہ کیسے ہی کفریہ عقائد رکھتا ہو یا اسلام کے یقینی احکامات اور عقائد کا انکار کرتا ہو یا ان میں تحریف کرتا رہتا ہو یا دینِ اسلام کے احکامات کا استہزاء اور توہین کرتا ہو ایسا شخص تو بالاتفاق کافر ہے، آخر منافق لوگ بھی تو قبلہ کی طرف منہ کرتے تھے اور سب مسلمانوں کی طرح نماز پڑھتے تھے، لیکن قرآن مجید ہی نے ان لوگوں کو کافر، بلکہ شدید ترین کافر قرار دیا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب عرب کے بعض لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو ان لوگوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت نے کافر اور مرتد قرار دے کر ان کے خلاف جنگ کی۔

اب دعویٰ اسلام کے باوجود اسلام سے انکار کی صورتوں کو پڑھ لیجیے:

دعویٰ اسلام کے باوجود دینِ اسلام سے انکار کی صورتیں

دینِ اسلام کے احکامات سے انکار کرنے کی پانچ صورتیں ہیں: ایک یہ کہ دینِ اسلام کے کسی یقینی حکم کا انکار کیا جائے مثلاً کوئی یہ کہے کہ میں تمام احکامات اور عقائدِ اسلام کو دل و جان سے قبول کرتا ہوں لیکن سود کی حرمت

کو نہیں مانتا یا یوں کہہ دے کہ میں ختمِ نبوت کے عقیدہ کو نہیں مانتا۔

انکار کی دوسری صورت

انکار اور تکذیب کی دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی دینِ اسلام میں یقین سے ثابت شدہ چیز کے متعلق یہ کہہ دے کہ فلاں قرآنی آیت یا حکم دینِ اسلام میں ثابت نہیں مثلاً ایک شخص قرآن مجید ماننے کا دعویٰ کرتا ہے مگر کسی شبہ کی آڑ لے کر کسی ایک بھی آیتِ کریمہ کا انکار کر دیتا ہے تو ایسا شخص دراصل پورے قرآن مجید کا انکار کرتا ہے کیوں کہ جس تواتر کے ساتھ باقی قرآن مجید ہم تک پہنچا ہے اسی تواتر سے تو یہ آیت بھی پہنچی ہے اس لیے ایک آیت کا انکار قرآن مجید کے تواتر کا انکار ہے، اسی طرح ایک یقینی اور تواتر سے ثابت شدہ حکم کا انکار پورے دینِ اسلام کا انکار تصور کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن مجید کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

انکار کی تیسری صورت

انکار کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی دینِ اسلام کا زبان سے صاف انکار تو نہیں کرتا، مگر اپنے عمل سے دینِ اسلام کا انکار کرتا ہے جیسا کہ اسلامی عقائد اور احکامات یا اللہ تعالیٰ کے نام لگی ہوئی چیزیں مثلاً قرآن مجید یا بیت اللہ وغیرہ کا مذاق اڑاتا ہے یا ان چیزوں کی توہین کرتا ہے یا کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو ایمان و تصدیق کے فوت ہونے پر دلالت کرتا ہو مثلاً بت کو سجدہ کرنا وغیرہ یا قدرت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے احکامات یعنی قرآن مجید کے خلاف قوانین کو نافذ کرنا یا برقرار رکھنا۔ انکار کی تیسری قسم بھی بالکل ظاہر ہے کیونکہ انکار کا مطلب یہ تو نہیں کہ کوئی یہ نہ مانتا ہو کہ دینِ اسلام دنیا میں ہے ہی نہیں، یا کوئی یہ نہ مانتا ہو کہ فلاں حکم قرآن اور دینِ اسلام میں نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو حق اور سچ نہیں سمجھتا اس وجہ سے تو وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے حکم پر تنقید کر کے نہیں مانتا یا اس کو حق جانتا ہے لیکن ضد و عناد یا کسی فائدے کی خاطر اس کے ماننے سے بچتا رہتا ہے، جب انکار کا مطلب معلوم ہوا تو جو کوئی اسلام کا مذاق اڑاتا ہے یا شعائر اللہ کی توہین اور بے ادبی کرتا ہے حقیقت میں یہ شخص صرف دینِ اسلام یا اس کے کسی حکم کا انکار ہی نہیں کرتا ہے، بلکہ اپنے عمل سے دوسرے لوگوں کو بھی یہ بتلانا چاہتا ہے کہ (العیاذ باللہ) دینِ اسلام یا دینِ اسلام کا فلاں حکم حق اور سچ نہیں، قرآن مجید نے اسی حقیقت کو بار بار مختلف انداز میں بیان فرمایا ہے مثلاً کہیں یوں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰيٰتِنَا شَيْـًٔا اتَّخَذَهَا هُزُوًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۭ

"اور جب ہماری آیتوں میں سے کسی ایک آیت کو جان لے تو اس کا مذاق اُڑاتا ہے ایسے لوگوں کے لیے

رسوا کن عذاب ہے۔" (جاثیہ:۹)

اور سورۂ یٰسین میں ارشاد فرمایا:

یٰحَسۡرَۃً عَلَی الۡعِبَادِ ۚ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ

"کیا ہی افسوس ہے (ان) بندوں کے حال پر کہ کبھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا مگر وہ اس کا مذاق اُڑانے لگ گئے۔" (یٰس:۳۰)

بہر حال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ مذاق اڑانا اور توہین کرنا انکار کی اعلیٰ قسم ہے اور جو کوئی مذاق اڑاتا ہے وہ اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ اس کو قبول کرنا تو کیا اس کے ماننے اور قبول کرنے کے لیے سوچ سمجھ کے دروازے بھی بند کر دیتا ہے۔

اسی طرح جس شخص نے یہ سمجھا کہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے کسی اور کا طریقۂ زندگی زیادہ مکمل اور جامع ہے یا یہ عقیدہ رکھا کہ نبی کریم ﷺ کے طریقۂ حکمرانی سے بہتر اور کوئی طریقۂ حکمرانی ہے تو وہ کافر ہے مثلاً وہ لوگ جو طاغوتی نظامِ حکومت کو رسول اللہ ﷺ کے پیش کردہ طریقۂ حکمرانی پر ترجیح دیتے ہیں چنانچہ قرآن حکیم میں اس سلسلے میں واضح احکامات موجود ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ

"اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت سے فیصلہ نہ کیا تو وہی لوگ ہیں کافر۔" (مائدہ:۴۴)

نیز ارشادِ ربانی ہے:

اَفَحُکۡمَ الۡجَاہِلِیَّۃِ یَبۡغُوۡنَ ؕ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکۡمًا لِّقَوۡمٍ یُّوۡقِنُوۡنَ

"کیا یہ لوگ جاہلیت کو حاکم بنانا چاہتے ہیں حالانکہ مؤمن قوم کے لیے اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کس کا حکم اچھا ہو سکتا ہے۔" (مائدہ:۵۰)

اسی طرح جس نے نبی کریم ﷺ کی لائی ہوئی شریعت کی کسی بھی چیز کو ناپسند کیا خواہ اس پر وہ عمل ہی کیوں نہ کرتا ہو وہ شخص کافر ہو گیا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَرِہُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاَحۡبَطَ اَعۡمَالَہُمۡ

"کیونکہ انہوں اس چیز کو ناپسند کیا جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیتے۔" (محمد:۹)

چنانچہ وہ شخص بھی کافر ہے جس نے یہ سمجھا کہ انسان کا خود ساختہ نظام اور قوانین شریعتِ اسلامیہ سے بہتر ہیں یا یہ عقیدہ رکھا کہ اسلامی شریعت اس بیسویں صدی کے لیے موزوں نہیں ہے، یا اس کو مسلمانوں کی پستی کا سبب سمجھا، یا وہ اس کو بندہ اور خدا کے درمیان شخصی تعلق تک محدود تصور کرتا ہے اور اس کے علاوہ دنیا کے دوسرے معاملات میں شریعت کے عمل دخل کا روادار نہیں۔

نیز اسی طرح وہ شخص بھی کافر ہے جس نے یہ سمجھا کہ چور کا ہاتھ کاٹنا اور شادی شدہ زانی یا زانیہ کو سنگسار کرنا جو کہ خدائی قانون ہے عصر حاضر کے لیے مناسب نہیں، اسی طرح وہ بھی جس نے یہ سمجھا کہ معاملات اور تعزیرات میں اللہ تعالیٰ کی شریعت کے علاوہ کسی اور نظام یا قانون کے ذریعہ فیصلہ کرنا جائز ہے اگرچہ وہ یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو کہ وہ نظام قانون شریعت سے بہتر ہے اس لیے کہ اس طرح وہ شخص عملاً اسی چیز کو جائز ٹھہرا لیتا ہے جس کی حرمت مسلّماتِ دین میں سے ہے مثلاً زنا، شراب نوشی، سود خوری اور شریعتِ اسلامیہ کے علاوہ کسی اور نظام کے ذریعے حکومت کرنا۔

انکار کی چوتھی صورت

انکار کی چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی قرآن مجید کی تمام آیتوں، دینِ اسلام کے تمام عقائد اور عام احکامات پر ایمان لانے کا اظہار تو کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم وہ ایسا بیان کرتا ہے جو قرآن مجید اور حدیث میں یقینی تصریحات کے خلاف ہو۔ یہ شخص بھی دراصل دینِ اسلام یا دینِ اسلام کے کسی یقینی حکم اور اصول کا منکر ہوتا ہے بظاہر تو اس حکم کا اعتراف کرتا ہے مگر اس حکم کے یقین سے ثابت شدہ معنی اور مفہوم کو بدل کر اس کو اپنے من مانے معنی پہنا دیتا ہے اور اپنے انکار کو تاویل یا تحقیق یا تفسیر وغیرہ کے کسی پردہ میں چھپا لیتا ہے۔ یہ وہ صورت ہے جس کو اسلام کا جھوٹا مدعی اختیار کر لیتا ہے اور بہت سے ایسے لوگ اور منافق جو اندر سے انکار کرنے والے اور بظاہر اقرار کرنے والے ہیں اس صورت کو اختیار کر کے اپنے اندر چھپے ہوئے کفر و نفاق کو منظرِ عام پر لاتے ہیں اور اپنے ہاتھوں اپنے کفر والحاد کا ثبوت فراہم کر دیتے ہیں۔

ان کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا ؕ اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ

”بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں میں الحاد کرتے ہیں وہ ہم سے چھپے ہوئے نہیں ہیں (وہ اس الحاد کی سزا پائیں گے) تو کیا

وہ شخص بہتر ہے جو جہنم میں پھینک دیا جائے گا یا وہ شخص جو قیامت کے دن امن وسلامتی کے ساتھ حاضر ہو گا تم جو چاہو کرتے رہو تم جو کچھ کر رہے ہو ان سب کو اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے۔" (حم السجدۃ:۴۰)

تو اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں الحاد کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ایسے خود ساختہ معنی پہنائے جائیں جو اس کے قطعی اور یقینی معنی و مفہوم کے خلاف ہوں اور جن سے آیتوں کا مقصد ہی بدل اور الٹ جائے۔ عام اصطلاح میں اس کو معنوی تحریف کہا جاتا ہے۔

قرآن وسنت میں تحریف کی معروف اقسام

اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعلیمات اور آیتوں میں دو طرح کی تحریف مشہور اور معروف ہیں ایک یہ کہ کوئی ظاہر میں تو کتاب اللہ پر ایمان رکھنے کا دعویدار ہو لیکن کتاب اللہ اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں میں قطع وبرید اور تغیرّ وتبدّل کر کے ان کے الفاظ کو بگاڑ دے، اس کو اصطلاح میں لفظی تحریف کہتے ہیں۔ تحریف کی دوسری قسم یہ ہے کہ آیتوں اور الفاظ کو تو برقرار رکھا جائے لیکن آیات اور الفاظ کو ان کے اصل معنی و مفہوم سے پھیر کر ان کا اپنی من مانا اور ایسا غلط معنی بیان کر دیا جائے جو ان الفاظ کے یقینی اور اصل مقصد کے خلاف ہو۔ اس کو معنوی تحریف کہا جاتا ہے۔

اہلِ کتاب اور یہود نے دونوں طرح کی تحریف اپنی آسمانی کتابوں میں کی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس کفر کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان فرمایا ہے، چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَکُمْ وَ قَدْ کَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ

"(اے مسلمانو!) کیا تم توقع رکھتے ہو کہ (یہودی) تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ ایسا تھا جو اللہ تعالیٰ کا کلام سنتا تھا، پھر (اس کا مطلب) خوب سمجھ لینے کے بعد دانستہ اس میں تحریف کرتا تھا۔" (بقرہ:۷۵)

دوسری جگہ اہلِ کتاب اور یہودیوں کے اس شدید کفر وخیانت کی نشاندہی ان الفاظ میں کی:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَ جَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِیَةً ۚ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ

"پس ان لوگوں کا اپنے عہدِ اطاعت کا توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا[1] (اور ان کا حال یہ ہوا کہ) وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کو اس کے اپنے اصل مواقع اور محل سے ہٹا دیتے ہیں

[1] کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ حق سے پھرتے رہتے ہیں تو بالآخر ان کے دل میں قبولیت کی استعداد اور صلاحیت ختم ہو جاتی ہے اور ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور پھینک دیے جاتے ہیں جس کے بعد وہ کسی بڑے سے بڑے جرم اور کفر سے بھی نہیں چوکتے۔ اللہ تعالیٰ ہی حفاظت فرمائے۔ آمین

(یعنی اللہ تعالیٰ کے کلام اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم وہدایات میں تحریف کر دیتے ہیں)۔"(مائدہ:۱۳)

اسی طرح بہت سی آیاتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کے کفر کو واضح کیا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر بظاہر ایمان رکھنے کے دعویدار تھے اور آسمانی کتاب تورات وغیرہ میں لفظی اور معنوی تحریف کر کے کتاب اللہ پر ایمان لانے سے محروم ہو گئے۔

مذکورہ بالا بحث سے ثابت ہوا کہ جو شخص قرآن مجید کی آیتوں میں سے کسی آیت اور دینِ اسلام کے ضروری اور یقینی احکام میں سے کسی حکم کا انکار کرے گا یا اس کو بظاہر مان کر اس آیت اور حکم کا ایسا مفہوم بیان کرتا ہے جس سے اس آیت اور حکم کا معنی اور مقصد ہی الٹ جائے تو ایسا شخص بالاتفاق کافر ہے اگرچہ وہ اس کو تاویل یا تحقیق وغیرہ کا لباس پہنا کر اپنے اس کفر کو چھپائے۔

کیا تاویل کے پس پردہ تحریف کا مرتکب تحریف کرنے والوں میں شمار ہوگا

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیں کہ یہ جو مشہور ہے کہ مؤوِّل (یعنی تاویل کرنے والا) کافر نہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی کسی آیتِ کریمہ کے قطعی اور یقینی طور پر ثابت شدہ معنی اور مفہوم کے خلاف مفہوم بیان کرتا رہے پھر بھی اس کو کافر نہیں کہا جائے گا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تاویل کسی قطعی اور یقینی بات کے مخالف نہ ہو، ورنہ اگر تاویل کا یہی مطلب لیا جائے کہ بس جو کوئی اپنے انکار کو کسی تاویل وغیرہ کے حسین لباس میں چھپائے تو اس کو مسلمان سمجھا جائے تو پھر تو بڑے سے بڑے کافروں کو بھی اسلام سے خارج نہیں کیا جاسکتا، پھر تو ان کو بھی مسلمان کہنا پڑے گا جو قرآن مجید کی آیتوں کو غلط معنی پہنا کر سادہ لوح مسلمانوں سے یہ کہتے رہتے ہیں کہ قرآن مجید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "کلمۃ اللہ" کہا گیا ہے اور قران ہی میں ان کو "روح اللہ" بھی کہا گیا اور قرآن مجید نے یہ بھی کہا ہے کہ "ہم نے روح القدس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کی تھی" تو خدا، کلمہ اور روح القدس یہی وہ تین اقنوم ہیں جو قرآن مجید سے بھی ثابت ہیں اور عیسائی بھی یہی کہتے ہیں کہ یہی وہ تین اقنوم ہیں جو مل کر ایک خدا بنتا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ تاویل کو اگر جائز قرار دیا جائے تو یہی عقیدہ تثلیث (تین اقنوم) جس کی قرآن مجید کھلم کھلا تردید کر رہا ہے اور جو یہ عقیدہ رکھے اس کو کافر اور مشرک قرار دیتا ہے تو ایسے خود ساختہ بے سروپا عقیدہ کی تردید کے بجائے قرآن مجید ہی سے اس کو ثابت کر دیا جائے گا، آخر مشرکینِ مکہ بھی تو اپنے مشرک اور انکارِ توحید کو اس طرح کی باطل تاویل کے پردہ میں یوں چھپایا کرتے تھے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى

”اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور حمایتی اور معبود بنالیے ہیں (وہ اپنے لیے یہ چیز پیش کرتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں تا کہ ہم کو یہ اللہ تعالیٰ کے مُقرّب بنادیں۔“ (زمر:۳)

یہاں بت پرستوں اور مشرکین نے بھی اللہ تعالیٰ کی توحید کا صاف اور براہِ راست انکار نہیں کیا، لیکن قرآن مجید ہی نے ان کو کافر اور مشرک قرار دیا ہے۔ اگر ایسی باطل تاویلوں کے پس پردہ بھی کسی کو دائرہ اسلام سے خارج نہ کیا جائے تو ایمان اور کفر کی کوئی حد باقی نہیں رہے گی۔ تو مشرک، تین خدا ماننے والے اور بت پرست سب کے سب مؤمن ہو سکتے ہیں، پھر تو کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں محمد ﷺ کو تو مانتا ہوں مگر محمد ﷺ سے مراد وہ شخصیت نہیں جو مسلمان سمجھتے ہیں قرآن مجید میں جس محمد ﷺ کا ذکر ہے اس سے مراد فلاں شخص ہے جو فلاں قوم میں پیدا ہوا ہے، یہی نہیں، بلکہ کوئی یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں قرآن مجید کو تو مانتا ہوں مگر قرآن مجید اس کتاب کا نام نہیں جو مسلمانوں کے دلوں اور ہاتھوں میں ہے، بلکہ اس سے مراد کوئی اور کتاب ہے تو اس طرح تاویل اور تحریف کرکے آدمی بیک وقت دینِ اسلام اور قرآن کا منکر بھی ہو سکتا ہے اور اس کا بظاہر ماننے والا مسلمان بھی۔

بہر حال یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی آیتوں اور دینِ اسلام کے احکامات کے لیے ایسی باطل تاویلات کا دروازہ کھول دیا جائے تو پھر کوئی چیز بھی نہ فرض رہ سکتی ہے اور نہ حرام، پھر تو تاویل کا سہارا لے کر جو بھی کفریہ عقیدہ چاہے اختیار کرلے اور جو بھی جرم جی چاہے کر سکتا ہے اور دینِ اسلام کے خلاف اپنی خواہشِ نفس کے مطابق عقائد، اعمال اور جرائم پر دینِ اسلام کا لیبل لگا کر ان کو عینِ اسلام ثابت کر سکتا ہے جس کے بعد نہ دینِ اسلام کے عقائد محفوظ رہیں گے اور نہ دوسرے احکامات، ہر ایک کا دین اس کی خواہشِ نفس بن جائے گا جو صرف ایک کفر نہیں، بلکہ کفر پر کفر اور الحاد و زندقہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں منافقین کی حالت اور کرتوت

جس طرح کفر و ایمان کی حالتیں یکساں نہیں اسی طرح کفر و نفاق کے درجات بھی متفاوت ہیں۔ کسی کا نفاق بہت زیادہ ہوتا ہے اور کسی کا کم۔ قرآن مجید میں بہت سی جگہوں میں منافقوں کی حالت کا ذکر آیا ہے اور مختلف قسم کے منافقوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان میں سے چند آیاتِ کریمہ یہاں پیش کی جاتی ہیں تا کہ ہم اپنی زندگیوں پر نظر ڈالیں، اگر ہم میں کہیں نفاق کی کوئی علامت پائی جاتی ہو تو اس کا علاج کرلیں، ایسے اعمال اور جذبات سے بچنے کی کوشش کرلیں جو نفاق کی طرف لے جانے والے اور اس کا سبب بن سکتے ہوں۔

منافقین دعویٰ ایمان کے باوجود ایمان سے محروم ہوتے ہیں، وہ مفسد ہیں مگر اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہیں، وہ ایمان کا دعویٰ کر کے مؤمنوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ا.... وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝

”اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت پر ایمان لائے حالانکہ وہ بالکل مؤمن نہیں (یہ لوگ محض ایمان کا دعویٰ کر کے اپنے زعم میں) اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور ان کو (اس حقیقت کا) شعور بھی نہیں ہے، ان کے دلوں میں بیماری ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (مؤمنین کی فتوحات کے ذریعے) اور بڑھا دیا (یعنی نفاق اور حسد کی جلن اور زیادہ بڑھ گئی) اور ان لوگوں کے لیے (آخرت میں) دردناک عذاب ہوگا اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ کہتے ہیں (یعنی ایمان کے جھوٹے دعوے کرتے ہیں)۔“ (بقرہ:۸-۱۰)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے کرتوت بیان فرمائے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ فساد مت پھیلاؤ تو وہ یہی کہا کرتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) خبردار! حقیقت میں یہی لوگ مفسد (اور خرابیاں پھیلانے والے) ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔

(۲) اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح دوسرے لوگ (یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) ایمان لائے ہیں اس طرح تم بھی ایمان لاؤ تو جواب میں کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح بے وقوفوں نے لایا (جن کو نہ سیاست آتی ہے اور نہ وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کو سمجھتے ہیں، ہمارا کفار سے ملنا سیاست اور مصلحت پر مبنی ہے) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خبردار! یہی لوگ حقیقت میں بے وقوف ہیں مگر یہ (اپنی بے وقوفی کو) جانتے نہیں ہیں۔

(۳) اور ان کی حالت یہ ہے کہ جب وہ ایمان والوں کے ساتھ ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں (یہودیوں وغیرہ) سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم حقیقت میں تو تمہارے ساتھ ہیں اور ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔“ (بقرہ:۱۵-۱۱)

۲.... منافق لوگ آپ ﷺ پر اعتراض و تنقید کرتے ہیں اور آپ ﷺ کو اپنی باتوں سے دکھ اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ

”اور ان میں سے بعض وہ لوگ ہیں جو صدقات (کی تقسیم کے سلسلے) میں تم پر اعتراض (اور تنقید) کرتے ہیں (حالانکہ نبی پر اعتراض اور ناانصافی کا گمان ایمان بالرسول کے قطعاً منافی ہے ان کا تو حال یہ ہے کہ) اگر (اسی حال میں سے) انہیں (ان کی خواہش کے مطابق) دیا جائے تو خوش ہو جاتے ہیں اور اگر (خواہش کے مطابق) نہ دیا جائے تو فوراً بگڑ جاتے ہیں۔“ (التوبہ:۵۸)

وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ النَّبِيَّ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ اُذُنٌ ۭ قُلْ اُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۱﴾

”اور ان (منافقوں) میں وہ (لوگ) بھی ہیں جو نبی (کریم ﷺ) کو (اپنی باتوں سے) اذیت پہنچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص بہت سننے والا ہے (یعنی ہر ایک شخص کی بات سن کر مان لیتا ہے جب ہمارے خلاف باتیں سنتے ہیں تو ان پر بھی یقین کر لیتے ہیں اور جب ہم قسمیں کھا کر اپنی صفائی پیش کرتے ہیں تو اس پر بھی یقین کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے پیغمبر) ان سے کہہ دیجیے کہ ان کا ایسا ہونا تمہاری بھلائی کے لیے ہے (کہ وہ تم لوگوں کی جھوٹی معذرتیں سن کر درگزر کرتے ہیں حالانکہ وہ آپ کی باتوں اور کرتوتوں کو خوب سمجھتے ہیں، لیکن ظاہری ایمان کی وجہ سے تم سے کچھ نہیں کہتے۔ لہٰذا تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ ہر ایک کی بات پر یقین کرتے ہیں وہ چاہے ہر ایک کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا کریں مگر) وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہے (اور اس کی باتوں پر یقین رکھتا ہے) اور (سچے) مومنوں (کی باتوں) پر اعتماد کرتا ہے (جن کی سچائی ہر طرح کی آزمائش میں پرکھی گئی ہو) اور وہ ان لوگوں کے لیے سراسر رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے رسول کو دکھ پہنچاتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔“ (توبہ:۶۱)

۳.... منافق لوگ زبان سے اپنے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے مگر اپنے جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے شیطانی قوانین کی طرف رجوع کرتے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۶۰﴾ وَاِذَا قِيْلَ

لَهُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡكَ صُدُوۡدًا ﴿۶۱﴾ فَكَیۡفَ اِذَاۤ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِیۡبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتۡ اَیۡدِیۡهِمۡ ثُمَّ جَآءُوۡكَ یَحۡلِفُوۡنَ ٭ۖ بِاللّٰهِ اِنۡ اَرَدۡنَاۤ اِلَّاۤ اِحۡسَانًا وَّ تَوۡفِیۡقًا ﴿۶۲﴾

”(اے نبی!) کیا آپ نے ان لوگوں کو دیکھا نہیں جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ جو کچھ آپ پر نازل ہوا ہے اس پر ہم بھی ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل ہو چکا ہے اس پر بھی (پھر دعوائے اسلام کے باوجود) وہ یہ چاہتے ہیں کہ (اپنے مقدمات کا) فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے خلاف سرکش اور غیر اسلامی قوانین) کی طرف رجوع کریں حالانکہ ان کو یہ حکم دیا جا چکا ہے کہ وہ ان (یعنی شیطانی سرکش قوانین) کا انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں (راہ حق سے) بھٹکا کر (گمراہی میں) بہت دور تک لے جائے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی طرف آؤ (تاکہ آپ ان کے درمیان فیصلہ کریں) تو آپ ان منافقوں کو دیکھیں گے کہ وہ آپ (کے فیصلے) سے روگردانی کر لیں گے۔ کیا حال ہوتا ہے جب ان پر اپنے شامتِ اعمال کی وجہ سے کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو پھر اس وقت یہ آپ کے پاس آتے ہیں اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد تو صرف بھلائی اور باہمی مصالحت کا تھا (کہ فریقین میں کسی طرح موافقت کی فضا قائم رہے)۔“ (نساء:۶۰-۶۲)

۴.... اور ایک دوسری جگہ ایسے منافقوں کا حال یہ بیان کیا گیا ہے:

وَ یَقُوۡلُوۡنَ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالرَّسُوۡلِ وَ اَطَعۡنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ ؕ وَ مَاۤ اُولٰٓئِكَ بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۴۷﴾ وَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَی اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ لِیَحۡكُمَ بَیۡنَهُمۡ اِذَا فَرِیۡقٌ مِّنۡهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۴۸﴾ وَ اِنۡ یَّكُنۡ لَّهُمُ الۡحَقُّ یَاۡتُوۡۤا اِلَیۡهِ مُذۡعِنِیۡنَ ﴿ؕ۴۹﴾ اَفِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ اَمِ ارۡتَابُوۡۤا اَمۡ یَخَافُوۡنَ اَنۡ یَّحِیۡفَ اللّٰهُ عَلَیۡهِمۡ وَ رَسُوۡلُهٗ ؕ بَلۡ اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۵۰﴾

”اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور ہم نے اطاعت اختیار کی پھر (ایمان و اطاعت کے اس (دعویٰ) کے بعد (جب ان کے اس دعوائے ایمان و اطاعت کے امتحان کا وقت آتا ہے تو) ان میں سے ایک گروہ (فریق) اپنے عہد (ایمان و اطاعت) سے منہ پھیر لیتا ہے اور یہ لوگ (باوجود دعوائے اسلام کے) ہرگز مؤمن نہیں ہیں اور (ان کی حالت یہ ہے کہ) جب ان کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کرلے تو ان میں سے ایک فریق روگردانی کرنے لگتا ہے اور اگر (کوئی معاملہ ایسا ہوتا ہے جس

میں) حق ان کے لیے ہو تو آپ کے پاس سرِ تسلیم خم کیے (دوڑے) چلے ① آتے ہیں۔ کیا ان کے دلوں میں (کفر ونفاق کی) بیماری ہے یا وہ (اسلام کے متعلق) شک میں پڑے ہوئے ہیں یا انہیں یہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ان کی حق تلفی کریں گے؟ بلکہ (اصل بات ہے کہ) خود یہی لوگ ظالم ہیں"۔ (نور:۴۷-۵۰)

۵.... منافق مسلمانوں کے معاملہ میں سخت کنجوس ہیں۔ وہ بہت بزدل ہوتے ہیں البتہ جب خطرے کی حالت گزر جاتی ہے تو زبانوں کو قینچی کی طرح چلا کر مال غنیمت زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں:

اَشِحَّةً عَلَيْكُمْ ۚ فَاِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَاَيْتَهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ تَدُوْرُ اَعْيُنُهُمْ كَالَّذِيْ يُغْشٰى عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۚ فَاِذَا ذَهَبَ الْخَوْفُ سَلَقُوْكُمْ بِاَلْسِنَةٍ حِدَادٍ اَشِحَّةً عَلَى الْخَيْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَمْ يُؤْمِنُوْا فَاَحْبَطَ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۹﴾

"(یہ منافقین) تمہارے معاملہ میں سخت کنجوس ہیں تو جب خطرے کا وقت آجائے تو اس طرح آنکھیں گھما کر آپ کی طرف دیکھتے ہیں جیسے مرنے والے پر غشی طاری ہو رہی ہو اور جب خطرہ گزر جاتا ہے تو یہ لوگ مال (غنیمت) کے حریص بن کر اپنی تیز زبانوں کے ساتھ آپ کو طعنے دینے لگتے ہیں یہ لوگ در حقیقت ایمان ہی نہیں لائے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال برباد کر دیے اور ایسا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے بہت آسان ہے۔" (الاحزاب:۱۹)

۶.... منافق لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرنے سے جی چراتے ہیں، وہ زبان سے جو کچھ کہتے ہیں وہ ان کے دل میں نہیں ہوتا اور یہ مذبذب لوگ دوسروں میں بھی کمزوری پیدا کرتے ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ښ وَقِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ ھُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْھُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِھِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِھِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِھِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

"اور دو لشکروں کے مقابلے کے دن جو نقصان تمہیں پہنچا تو وہ اللہ ہی کے حکم سے پہنچا اور (یہ اس لیے تھا)

---

① یعنی جب ان منافقوں کو یقین ہو کہ وہ بالکل حق پر ہیں تو آپ ﷺ کے فیصلے کے لیے گردن رکھ دیتے ہیں کیونکہ ان کو یہ تو پتہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ حق اور انصاف والا فیصلہ کریں گے تو یہاں بھی یہ لوگ حق وانصاف کو نہیں ڈھونڈتے، بلکہ صرف اپنے مفاد کے بھوکے ہوتے ہیں جہاں سے ان کو حاصل ہونے کی امید ہو وہاں دوڑے چلے جاتے ہیں دراصل یہ لوگ ظالم ہوتے ہیں اور عدل وقسط کا نظام چونکہ ان کے مفادات کے خلاف پڑتا ہے اس لیے وہ اس کو سچائی کے ساتھ قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں البتہ اپنے مفادات کی حد تک اس پر عمل کرتے ہیں۔

تاکہ اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے مؤمنوں کو اور ظاہر کرے ان لوگوں کو جو نفاق کرتے ہیں اور جب ان سے کہا گیا کہ آپ اللہ کے راستہ میں جنگ کرو یا (کم از کم اپنے شہر میں رہ کر اپنے شہر کا) دفاع کرو تو کہنے لگے کہ آج جنگ ہوتی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے جس وقت وہ یہ بات کہہ رہے تھے اس وقت وہ (ظاہری) ایمان کی بہ نسبت (ظاہری) کفر سے زیادہ قریب تھے یہ لوگ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو (جنگ کے وقت) خود تو اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی جنگ میں شریک ہوئے ان کے حق میں بھی یہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مان لیتے تو کبھی نہ مارے جاتے [1] (اے پیغمبر!) ان سے کہہ دو اگر تم واقعی اس (عقیدے میں) سچے ہو (کہ گویا تم لوگوں کی تدبیر سے موت ٹل جاتی ہے) تو خود تمہاری موت جب آئے اسے اپنے اوپر سے ٹال کر دکھا دینا۔" (آل عمران:۱۶۶-۱۶۸)

۷....منافق لوگوں کی طرف سے تکلیف پہنچنے کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح سمجھتے ہیں البتہ جب کوئی فتح ونصرت اور کامیابی نصیب ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝

"اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے مگر جب ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ لوگوں کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کی طرح سمجھتے ہیں (اور لوگوں کی دی ہوئی تکلیف کی وجہ سے اسلام سے اپنا رشتہ سست کر دیتے ہیں) اور اگر آپ کے رب کی طرف سے کوئی فتح ونصرت پہنچتی ہے تو یہی لوگ کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے کیا اللہ تعالیٰ ان بھیدوں سے بخوبی باخبر نہیں جو جہاں والوں کے سینوں میں چھپے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ ضرور (ان آزمائشوں کی وجہ سے) یہ ظاہر کرے گا کہ مؤمن کون ہیں اور منافق کون ہیں۔" (عنکبوت:۱۰-۱۱)

۸....منافقین انتظار میں ہوتے ہیں جس کا پلہ بھاری ہو ان سے جا ملتے ہیں اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہم دل سے آپ کے ساتھ تھے۔ منافق بے دلی کے ساتھ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کا ذکر برائے نام کرتے ہیں اور یہ لوگ مذبذب ہیں۔

---

[1] اس طرح باتیں کر کے وہ دوسرے مسلمانوں کو بھی تذبذب کا شکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْۤا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَ اِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ
نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْۤا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ
الْقِیٰمَةِ ؕ وَ لَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ
خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۱۴۲﴾ ۙ
مُّذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِكَ ۖۗ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ وَ لَاۤ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ ؕ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِیْلًا ﴿۱۴۳﴾

”یہ منافقین تمہارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اگر تمہیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فتح نصیب ہو جائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی تمہارے ساتھ نہ تھے ؟ اور اگر کافروں کو کچھ کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان (کافروں) سے کہتے ہیں کیا ہم (جنگ میں تم پر) غالب نہیں آنے لگے تھے اور (اس کے باوجود بھی) ہم نے تم کو مؤمنین سے بچا نہیں لیا پس اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے (اور ان کے) درمیان فیصلہ کر دے گا اور (اس فیصلہ میں) اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی راہ نہیں بنائے گا، (بلکہ کفار جہنم کا ایندھن بنیں گے اور مسلمان کامیاب وکامران ہو کر جنت کے باغوں میں ٹھکانا پائیں گے) بے شک یہ منافق (اپنی اس دورنگی چال سے اپنے گمان میں) اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے رہے ہیں اور (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی نے ان کو (ان کے مکروفریب اور نفاق کے نتیجہ میں) دھوکے میں ڈال رکھا ہے جب یہ لوگ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بہت کاہلی کے ساتھ محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم (اور برائے نام) کفر اور ایمان کے درمیان متردد کھڑے ہیں (کہ کس طرف ہو جائیں) یہ نہ تو (پوری طرح) اس طرف (یعنی نہ پوری طرح مؤمنین کے ساتھ) ہیں نہ پوری طرح کافروں کے ساتھ ان دونوں کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں) اور جس کو (اپنے کرتوتوں کے نتیجے میں) اللہ تعالیٰ نے گمراہ کر دیا تو ایسے شخص کے لیے تم ہرگز کوئی راہِ ہدایت نہ پاؤ گے۔“ (نساء:۱۴۱-۱۴۳)

۹ .... منافق غرض کے بندے ہیں، راہ حق میں مشقت برداشت کرنا ان کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ جہاد سے رہ جانے کے لیے طرح طرح کے بہانے بناتے ہیں اور وہ جھوٹی قسم کھاتے ہیں:

لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِیْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَیْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَ سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ
اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ یُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

”(اے پیغمبر!) اگر مال غنیمت آسانی سے ملنے کی امید ہوتی اور سفر ہلکا ہوتا تو یہ (منافق) ضرور (آپ کی دعوتِ

جہاد پر لبیک کہتے ہوئے بلا تأمل آپ کے) پیچھے ہو لیتے لیکن ان کو مسافت دور دکھائی دیتی ہے (اس لیے ہمت ہار گئے) اور ابھی (جب تم جنگ سے واپس آؤ گے تو) یہ لوگ اللہ کی قسم کھا کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم استطاعت اور جنگ جانے کے لیے (سواری وغیرہ کی) قدرت وطاقت رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ یہ (منافق) بالکل جھوٹے ہیں۔" (توبہ:۴۲)

ان کے دلوں میں اسلام کے متعلق شکوک وشبہات ہیں

دو آیت آگے اللہ تعالیٰ منافقین کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

۱۰.... اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ

"آپ سے تو جہاد پر نہ جانے کی رخصت صرف وہی لوگ مانگیں گے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور جن کے دل شک میں مبتلا ہیں اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔" (توبہ:۴۵)

۱۱.... منافق مردانگی اور غیرت کے احساس سے محروم ہیں، جب قوم وملت کے لیے مال کی قربانی اور جان کی بازی لگانے کا وقت آیا تو یہ لوگ گھروں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهِ اسْتَاْذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَّعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۸۶﴾ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۷﴾

"اور جب کوئی سورت نازل کی جاتی ہے (جس میں حکم ہوتا ہے) کہ اللہ پر (خلوص کے ساتھ) ایمان لاؤ اور اس کے رسول کے ساتھ ہو کر جہاد کرو تو (تم دیکھو گے کہ) جو لوگ ان میں مقدور (اور بہت زیادہ مال) والے ہیں وہی آپ سے (جہاد پر نہ جانے کی) رخصت طلب کرنے لگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بھی (جہاد سے) بیٹھنے والوں (معذورین) کے ساتھ بیٹھے رہیں اور اس پر خوش ہیں کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں میں شامل ہوں اور ان کے دلوں پر مہر لگ گئی اور اس لیے وہ (غیرت اور بے غیرتی کو) سمجھتے ہی نہیں۔" (توبہ:۸۶-۸۷)

۱۲.... منافقوں کی دوستی اور ہمدردی مسلمانوں کے بجائے کفار کے ساتھ ہوا کرتی ہے، وہ اپنی عزت وکامیابی کفار کے ہاں تلاش کرتے ہیں:

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ

اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ﴿۱۳۹﴾

”(اے پیغمبر!) آپ منافقوں کو یہ خوشخبری سنادیجیے کہ بلاشبہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے وہ (منافق) جو مؤمنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بناتے ہیں (اور مسلمانوں کی دوستی پر دشمنانِ اسلام کی دوستی کو ترجیح دیتے ہیں) کیا وہ (اپنی) عزت ان (کفار و دشمنانِ اسلام) کے پاس تلاش کرتے ہیں تو (وہ سن لیں کہ) عزت تو سب کی سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے (یعنی اس کے اختیار میں ہے جو اس کے قانون پر چلے وہی عزت پاسکے گا)۔“

(نساء:۱۳۸-۱۳۹)

۱۳.... يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡيَهُوۡدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوۡلِيَآءَ ‌ۘ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ ؕ وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ‌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۱﴾ فَتَرَى الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوۡنَ فِيۡهِمۡ يَقُوۡلُوۡنَ نَخۡشٰٓى اَنۡ تُصِيۡبَنَا دَآئِرَةٌ‌ ؕ فَعَسَى اللّٰهُ اَنۡ يَّاۡتِىَ بِالۡفَتۡحِ اَوۡ اَمۡرٍ مِّنۡ عِنۡدِهٖ فَيُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَاۤ اَسَرُّوۡا فِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ نٰدِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾

”اے مؤمنو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست و مددگار نہ بناؤ (کیونکہ) وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں (اور مسلمانوں کے ساتھ ان کی کوئی دوستی اور ہمدردی نہیں) اور تم میں سے جو کوئی انہیں دوست و مددگار بنائے گا تو وہ بھی انہیں میں سے سمجھا جائے گا بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا تم دیکھتے ہو جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے وہ انہی (کی دوستی) میں دوڑ دھوپ کرتے ہیں (ان کی یہ روش اس لیے ہے کہ وہ دل سے یا زبان سے) کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں کہ (ان کے بائیکاٹ کی وجہ سے) ہم پر کوئی گردش نہ آجائے تو (یقین کرو) وہ وقت دور نہیں جب اللہ تعالیٰ (تمہیں فیصلہ کن) فتح دے گا یا اپنی طرف سے کوئی اور بات ظاہر کرے گا تو یہ لوگ اس نفاق پر شرمندہ ہوں گے جو انہوں نے اپنے دلوں میں چھپا رکھا ہے۔“ (المائدہ:۵۱-۵۲)

یہ چند آیاتِ کریمہ پیش کی گئیں ان کے علاوہ قرآن وحدیث میں منافقوں کی اور خصلتیں اور کرتوت بھی موجود ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی راہ میں خوش دلی سے کبھی خرچ نہیں کرتے تھے اور دین کے بارے میں ان کی زبانیں آزاد ہوتی تھیں لیکن جب پکڑے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے تو بطورِ مزاح اور خوش طبعی کے ایک بات کر دی تھی اور ان کا ایک وصف یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ خود تو کچھ کریں گے نہیں لیکن کرنے والوں کے خلاف ان کی زبان بے لگام اور بے باک ہوا کرتی ہے۔ نیز وہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے میں کوشاں ہوتے تھے اور جھوٹ، خیانت، بدزبانی اور بدعہدی کے عادی تھے، ان کی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ کوئی وفاداری نہیں تھی، بلکہ

صرف اپنی غرض کے بندے تھے۔

اپنے ایمان و عمل کا احتساب کریں کہ کہیں ہم میں تو نفاق نہیں

اگر ہم بھی آج اپنی زندگیوں پر نظر ڈالیں اور اپنے ایمان و عمل کا احتساب کر لیں تو معلوم ہو جائے گا کہ ہم میں سے کتنے مسلمان ایسے ہیں جو واقعی مؤمن اور مسلم کہلانے کے مستحق ہیں؟ بلاشبہ آج مسلمانوں کی اکثریت کسی نہ کسی حد تک ان کمزوریوں، بلکہ بہت سے نام نہاد مسلمان تو کھل کر نفاق کی بیماری اور زندقہ میں مبتلا ہیں۔ کیا آج کل مسلمانوں کی اکثریت کا حال یہ نہیں کہ اسلام کے جو احکام ان کے ذاتی مفادات کے خلاف نہیں ہوتے ان پر تو خوشی سے عمل کرتے ہیں مگر جو احکامات ان کے مفادات کے خلاف ہوں ان سے نکل کر بھاگنا چاہتے ہیں؟ آج کل کتنے مسلمان ایسے ہیں جو ہر معاملہ میں شریعتِ مطہّرہ کی طرف رجوع کرتے ہیں؟ کیا آج اکثر کا حال یہ نہیں کہ اگر کسی معاملہ میں وہ ناحق پر ہوں تو شریعتِ مطہّرہ کے فیصلوں سے جان بچانے کی کوشش کریں گے اور جب یقین ہو کہ ہم حق پر ہیں تو پھر اپنے ذاتی مفاد کی خاطر شریعتِ مطہّرہ کے قانون کی طرف دوڑتے ہیں؟ آج کل کتنے مسلمان ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے جان کی بازی لگا کر راہِ حق میں لڑتے ہیں؟ کیا آج کل مسلمانوں کی اکثریت جہاد کو موت کا پیغام سمجھ کر ان کی روحیں جہاد کے تصور سے نہیں لرزتیں؟ بلکہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک کے جو منافق تھے وہ تو بہانے بنا کر جہاد پر نہ جانے کی اجازت مانگتے تھے لیکن ہمارے زمانے میں تو ایسے زندیقوں کی بھی کمی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں لڑنا تو کیا فرضیتِ جہاد کا عقیدہ اور تصور بھی ختم کرنا چاہتے ہیں۔ پھر کیا آج کل بہت سے نام نہاد مسلمانوں کی زبان اور قلم دینِ اسلام اور شعائر اللہ کے معاملہ میں بے لگام اور بے باک نہیں ہیں؟ کیا آج کل مسلمانوں کے دوست اور ہمراز مسلمانوں کے بجائے کفار اور یہود و نصاریٰ نہیں ہیں؟ کیا ہم مسلمانوں کے حکمران، لیڈر اور دوسرے لوگ کافروں کی دوستی، بلکہ غلامی میں اپنی کامیابی اور اپنی عزت تلاش نہیں کرتے؟ کیا مسلمانوں کے قائدین اور لیڈر مُصلح اور خیر خواہ ہونے کے دعوے کر کے مسلمانوں میں فساد پھیلانے اور اسلام کی بیخ کنی میں مصروف نہیں ہیں؟ بلاشبہ مسلمانوں کے قائدین سربراہ اور لیڈر طاغوتی طاقتوں کے ایجنٹ یا ان کے ذہنی غلام بن چکے ہیں جس کی وجہ سے وہ ان کی مدح سرائی میں اپنی حمیت اور اسلامی غیرت کھو چکے ہیں اور وہ دینِ اسلام پر فدائیت کو چھوڑ کر اہلِ باطل کے نظریات اپنائے ہوئے ہیں اور پوری قوم و ملت شیطانوں کی غلام بن چکی ہیں۔

مسلمانو! اپنے حکمرانوں کا بھی احتساب کرو کہ انہوں نے اپنا دوست و دشمن کس کو بنا رکھا ہے؟

اور مسلمانوں کی عوام یہ بھی سوچے کہ ہمارے حکمرانوں، لیڈروں نے کس کو اپنا معتمد اور ہمراز بنا رکھا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کی خلاف ورزی کر کے ان شیطانوں نے مسلمانوں کے ساتھ کون سی ہمدردی کی؟ اور آج بھی وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں؟ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمانوں کے ہاتھوں مار کر مسلمانوں کی قوت وعزت کو مٹانے میں مصروف ہیں۔ امریکہ اپنے ذاتی مفادات کی خاطر مسلمانوں کی ایک حکومت سے عارضی ہمدردی کا اظہار کر کے مسلمانوں کا پیر بنا ہوا ہے اور اسی امریکہ نے بیروت، لبنان وغیرہ میں مسلمانوں کے ساتھ کیا برتاؤ اختیار کر رکھا ہے؟ اسی طرح روس اگر وقتی طور پر فلسطین، شام وغیرہ میں مسلمانوں کا آقا بن گیا تھا تو اس نے سمرقند، بخارا اور افغانستان کے مسلمانوں کا کیا حشر کیا؟ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ جب بنگال نے بغاوت کی ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی، مسلمانوں کا ایک بڑا ملک اور بڑی قوت تقسیم ہو رہی تھی اور مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کو اور اس کے قانون کو چھوڑ کر امریکہ پر اعتماد کیا تا کہ وہ پاکستان کو پارہ پارہ ہونے سے بچائے تو ایسی صورت میں امریکہ کا بحری بیڑہ پاکستان کی امداد کے لیے اس وقت آ پہنچا جب کہ پاکستان کا بیڑہ غرق ہو کر مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بن گیا۔ لیکن جب سرزمین عرب میں عراق ایک قوت بن رہی تھی تو اس کی قوت کو ختم کرنے لیے اسی امریکہ کے بحری بیڑے قبل از وقت اپنی مشقیں کر رہے تھے۔

پھر ایسی صورت میں جب کہ عراق کو مارنے کے لیے امریکہ نے اکثر دنیا کو جمع کیا تھا، اس پر اقتصادی پابندی لگا دی تھی، ہر طرف عراق پر بمباری ہو رہی تھی اور مسلمان بھی اپنی قوت اپنے ہاتھوں تباہ کرنے میں پوری قوت صرف کر رہے تھے تو ایسی نازک حالت میں عراق کے بچاؤ اور اس کی مدد کے کے لیے عراق اور صدام کے آقا یعنی روس نے جو کردار ادا کر دیا وہ بھی سب کے سامنے ہے کہ روس نے بھی عراق کے مارنے اور اس پر پابندیوں کے لگائے جانے کے حق میں ووٹ ڈالا اور ہندوستان جو اس سے پہلے عراق کا دوست سمجھا جاتا تھا اس نے بھی عراق کو ختم کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔

یہ چند واقعات بطورِ نمونہ پیش کیے جن کو دیکھ کر ہر کوئی بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ کفار و مشرکین یہود و ہنود کبھی مسلمانوں اور اسلام کے ہمدرد و خیر خواہ نہیں ہو سکتے، وہ تو منافقانہ دوستی اور ہمدردی کا ہاتھ دے کر مسلمانوں کی قوت اور یکجہتی کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے اکثر امرا، وزرا، اور حکمران طبقہ ان کے پکے اور راز دان دوست بن چکے اور انہی کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور ہمارے سادہ لوح مسلمان بھائی یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ان منافق

حکمرانوں اور لیڈروں کے جھنڈے لے کر بازاروں میں نکلتے ہیں اور ان کے متعلق زندہ باد کے نعرے لگاتے پھرتے ہیں۔

پھر یہ سادہ عوام تو کیا، بلکہ بہت سے علماء بھی اس بات کو نہیں جانتے کہ آخر اگر ان حکمرانوں کا اللہ تعالیٰ پر اور قرآن مجید پر ایمان ہے تو وہ قرآن مجید کے خلاف قوانین کو ملک میں کیوں برقرار رکھے ہوئے ہیں؟ کیا یہ کفریہ قوانین کو اسلام پر ترجیح دینا نہیں؟

دین فروش اور مغرب پرست بدترین علماء

اس سے زیادہ افسوس ان لوگوں پر ہے جو اپنے آپ پر علمائے اسلام کا لیبل لگا کر چند ٹکوں کی خاطر ایسے حکمرانوں اور لیڈروں کی پشت پناہی کرتے ہیں، وہ جو کچھ کرتے ہیں یا کہتے ہیں اس کو قرآن وسنت سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ بعض لکھے پڑھے اہل مغرب کے شیدائی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے اسلام کے نام نہاد علما کو ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ وہ کس طرح اپنے محبوب دشمن اسلام کے نظریات ٹھیک ثابت کریں، تاکہ ان کی طرف سے وہ عزت اور روشن خیالی کا خطاب حاصل کر سکیں۔ چنانچہ یہ روشن خیال اپنی ساری توانائیاں اور تحقیق کا سارا زور اس پر خرچ کر دیتے ہیں کہ کسی طرح اسلامی تعلیمات کو اہل مغرب کے نظریات کے مطابق کر دیا جائے خواہ اس کے لیے قرآن مجید اور حدیث میں معنوی تحریف کرنا پڑے یا قرآن وسنت کو کھینچ تان کر کوئی نئی لغت تیار کرنی پڑے یا چاہے اس کام کے لیے انکار حدیث کرنا پڑے، وہ اس معاملہ میں اس طرح کے کسی بھی ظلم سے نہیں چوکتے کیونکہ ان ظالموں کی نظر اور ایمان تو قرآن وسنت کے فیصلوں پر نہیں ہوتا، بلکہ وہ امریکہ، روس اور مغربی اقوام کے نظریات کو حق جان کر ان پر ایسے عاشق ہو چکے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کو ان باطل نظریات کے مطابق کر کے اسلام ہی کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان منافقوں کو جب معلوم ہو گیا کہ مغرب کا سارا نظام سود پر قائم ہے تو انہوں نے اپنی ساری فکری توانائیاں اس پر صرف کیں کہ کسی نہ کسی طرح سود اور سودی بینکاری کو جائز قرار دیا جائے۔

اور جب ان ظالموں کو معلوم ہوا کہ مغربی اقوام خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دے رہے ہیں تو انہوں نے بھی اسی کی تبلیغ شروع کر دی اور قرآن وسنت کی رو سے اس کو جائز قرار دیا اور جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کے بے حیا آقا پردے کو معیوب سمجھتے ہیں تو ان بے غیرتوں اور بے ایمانوں نے قرآن وحدیث کے احکام میں رد وبدل کر کے بے پردگی کو بھی جائز کر دیا۔

یہ چند مثالیں بطورِ نمونہ پیش کیں جن سے آپ یہ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اسلام کا زبانی دعویٰ کر کے تحقیق کے نام پر دینِ اسلام کے ساتھ ان منافقوں نے کیا سلوک کر رکھا ہے اور یہ مادہ پرست اور خود غرض لوگ دینِ اسلام کے ایک ایک حکم کو کیسی چالاکی سے ختم کر رہے ہیں اور قرآن مجید کی آیتوں اور احادیث کے یقینی معنوں کو بدل کر کس طرح اپنے معانی اور خود ساختہ مفہوم نکال لیتے ہیں اور تحریف معنوی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

فتویٰ کفر وغیرہ میں احتیاط کرنی چاہیے

اس بات کا خیال رہے کہ جو گناہ اور جرم جس قدر سنگین ہوتا ہے، اسی قدر اس کی تہمت اور غلط الزام بھی سنگین جرم اور گناہ ہے چنانچہ صحیح حدیث میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَرْمِيْ رَجُلٌ رَجُلًا بِالْفُسُوْقِ وَلَا يَرْمِيْهِ بِالْكُفْرِ إِلَّا ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ إِنْ لَّمْ يَكُنْ صَاحِبُهٗ كَذٰلِكَ

"کوئی مسلمان دوسرے مسلمان پر فسق اور کفر کی تہمت نہ لگائے اگر وہ شخص اس تہمت سے بری ہو تو وہ (کفر اور فسق کا کلمہ) اس کہنے والے پر لوٹ کر آتا ہے۔" (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

اور حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا:

اَيُّمَا رَجُلٌ قَالَ لِاَخِيْهِ كَافِرٌ فَقَدْ بَاءَ بِهَا اَحَدُهُمَا

"جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کو کافر کہے یہ کلمۂ کفر دونوں میں سے ایک پر لوٹ کر آتا ہے یعنی اگر کہنے والے کا الزام صحیح ہے تو ٹھیک ورنہ اس کہنے والے پر یہ کلمۂ کفر لوٹ کر آئے گا۔" (ترمذی، صحیح بخاری و صحیح مسلم)

مذکورہ بالا حدیثوں سے معلوم ہوا کہ کسی پر کفر اور شرک کا غلط الزام کوئی معمولی جرم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے اس درجہ احتیاط کا حکم دیا ہے۔

اگر کسی شخص سے کوئی مشتبہ لفظ نکل گیا جس میں کفر کا بھی احتمال ہو اور صحیح معنی کا بھی

اگر کسی شخص سے کوئی ایسا کلام سرزد ہو جائے جس میں سو (۱۰۰) احتمال ہوسکتے ہیں اور ان میں ننانوے (۹۹) احتمالات کفر ہونے کے ہوں اور صرف ایک احتمال عبارت میں اس کا بھی ہو کہ اس عبارت کا صحیح اور جائز معنی بن سکتے ہیں تو ضروری یہ ہے کہ ننانوے (۹۹) احتمالات کو چھوڑ کر اسی ایک احتمال کو لیا جائے اور ایسے شخص کو کافر کہنے سے بچا جائے، البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ وہ خود اپنے کسی قول یا فعل سے اس کی وضاحت نہ کردے کہ اس کی مراد اس عبارت سے وہی معنی ہیں جن کی وجہ سے کفر لازم نہیں آتا۔

کتبِ فقہ میں جو بعض کلمات کو کلماتِ کفر کہا ہے اس کا مطلب

باقی رہی یہ بات کہ کتبِ فقہ میں بہت سی باتوں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ فلاں فلاں کفریہ کلمات ہیں تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ کلمات اور الفاظ ایسے ہوتے ہیں جن سے اسلام کے یقینی اور قطعی احکامات کا انکار پیدا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی فقہا حضرات نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ان الفاظ اور کلمات کے کفر ہونے کا مطلب ہر گز یہ نہیں کہ جس شخص کی زبان سے یہ الفاظ نکلیں تو اس پر بے سوچے سمجھے کفر کا فتویٰ لگایا جائے، بلکہ ایسے کلمات کے کہنے والے کو اس وقت کافر کہا جائے گا جب کہ یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی مراد بھی وہی معنی و مفہوم ہیں جو کفریہ عقیدہ یا اسلام کے کسی قطعی اور یقینی حکم کا انکار ہو۔

کیا جس شخص کی ایک دو باتیں اسلام کے مطابق ہوں اس کو مسلمان سمجھا جائے گا؟

باقی رہی یہ بات جو بعض جاہلوں نے گھڑلی ہے کہ فقہائے کرام کے نزدیک کسی شخص کے عقائد اور الفاظ میں سے اگر ایک عقیدہ اور ایک قول بھی ایمان کا ہو تو اس کو بھی مسلمان سمجھو۔ یہ قطعاً غلط قرآن و حدیث کے مخالف اور فقہا پر افتراء ہے۔ اگر اس قاعدہ کو مان لیا جائے تو پھر دنیا میں کوئی بھی کافر نہیں، بلکہ شیطان ابلیس بھی کافر نہ رہے گا۔

مثلاً شیطان بھی تو اتنا مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عزت اور قدرت والے ہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کی کہ:

قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٨٢﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ ﴿٨٣﴾

"(شیطان نے) کہا تیری عزت کی قسم میں ضرور ان سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے ان بندوں کے جن کو تو نے خالص کر (اور چن) لیا ہے (تو ایسے لوگوں پر میرا بس نہیں چلے گا)۔" (ص:۸۲-۸۳)

نیز وہ مرنے کے بعد دوبارہ جینے کو بھی مانتا ہے اس لیے اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی:

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِي إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ

"(شیطان نے) کہا اے میرے رب (اگر یہی آپ کا فیصلہ ہے) تو پھر مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دیجیے جب یہ لوگ (دوبارہ قبروں سے) اٹھائے جائیں گے۔" (ص:۷۹)

غرض اس طرح تو ہر کافر اور شیطان کا کوئی نہ کوئی عقیدہ اور قول ضرور ایسا ہوتا ہے جو ایمان اور اسلام کے موافق ہو۔ حضرات فقہا کا مقصد تو یہ ہے جو اوپر لکھا گیا کہ کسی شخص کی زبان سے نکلا ہو الفظ جو لغت و عرف کے

اعتبار سے مختلف معنوں پر محمول ہو سکتا ہے جن میں ایک معنی کے اعتبار سے وہ لفظ عقیدۂ ایمان سے نکل سکتا ہے اور دوسرے تمام معانی اس کو عقیدہ کفریہ قرار دیتے ہیں تو ایسی صورت میں ضروری یہ ہے کہ اس کے کلام کو صحیح اور جائز معنی پر محمول کر کے اس کو مسلم ہی قرار دیا جائے بشرطیکہ وہ خود اس لفظ کی ایسی وضاحت نہ کر دے کہ اس کی مراد بھی اس سے وہی معنی ہے جس سے کفر لازم آتا ہے۔

اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے ایک واقعہ لکھ دیتا ہوں:

ایک تمباکو نوشی کرنے والا تمباکو کی دکان پر گیا اور اچھا تمباکو دکاندار سے مانگ لیا۔ اس نے تمباکو کی ایک قسم بتلائی، اس نے کہا کہ اس سے اور کڑوا ہونا چاہیے، دکاندار نے اس سے بھی تیز قسم کا تمباکو دکھلایا، اس کو دیکھ کر پھر اس نے کہہ دیا کہ اس سے زیادہ کڑوا دے دو، اسی طرح معاملہ چلتا رہا کہ بالآخر دکاندار نے کہا کہ بس تمباکو کی اس قسم سے کڑوا (العیاذ باللہ) خدا کا نام ہی ہو سکتا ہے۔ اس حکم کی وجہ سے بعض غیر محتاط لوگوں نے اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ پھر کسی عالم نے لوگوں کو سمجھایا کہ اس بے چارے کا مطلب تو اللہ تعالیٰ کے نام کی عظمت اور بڑائی بیان کرنی تھی نہ کہ اس کی توہین کیونکہ تمباکو میں سے اچھا اور اعلیٰ وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ تیز اور کڑوا ہو البتہ اب اگر یہ شخص خود بھی اس بات کا اقرار کر لیتا کہ اس سے میرا مقصود (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ پر عیب لگانا تھا تو ایسی صورت میں مسئلہ کی نوعیت بدل جاتی۔

کافر اور زندیق کو مسلمانوں کی فہرست میں شمار کرنا سخت بے احتیاطی اور امتِ مسلمہ پر بہت بڑا ظلم ہے

جس طرح اختلافی مسائل یا کسی مشتبہ اور مبہم بات کی وجہ سے کسی کو کافر کہنا سخت بے احتیاطی اور اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے، اسی طرح کسی کافر کو مسلمان کہہ دینا بھی پورے اسلامی معاشرہ پر بہت بڑا ظلم ہے کیونکہ ایک شخص کو کفریہ عقیدہ رکھنے کے باوجود مسلمان کہنے سے پورے اسلامی معاشرہ کے عقائد اور کردار متاثر ہو سکتا ہے، اس کو مسلمانوں میں شمار کر کے یہی ایک زندیق دوسرے مسلمانوں کو بھی تذبذب اور شکوک و شبہات میں مبتلا کر سکتا ہے، بلکہ کسی خاص وقت میں اسی ایک منافق اور زندیق کی شرارت پوری قوم کو ہلاکت میں ڈال سکتی ہے یہی ایک منافق مارِ آستین بن کر پورے اسلامی معاشرہ کو ایمانی اور جسمانی طور پر ہلاکت کے منہ میں پہنچا سکتا ہے۔

لہٰذا جس شخص کی تحریف اور کفر کھل کر سامنے آچکا ہو اسی کے بارے میں احتیاط یہی ہے کہ اس کے کفر

میں کوئی تأمُّل نہ کیا جائے اور اصحابِ علم پر لازم یہ ہے کہ وہ ایسے شخص کے کفر کو مسلمانوں پر عیاں کر دیں تا کہ دوسرے مسلمان اس کی شر سے محفوظ ہو جائیں۔

آج کل کے غیر محتاط فتوے اور ان کا برا اثر

آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے علما کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ معمولی معمولی باتوں اور اختلافی مسائل کی وجہ سے ایک دوسرے پر کفر و شرک اور بدعت کے فتوے لگاتے ہیں گویا انہوں نے بالکل حلال و حرام، جائز و ناجائز بدعت اور سنت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور دوسری طرف وہ اس معاملہ میں اس قدر سخی ہیں کہ جو کوئی کسی اختلافی مسئلہ میں ان کا ہم خیال ہو یا کم از کم وہ غیر جانبدار ہو تو ایسا شخص اگر چہ اسلام کے یقینی احکامات کا بھی انکار کر رہا ہو پھر بھی وہ ان کے نزدیک پکا مسلمان اور سچا مؤمن رہتا ہے۔

مثلاً سماعِ موتیٰ [1] اور توسُّل یعنی کسی کے توسُّل سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔ ان دو فروعی مسئلوں میں بعض علما کے تشدد کو دیکھ لیجیے کہ ان کے ماننے والے نہ ماننے والوں کو کافر یا گمراہ کہتے ہیں اور نہ ماننے والے ماننے والوں کو مشرک یا بدعتی کہتے ہیں حالانکہ ان مسائل کے ماننے یا نہ ماننے سے نہ کوئی مشرک ہو سکتا ہے نہ کافر و مبتدع۔ البتہ ایک دوسرے پر کافر، گمراہ اور مبتدع کے الزامات لگانے کی وجہ سے ہر دو فریق سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں، یہ لوگ اپنی بے احتیاطی سے اپنے ایمان کو بھی خطرے میں ڈال رہے ہیں اور عوام الناس کے اندر یقینی کفر والحاد اور شرک و بدعت کے بارے میں بھی سستی اور کاہلی پیدا کر دیتے ہیں، ہماری اسی بے احتیاطی کے پس پردہ یقینی کفر و شرک اور عقائد پر اثر انداز ہونے والی بدعتوں کو فروغ دیا جا رہا ہے اور عوام کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ علما اپنے باہمی تباغُض اور تحاسُد کی بنیاد پر ایک دوسرے پر کفر و شرک اور بدعت کے فتوے لگا رہے ہیں۔ آپ دیکھتے نہیں! کہ جب کبھی امت کا اتفاقی مسئلہ آجاتا ہے تو یہ سارے مکاتبِ فکر ایک دوسرے کو کافر، مشرک، مبتدع اور گمراہ کہنے والے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کو صرف جائز نہیں، بلکہ افضل سمجھتے ہیں تو ایسے لوگوں کے کفر و شرک وغیرہ کے فتاویٰ کا کیا اعتبار ہے۔

غرض باطل پرست ہمارے افراد کے ان غلط فتاویٰ کو بنیاد بنا کر عوام میں امتِ مسلمہ کے اجتماعی فتاویٰ کو ناقابلِ اعتبار بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے کا ایک واقعہ ہے کہ جب مرزائیوں پر متفقہ طور پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا تو اس صحیح فتویٰ پر بھی یہ کہہ کر آواز اٹھائی گئی کہ کفر، شرک اور بدعت کے فتاویٰ تو علما کی جیبوں میں

---

[1] مسئلہ سماعِ موتیٰ کی تفصیل بندہ کی لکھی ہوئی کتاب ''اسلام اور مسلمان'' اور توسل کی تفصیل ''عقیدہ اور عقیدت'' میں دیکھ لیجیے۔

رکھے ہوئے ہیں جس فتویٰ کو جس کے لیے اپنی من مانی خواہشات کے مطابق جب چاہیں ثبت کر دیتے ہیں۔ پھر آپ نے دیکھا نہیں کہ اس پُر فریب آواز پر بھی بہت سے سادہ لوح مسلمانوں نے لبیک کہا۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف اسلامی مکاتبِ فکر کے محققین اور اعتدال پسند علما اپنے اپنے متشددین کے اس لعن طعن اور غیر محتاط فتوؤں سے ہم آہنگ نہیں تاہم عوام میں کام تو یہی متشددین کرتے رہتے ہیں اس لیے محققین اور اعتدال پسند علما سے یہ درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے سخت گیر افراد کو سمجھائیں تاکہ بات سے بات نکال کر یا منطقی دلائل سے بڑھا چڑھا کر اختلافی مسئلہ کی وجہ سے خواہ مخواہ کسی پر کفر وشرک وغیرہ کے فتوؤں اور لعن طعن سے ان کو روکیں اور اپنے فتوؤں کی باگیں ان لوگوں کی طرف پھیر دیں جو یقینی طور پر کفر وشرک اور اعتقادی بدعت میں مبتلا ہیں اور پھر بھی اپنے آپ کو مسلمان، موحّد اور متبع رسول ﷺ سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی پوری وضاحت کے لیے کتاب "باہمی اختلافات" نامی کتاب کو پڑھ لیجیے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

پس ان حالات میں تمام مسلمانوں پر عوامی اور حکومتی سطح پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب پھر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور صرف اسی کی مخلصانہ عبادت کریں۔ اللہ تعالیٰ کے بندے وہی ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے رنگ میں رنگ کر اخلاقِ حسنہ کے پیکر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق کی پابندی سے ادائیگی، محرّمات سے اجتناب اور باہم اس مسئلہ میں ایک دوسرے سے تعاون اور تلقین کرنے میں جو کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان سے بارگاہ الٰہی میں توبہ واستغفار کریں۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے یہ اقدام ہونا چاہیے کہ شرعی حدود اور قوانین کو عملی طور پر فی الفور نافذ کیا جائے اور انفرادی واجتماعی ہر معاملے میں شریعت کی حکمرانی کو بحال کیا جائے، اللہ کی شریعت کے مخالف تمام وضعی قوانین کو معطّل کیا جائے اور فیصلہ طلبی کے لیے ہرگز انگریزی اور غیر شرعی عدالتوں کی طرف رجوع نہ کیا جائے جو غیر شرعی نظام کے تحت چل رہی ہوں مثلاً سودی بینک وغیرہ۔ تمام مسلم عوام کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کا پابند بنایا جائے خصوصاً علمائے کرام رہبرانِ ملت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو دین کی صحیح تعلیمات سے آگاہ کریں، ان کے اندر اسلامی شعور اور جذبہ بیدار کریں۔ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں اور حُکّام کو بھی اس پر آمادہ کریں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تخریب پسند نظریات و افکار جیسے مغربی جمہوریت، اشتراکیت،

قومیت اور ان کے علاوہ شریعتِ اسلامیہ کے مخالف دوسرے افکار و مذاہب کا قلع قمع کرنے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے اختیار کرنے سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی حالت زار کو بہتر بنائے گا اور ان کی متاع گم گشتہ کو واپس لوٹا کر دشمنوں پر غلبہ عطا فرمائے گا اور ان کی عزتِ رفتہ سے ان کو دوبارہ سرفراز فرمائے گا اور زمین پر ان کو غلبہ اور تمکین نصیب فرمائے گا۔①

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے عام اور خواص سبھی کی اصلاح فرمائے۔ ان کی موجودہ حالت زار میں بہتر تبدیلی پیدا فرمائے۔ ان کو دین کی صحیح سمجھ عطا کرے۔ ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر ان کو متحد کر دے، سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ سے حق کو غالب اور باطل کو سرنگوں کرے۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کو نیکی اور تقویٰ کی راہ میں ایک دوسرے کا تعاون اور باہم دیگر حق اور صبر کی تلقین کرنے کی توفیق دے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے اس کی امید کی جاسکتی ہے اور وہی اس پر قادر ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العٰلمين

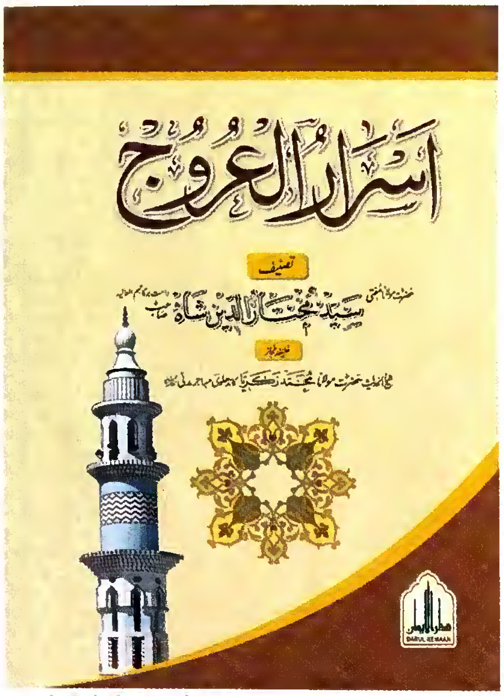
---

① مسلمان دنیا میں کیسے سربلند ہوں گے اس کی پوری تفصیل اسرار العروج میں پڑھ لیجیے۔ مختار

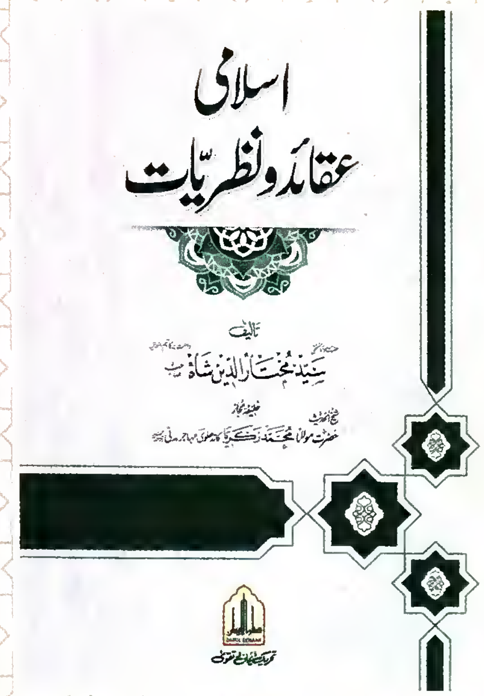
حضرت مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی دیگر تالیفات



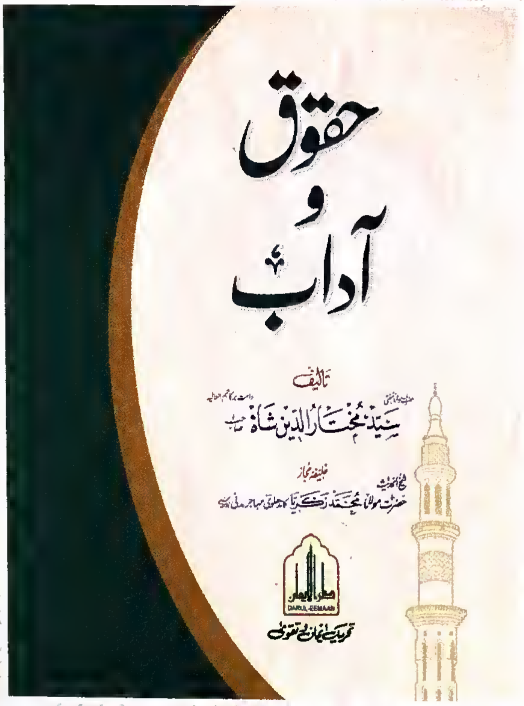
علمی بحثوں، فنی نکتوں اور عصری تطبیق کے ساتھ، دو ترجموں کے تحت وضاحتی، سلیس اور آسان تفسیر۔ قرآن فہمی کا شاہکار، علما، طلبا اور عوام الناس کے لیے یکساں مفید۔



قوموں کے عروج وزوال کے فطری قوانین، امت مسلمہ کے زوال کے اسباب اور عروج کی راہ متعین کرنے کی بے مثال کتاب۔ عروج و سربلندی کے لیے کسی بھی درجہ میں فکر مند ہر عقل کی معاون ومددگار کتاب



عقائد جیسے اہم موضوع پر لکھی جانے والی تفصیلی کتاب "کتاب العقائد" کی تسہیل، عقائد کے تعارف، اہمیت، اقسام، احکام اور ان پر مرتب ہونے والے نتائج وثمرات کا بیان۔



مسلمانوں کے لیے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہر قابل احترام ہستی، بلکہ انسانی معاشرے سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کے حقوق وآداب کا مجموعہ، انسانی زندگی کے امن وامان اور سکون کا راز، ہر فرد کی ضرورت

حضرت کی کتابیں گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے ابھی واٹس ایپ پر رابطہ کیجیے۔ **0321-9511901**